پنجاب کی سیاسی تحریکیں

عبداللہ ملک

پنجاب کی سیاسی تحریکیں

عبداللہ ملک

M. Muhammad Baig

کوثر پبلشرز ۔ لاہور

مرحوم فیروزالدین منصور کے نام

ان کمیونسٹ رہنماؤں میں تھے جنہوں نے اس خطے میں سوشلزم کی تحریک کو پروان چڑھانے کے لیے تمام عمر انتھک کام کیا۔ فاقہ کشی کی، جیلیں کاٹیں، صعوبتیں برداشت کیں لیکن مرتے دم تک جد وجہد سے منہ نہ موڑا۔ وہ دانشور بھی تھے اور سیاسی کارکن بھی، وہ ادیب بھی تھے اور مارکسی تجزیہ نگار بھی، وہ میرے دوست بھی تھے اور رہنما بھی!

اک عمر کمیونسٹ پارٹی میں ان کے ساتھ گزاری ہے۔ کاش وہ آج زندہ ہوتے اور آج کی جنوں خیزیوں سے خوش ہوتے۔

جنونِ عشق کی رسم عجیب کیا کہنا
میں ان سے دور وہ مجھ سے قریب کیا کہنا

یکم مئی ۱۹۷۳ء

عبداللہ ملک

تیسرا ایڈیشن ــــــ دیباچہ

پنجاب کی سیاسی تحریکوں کا تیسرا ایڈیشن حاضر ہے۔ یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ اس کتاب کو اتنی قبولیت عامہ حاصل ہوتی حالانکہ یہ کوئی نصاب کی کتاب نہیں ہے لیکن اس کی مقبولیت سے ایک بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ اب ہمارے ہاں تجزیاتی تحریروں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے اور تاریخ کے رومانی اسلوب کی مقبولیت اب روبہ زوال ہے اب پڑھنے والا ماضی پرستی کے رومانی جذبات سے الگ ہو کر واقعات کو عقلی بنیادوں پہ سمجھنے کا خواہش مند ہے دراصل اسی جذبے اور خواہش کی تکمیل کے لیے پندرہ بیس برس پہلے جب اس کتاب کا خاکہ میں نے ترتیب دیا تھا تو یہ حصہ ایک منصوبے کی وسیع کڑی تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے ایڈیشن کے حرف آغاز میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

پنجاب کی تحریکوں پر یہ کام میرے اس وسیع کام کا ایک حصہ ہے جو پنجاب کی تاریخ پر کر رہا ہوں۔ موجودہ حصہ تقریب قریب ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے دور پر محیط ہے لیکن اس جلد میں اس دور کی صرف ان تحریکوں کا تذکرہ اور تجزیہ ہے جو ۱۹۴۰ء یا اس کے قریب تک پنجاب کے نچلے درمیانے طبقے میں زیادہ مقبول اور بارسوخ رہیں اس وقت تک پنجاب میں مسلم لیگ کوئی زیادہ با اثر اور مقبول جماعت نہیں بنی تھی جس طرح کانگرس کا اثر بھی لے دے کے شہری ہندوؤں کے ایک طبقے تک محدود تھا

یہ کام پہلے آٹھویں برس میں مختلف اوقات میں ترتیب پا سکا ہے ان میں سے کچھ تحریکوں کی داستان کے بعض حصے مختلف اخبارات میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا ہوں دراصل میں نے لندن کے قیام کے دوران دل جمعی سے پنجاب پر جب کام شروع کیا تو اس وقت مجھے خیال آیا کہ جن تحریکوں کے بارے میں تھوڑا بہت لکھ چکا ہوں ان کے متعلق پہلے کیوں نہ کام کیا جائے چنانچہ راشٹریہ سیوک سنگھ پر تو مواد کا اکثر حصہ میں نے لندن میں ہی حاصل کیا۔ لیکن اس کی تیاری میں سب سے اہم مدد مجھے پاکستان میں ہی [illegible] انجانے کے ایک افسر مسٹر بیلسٹر کے تھیسس سے ملی جو انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے [illegible]

اس کے علاوہ لندن آفس سے جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے اخبارات کی فائلوں نے بہت مدد دی مجلس احرار اور خاکسار تحریکوں کے جہاں تک واقعات کا تعلق ہے اس کے لیے میں نے زیادہ تر انحصار خود ان جماعتوں کے زعما کی تصانیف پر ہی کیا ہے جہاں تک تجزیہ کا تعلق ہے اس کی ذمہ داری کلیتہً میری اپنی ہے مجلس احرار نے بعض جن دوسری تحریکوں میں حصہ لیا ان کا تذکرہ میں نے نہیں کیا مثال کے طور شہید گنج کی تحریک اور نیلی پوش اور اتحاد ملت کا تذکرہ بھی نہیں ہے یہ بھی اگلی جلد کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے کیونکہ شہید گنج کی تحریک کے پس منظر کے لیے یونینسٹ اور میاں فضل حسین کی سیاست کا تفصیلی تجزیہ ضروری ہے جو اگلی جلد میں ہی کیا جا سکے گا۔

لیکن پنجاب کی تاریخ رقم کرنے کا خواب ہنوز تشنہ تکمیل ہے۔ گو اس کے لیے مواد مسلسل جمع کر رہا ہوں لیکن اس پورے عرصہ میں دوسرے کاموں میں اسقدر الجھا رہا کہ ادھر توجہ نہ دے سکا۔ اس پورے عرصے میں دوسرے تحقیقی کام ضرور کیے ہیں لیکن پنجاب کی تاریخ والا منصوبہ ادھورے کا ادھورا ہی پڑا ہوا ہے چنانچہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر بار جب اس کتاب کا ایڈیشن ختم ہوتا ہے کہ تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس میں مزید اضافہ کروں لیکن پھر قلم رک جاتا ہے کیونکہ یہ خیال آتا ہے کہ اگر اس میں اضافہ کیا گیا تو اس کا حجم بڑھ جائے گا اور ناشر کو قیمت بھی بڑھانی پڑے گی جو میں نہیں چاہتا۔ کیونکہ پہلے ہی قیمتوں میں اضافے نے کتاب کو عام پڑھے لکھے آدمی کی قوتِ

اس لیے ان موجودہ صفحات میں پنجاب کانگرس اور مسلم لیگ کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔

ان صفحات میں صرف مخصوص اسلوب اور طبقے کی جماعتوں کا تذکرہ اور تجزیہ ہے اور ان جماعتوں کے زیر اہتمام اور زیر قیادت چلنے والی تحریکوں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ان صفحات سے یہ قطعاً نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس دور میں صرف یہی تحریکیں چلیں اور یہی جماعتیں وجود میں آئیں حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں درجنوں چھوٹی موٹی تحریکیں ابھریں کئی ایک ہنگامے بپا ہوئے کئی ایک معرکے وجود میں آئے۔ کئی ایک تحریکوں نے پورے اس خطے میں تہلکہ مچا دیا اس کی کایا پلٹ دی یہ سب تاریخ اور تجزیہ کے لیے اہم ہیں ان کا تذکرہ میں اپنی پنجاب کی تاریخ

میں تفصیل سے کروں گا - یہ تاریخ چار جلدوں میں ہو گی - پہلی جلد ۱۸۴۹ء سے ۱۹۰۰ء تک ہے وہ اگلے سال کے ابتدائی مہینوں میں شائع ہو جائے گی اس موجودہ کتاب کو صرف ان تحریکوں تک محدود کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اس کو مزید پھیلانا نہیں چاہتا تھا - کیونکہ اس تحریک اور اسکے فکر کو شرح و بسط سے انشاءاللہ العزیز ایک جلد ضروری ہے اس لیے جلد ہی دوسری تحریکوں کے تذکرے کے لیے اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی پیش کروں گا کیونکہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء کا دور بڑے ہنگاموں اور تحریکوں کا دور ہے ان بیس برسوں میں پنجاب پر تقریب تقریب مسلسل یونینسٹ پارٹی نے حکمرانی کی ہے یہ پارٹی پنجاب کے اوپری طبقہ کی سیاست اور افکار کی ترجمانی تھی - اس لیے اس دور کو جاننے کے لیے اسے بھی جاننا ضروری ہے ہمارے ہاں دوسری تحریکوں کی یونینسٹ پارٹی پر بھی کوئی کام نہیں ہوا - اس پر اگر کسی نے تھوڑی تفصیل سے قلم اٹھایا ہے تو وہ میرے محترم ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ہیں ان کا اس جماعت کے بارے میں اپنا ایک موقف ہے لیکن پنجاب کی طبقاتی تاریخ میں اس پارٹی کا ایک رول رہا ہے - اس کا اس انداز سے تجزیہ نہیں ہوا کیونکہ زمینداری نظام کو سمجھے بغیر اس جماعت اور اس سیاست اور اس کے اندازِ سیاست کو نہیں سمجھا جا سکتا - اس لیے اس جماعت کا تذکرہ اور تجزیہ میں نے اگلی جلد کے لیے رکھا ہے -

خرید سے باہر کر دیا ہے اس لیے اضافہ کے بغیر ہی ایڈیشن شائع ہو جاتا ہے گو میں اب بھی امید کر رہا ہوں کہ جلد ہی پنجاب کی سیاسی تحریکوں کا دوسرا حصہ مرتب کر سکوں گا - گو میں جانتا ہوں کہ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے موقع پر بھی میں نے اس امر کا اعادہ کیا تھا اور اب پھر یہی وعدہ دہرا رہا ہوں میں معذرت خواہ ہوں اور میں ان مجبوریوں کا ذکر کرنا بے سود سمجھتا ہوں جن کی وجہ سے ہر بار یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے رہ جاتا ہے -

کہی کسی سے نہ روداد زندگی میں نے
گزار دینے کی شئے تھی گزار دی میں نے

سچ یہ ہے کہ پنجاب کی تاریخ کے موضوع پر میں نے سالہا سال کام کیا ہے اور اب تک اس کام کے ملتوی رہنے کی اور وجوہات کے علاوہ ایک وجہ "حرفِ آخر"

کے حصول کی خواہش رہی ہے اور میں بھول جاتا ہوں کہ حرف آخر کس نے ترتیب دیا ہے اس لیے اس کی تلاش اور اس کا حصول بے کار کی جد و جہد ہے اس لیے اب یہ کوشش کروں گا کہ جیسے ہی فرصت ملتی ہے اور جو کام ہاتھ میں ہیں ان کی ترتیب پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے تو "پنجاب کی سیاسی تحریکوں" کی دوسری جلد شائع کر دوں۔ اس میں ذیل کی تحریکوں کی داستان شامل ہو گی۔

۱۔ پنجاب میں کمیونسٹ افکار اور پارٹی کا ارتقاء

۲۔ سکھوں کی تحریکیں۔ اکالی۔ ببر اکالی۔ مہنتوں کے خلاف تحریک، سکھ ہوم لینڈ کی تحریک۔ ۳۔ یونینسٹ پارٹی ۴۔ کسان سبھا کی تحریک۔

۵۔ نیلی پوشوں کی تحریک اور شہید گنج ۶۔ پنجاب میں کانگرس کی تحریک۔

۷۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک۔

یہ وعدے اور ارادوں کا اظہار تو اصل میں اپنے قاری سے زیادہ اپنے کو بہلانے کے لیے کرتا ہوں۔ اس لیے کہ وعدوں کے ایفا میں کوتاہی، ارادوں کی تکمیل میں ناکامی خود مجھے ایک گونہ اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے اور میں پریشان رہنے لگتا ہوں۔ اس لیے اس مسلسل کرب سے نجات پانے کا یہی ایک راستہ رہ جاتا ہے کہ ان وعدوں کا اعادہ کرتا رہوں تاکہ

امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

بہرحال دعا کیجیے کہ میں اب اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں۔

عبداللہ ملک۔ ۱۳۳ ایف۔ ٹیپو بلاک
نیو گارڈن ٹاؤن لاہور۔ ۱۶
ٹیلی فون ۸۵۱۷۰۰
یکم جولائی ۸۲ء

ترتیب

تاریخ سے گریز کیوں؟ ۹

تحریک اور جماعت؟ ۱۶

تاریخ کیا ہے ۱۸

[illegible] ۲۱

صنعتی دور اور علم تاریخ ۲۴

تاریخ کی صحیح بنیادیں ۲۷

راشٹریہ سیوک سنگھ ۳۱

پنجاب انگریزوں کی آمد سے پہلے ۳۳

انگریز — نیا نظام ۳۴

راشٹریہ سیوک سنگھ کی ابتدا ۳۹

مرہٹہ قوم پرستی ۴۰

فاشزم کیا ہے؟ ۵۰

برطانوی کمیونسٹ اور تحریک آزادی ہند ۵۷

مذہبی اور تہذیبی تضاد ۶۹

خلافت سے احرار تک ۷۷

نچلے درمیانے طبقے کی زبوں حالی ۸۰

اقتصادی اثرات ۹۶

فرقہ وارانہ فیصلے ۱۲۷

[illegible] کی تحریک ۱۳۱

مذہب اور سیاست ۱۴۵

تحریک کشمیر ۱۹۳۱ء اور مجلس احرار ۱۵۳

ریاست کشمیر میں بیداری کی لہر ۱۵۵

۱۳ جولائی ۱۶۳

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا قیام ۱۶۵

گلینسی کمیشن ۱۷۷

کپورتھلہ تحریک اور مجلس احرار ۱۸۱

قادیانیوں کے خلاف مہم ۲۰۵

سرسید اور مرزا غلام احمد قادیانی ۲۲۸

خاکسار تحریک ۲۷۷

خاکسار تحریک کا پس منظر ۲۷۹

علامہ مشرقی کی دہلی روانگی ۲۹۰

تصادم اور مسلم لیگ ۳۰۲

پنجاب اسمبلی کے اندر کی صورتحال ۳۰۳

خاکسار تحریک اور چندہ ۳۰۸

سیٹھ چھوٹانی اور مجلس خلافت ۳۱۳

تاریخ سے گریز کیوں؟

برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصے بالخصوص متحدہ پنجاب میں بعض بہت ہی اہم تحریکوں نے جنم لیا۔ پچھلے ساٹھ ستر سال میں ان تحریکوں نے اپنے اپنے دور میں بالعموم ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور دوسرے لوگوں کو متاثر کیا۔ یہ تحریکیں سماجی بھی تھیں، مذہبی بھی اور سیاسی بھی، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان تحریکوں کے متعلق حقائق نہ تو جمع کئے گئے اور نہ ان کا تجزیہ ہی کیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہم ان تحریکوں کے اثرات سے بالکل ناواقف و ناآشنا ہیں، اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تحریکوں کے تمام خدوخال کو اجاگر کیا جائے۔ ان تحریکوں کے احوال و کردار پر تقدس اور نفرت، دونوں کی جو دبیز تہیں چڑھائی گئی ہیں ان کو ہٹایا جائے اور ان کو اس دور کے سماجی پس منظر میں پرکھا جائے اور ان کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔ یہ درست ہے کہ ان پچھلے پچاس ساٹھ برسوں بالخصوص ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کی دو دہائیوں کے دوران متحدہ پنجاب میں جو تحریکیں ابھریں ان میں سے اکثر و بیشتر ایک مخصوص دور میں ابھریں، مقبول ہوئیں اور آخر میں غیر

مقبولیت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئیں آخر کیوں۔ ؟ واقعہ یہ ہے کہ تحریکوں کا عروج و زوال بھی تو ایک سماجی عمل ہوتا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اس خطہ میں جو تحریکیں ابھریں جوان ہوئیں اور ایک زمانہ میں انہوں نے تہلکہ مچایا۔ ان کے متعلق کوئی مواد اور کوئی تحقیقی کتاب نہیں ملتی یہاں مجلس احرار قائم ہوئی اس نے قریب قریب دس برس تک مختلف تحریکوں کی آبیاری کی، ایک خاص قسم کا ذہن پیدا کیا۔ میدان خطابت کے بے مثال شاہسوار پیدا کیے، شہنشاہیت کے خلاف لڑ مرنے کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا کیا، مذہب اور سیاست کو ہم آہنگ کر کے سماجی تحریکوں کو ایک مزاج عطا کیا لیکن مجلس احرار پر کسی نے بھی ناقدانہ حیثیت سے کوئی تحریر قلمبند نہیں کی!

یہی حال خاکسار تحریک کا ہے جس تحریک نے لاکھوں نوجوانوں کو متاثر کیا۔ ان کو جانباز بنایا۔ ان کو سروں پر کفن باندھ کر گلی کوچوں میں نکلنے پر آمادہ کیا۔ جس نے "اطاعت امیر" کے نعرے کو زبان زد عام کیا۔ اس کے متعلق ایک بھی کتاب موجود نہیں ہے۔ یہیں اس خطے میں "چھپن فیصدی حقوق" کا نعرہ بلند ہوا لیکن اس کے متعلق بھی ایک لفظ تحریر نہیں ہوا۔!

آخر یہ خاموشی کیوں؟ اس لاپرواہی اور اس لاتعلقی کے کیا معنی؟ میرے نزدیک اس خاموشی لاتعلقی کی بھی کچھ وجوہ ہیں، اس بے اعتنائی کا باعث دراصل مسلمانوں کے کچھ مخصوص سیاسی اور سماجی تقاضے تھے اور یہی وہ مخصوص سیاسی اور سماجی تقاضے اور محرکات تھے جنہوں نے ان کو مجبور کیا کہ وہ مسلم لیگ ہی کو اپنی نمائندہ جماعت کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر اکتفا کریں۔ اس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ برطانوی سامراج اور کانگریس کے مقابلے میں مسلمانوں کو اپنے مطالبات کے حصول کیلئے ایک نمائندہ جماعت کی اشد ضرورت تھی، چنانچہ مسلم لیگ کی قیادت نے اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے خلاف زبردست جدوجہد کی، اپنی نمائندہ حیثیت بھی منوائی اور مسلمانوں کیلئے پاکستان بھی حاصل کیا۔ مسلم لیگ نے اپنی نمائندہ حیثیت منوانے کے سلسلے میں دیگر جماعتوں کے مقابلے میں جو طور طریق اختیار کئے بدقسمتی سے اس کے اثرات نے ہماری سیاسی زندگی میں وسعت خیالی اور اختلاف رائے کے احترام کو شدید نقصان پہنچایا، نتیجۃً محب وطن مسلم لیگ سے خارج ہو گئی اور اس کے

سوا دوسری جماعتوں کے لیے صرف حقارت اور نفرت کے جذبات مختص ہو گئے۔

اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیام پاکستان کے بعد، حریف جماعتوں کے فقدان کے باعث تنہا مسلم لیگ ہی واحد سیاسی جماعت کی حیثیت سے ملک کے سیاہ و سپید کی ذمہ دار ٹھہری وطن عزیز کی سیاسی زندگی میں اس خلاء کا اعتراف و اعلان کسی غیر مسلم لیگی کی طرف سے نہیں، بلکہ خالص مسلم لیگی اور جذباتی کالم نویس جناب زیڈ، اے سلہری نے اپنی کتاب "لیاقت علی سے صدر ایوب تک" میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ، کے تحت (جس کا کوئی حریف موجود نہ تھا) جو مجلس آئین ساز ملک کا دستور تیار کرنے اور اسے حکومت دینے کے دوہرے مقصد سے قائم کی گئی وہ ایک واحد پارٹی کی آماجگاہ تھی۔ لیگ پارلیمانی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے لیاقت علی ملک کے وزیر اعظم بھی تھے اور اعلیٰ قومی لیڈر بھی، کچھ سیاسی لیڈروں نے اگر اکا دکا ان کی قیادت کو اپنے تیروں کا ہدف بنایا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ملک میں ان کے اثر و اقتدار کا کوئی حریف موجود تھا۔ تقسیم کے بعد مسلم لیگ کونسل نے اس مطلب کی ایک قرارداد منظور کی کہ حکومت کا کوئی عہدیدار پارٹی کا عہدیدار نہیں ہو سکتا۔ اسی قرارداد کے پیش نظر قائد اعظم نے جو اس وقت گورنر جنرل بن چکے تھے۔ سیاسی تنظیم کی صدارت سے استعفےٰ دے دیا۔ اور ان کی جگہ خلیق الزمان، جماعت کے صدر رہے۔ ۱۹۵۰ء میں لیاقت علی نے مسلم لیگ کے آئین کی اس امتناعی دفعہ کو منسوخ کرا لیا اور وہ لیگ کے صدر بن گئے۔ اس طرح وزارت عظمیٰ اور مسلم لیگ کی صدارت ایک ہی ذات میں جمع ہو گئیں اس سے ان کے اثر و اقتدار میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ اس لیے کہ وزیر اعظم اور قومی لیڈر کی حیثیت سے یہ اثر و اقتدار انہیں ویسے بھی حاصل تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ صدارت کی گدی پر فائز ہونے سے کسی مخالفت کا امکان بالکل ہی ختم ہو گیا۔ اس طرح لیاقت علی کے ذاتی اقتدار کا عمل مکمل ہو گیا۔ لیگ پارلیمانی پارٹی ان کے فیصلوں اور پالیسیوں پر بڑی برخورداری سے صاد کرنے لگی اور مجلس آئین ساز عملاً ان کی باندی ہو کے رہ گئی۔ اس صورت حال کا غیر محسوس اثر یہ ہوا۔ کہ ایک طرف تو قومی پارلیمان

کی حیثیت سے مجلس آئین ساز کے اختیارات محدود ہوتے گئے اور دوسری طرف لیگ کی صدارت پر لیاقت علی کے ممکن سے لیگ بحیثیت جماعت عضوِ معطل بن کے رہ گئی۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف سیاسی میدان ہی میں مسلم لیگ کی سیادت پر اصرار نہیں کیا گیا بلکہ اس کو خالق پاکستان کی حیثیت سے ایک مذہبی تقدس دیا گیا اور ہر وہ شخص جس نے مسلم لیگ یا اس کی حکومت کی بے اعتدالیوں کے خلاف لب کشائی کی وہ معتوب ٹھہرا۔ ظاہر ہے اس فضا میں جب مسلم لیگ کے اندر کے نکتہ چیں ناقابل برداشت قرار دیئے جا رہے ہوں تو غیر مسلم لیگی جماعتوں کا تو ذکر ہی بے سود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں جب کسی جماعت یا تحریک کے لیے نفرت و حقارت بلا اس کو پاکستان دشمن سمجھا جائے تو اس کے متعلق کون قلم اٹھانے کی جرأت کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری بعض اہم تحریکیں تحقیق و جستجو اور مؤرخ کے تجزیہ سے محروم ہو گئیں۔ خود مسٹر زیڈ اے سلہری جو غیر مسلم لیگی جماعتوں کو غدار قرار دینے میں پیش پیش رہے ہیں۔ ان کو بھی جماعتی آمریت اور اس کے مہلک اثرات کو تسلیم کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

"لیاقت علی خاں کے دورِ حکومت میں جہاں مسلم لیگ بتدریج نیم جان ہوتی گئی وہاں ان کی پالیسی کا ایک اور پہلو بھی نمایاں ہوتا گیا۔ کہ کسی اور سیاسی نقطۂ نظر کو ابھرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ سیاسی تنظیم کی ہر کوشش کو ملک کے ساتھ غداری قرار دیا گیا۔ ہر مخالف آواز کو دبا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی زندگی کا فروغ بالکل رک گیا۔"

سلہری صاحب کی تنقید کا خنجر لیاقت علی کے دور سے پیچھے نہیں جاتا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جب مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت منوانے کے لیے ہر دوسری جماعت کو غدار اور ہندوؤں کا ایجنٹ قرار دیا جائے تو پھر یہ ذہن ایک دن میں تو ختم نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ اس وقت سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مسلم لیگ کی وحدانیت کو تسلیم کرانا ازبس ضروری تھا۔ لیکن یہ وحدانیت اگر متحدہ محاذ کے ذریعے وجود میں لائی گئی ہوتی تو مسلم لیگ کے اندر مختلف الخیال عناصر کو پنپنے اور جوان ہونے کا موقعہ ملتا اور مسلم لیگ

پاکستان میں اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود شاید کچھ دن زیادہ زندہ رہ جاتی۔ لیکن مسلم لیگ نے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد غیر مسلم لیگیوں کو غدّار اور اسلام دشمن ثابت کرنے کے لیے جو فضا پیدا کی، اس نے علمی فضا کو بھی شدید طور پر مسموم کر دیا۔ اور اہل علم کے قلم کو روک دیا کیونکہ جب کسی جماعت اور اس کے قائدین پر علمی سطح پر لکھا جائے گا۔ تو اس نفرت کا اظہار نہیں ہو سکے گا۔ جو تحریکوں کے دوران ایجی ٹیشن کا خاصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نفرت اور حب الوطنی کی اجارہ داری کے جذبے کا ہی نتیجہ تھا۔ کہ اگر غیر مسلم لیگی جماعتوں اور افراد کے بارے میں کبھی لکھا بھی گیا تو وہ علمی سطح سے ہٹ کر صرف ایجی ٹیشن کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فکری اور سیاسی تحریکوں پر قلم اٹھانے کا کام رُک گیا۔ اور سیاسی عمل کی پشت پر کام کرنے والے مختلف عوامل کی نشاندہی تو بجائے خود نابود ہو گئی اور ہر تحریک، ہر فکر صرف نعروں اور مذہب کا مظہر بن گیا اور یہ کسی نے نہ سوچا کہ آخر مذہب اور دین بھی تو انسانوں کی فلاح، ضرورتوں اور خواہشوں ہی کا مظہر و داعی ہوتا ہے۔

اس نفرت و حقارت کی فضا اور ناروا سلوک کا ردِ عمل غیر مسلم لیگی جماعتوں اور ان کے پیروؤں پر بھی ہوا۔ ان جماعتوں اور تحریکوں میں کام کرنے والوں کا ایک حصہ بالکل مایوس ہو گیا۔ اس مایوسی نے ان کو گوشہ نشیں ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور بالآخر یہ گروہ یا تو سیاست کی وادیٔ خارزار سے ہی دامن جھٹک کر الگ ہو گیا یا ایک دوسرا حصہ تقیہ کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو گیا اور وہ حکمران مسلم لیگیوں سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر نظریۂ پاکستان کی دہائی دینے لگا۔ اس منافقت اور مجبوری کے عمل نے بھی جستجو اور تحقیق کے راستے میں زبردست رکاوٹ ڈالی یہ گروہ جو اپنی سابقہ جماعتوں اور تحریکوں کے بارے میں مواد مہیا کر سکتا تھا یا اس کے صحیح خدوخال اجاگر کر سکتا تھا اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ کیونکہ اس کو یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ اگر اس نے قلم اٹھایا تو "پاکستان دشمنی" کا الزام پھر سے تازہ ہو جائے گا اور پھر سے وہ اس بحث میں اُلجھائے جائیں گے، کہ وہ تحریک پاکستان میں کہاں تھے، اور ان کا کیا موقف تھا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی وقتی سیاست کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی سابقہ جماعتوں کی سرگرمیوں اور کارناموں پر پردہ پوشی ہی نہیں کی بلکہ اس دور کے واقعات کو مسخ بھی کیا۔ اب یہ واقعہ

ہے کہ خاکسار ہوں یا احرار انہوں نے مسلم لیگ کی مخالفت کی، پاکستان کو یہ جماعتیں اس برصغیر کے ہندو مسلم مسئلہ کا صحیح حل تصور نہیں کرتی تھیں، ویسے سیاسی جماعتوں کے لئے کسی سیاسی تحریک کی مخالفت بجا اور جائز ہے لیکن چونکہ یہ جماعتیں ناکام ہوگئیں اور مسلم لیگ کامیاب ہوگئی، تو ایک طرف مسلم لیگ کے حامیوں کے غیض و غضب اور نفرت و کدورت سے بچنے کے لیے غیر مسلم لیگی جماعتیں بجائے اس کے کہ وہ اپنے عمل کے بارے میں ڈٹ کر کہتیں کہ وہ اپنے دور میں اپنی راہ کو صحیح سمجھتی تھیں انہوں نے اپنے عمل کی غلط تاویلیں شروع کر دیں اس رویے سے بھی تجزیہ کرنے والوں کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ساتھ ہی ملک کے اندر "جمہوری عمل" کو بھی نقصان پہنچا اور یہاں عملاً "یک جماعتی نظام" قائم ہوگیا۔ اور کافی دنوں تک مسلم لیگ کو اس قسم کا تقدس بخشا گیا کہ الامان والحفیظ۔ لطف یہ ہے کہ بھارت میں کانگرس جب حکومت سنبھالتی ہے تو مختار کل ہونے کے باوجود غیر کانگرسی جماعتوں کے نمائندوں کو حکومت میں لیتے ہوئے کوئی باک محسوس نہیں کرتی۔ لیکن ہمارے ہاں مدتوں تک غیر مسلم لیگی عناصر کو سیاسی تو کجا جسمانی طور پر بھی اپنے کو بحال کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے اس عمل نے بھی ہماری علمی زندگی میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے قریب قریب تمام شعبوں میں منافقت اور مصلحت کوشی کے لیے راہیں کھول دیں۔

اس علمی تحقیق و جستجو کی راہ میں جس بحث و تمحیص کی آزادی کی ضرورت ہے وہ چونکہ مفقود ہوگئی اور سیاست اور مذہب کو اتنا گڈمڈ کرنے کی کوشش کی گئی کہ سیاست میں مخالفت کو "اسلام دشمنی" ٹھہرایا جانے لگا۔ چنانچہ یہاں یہ نعرہ بھی لگا کہ حزب اختلاف کا قیام غیر اسلامی" ہے۔ جب سیاست میں حزب اختلاف غیر اسلامی ٹھہرے تو پھر اس فضا میں بیچارہ یونیورسٹی کا لیکچرر یا مرنجاں مرنج صحافی، یا دانشور تو ویسے ہی سہم جائے گا۔ اور اگر سہمے گا نہیں تو اس پر سیاسی فضا کا اتنا دباؤ ہوگا کہ وہ سوچنے اور ماضی کو حقیقت پسندی سے پرکھنے کے کام سے کنی کترانے لگے گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ابھی تک کسی نے ہمارے خطے کی عوامی تحریکوں پر قلم ہی اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

ان مختلف النوع اور گنجلک وجوہات اور صورت حال نے ہمارے ہاں علمی جستجو کی راہیں

مسدود کر دیں۔ اور نظریاتی مملکت کا نام دے کر ہم نے غیر شعوری طور پر فسطائی رجحانات کے لیے زمین ہموار کر دی۔ کیا آج بھارت میں تمام خرابیوں کے باوجود علمی میدان میں ہزارہا کتابیں مختلف موضوعات پر شائع نہیں ہو رہیں، جو بھارتی حکومت اور قیادت پر علمی رنگ میں نکتہ چینی کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں تو ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو احرار اور اس کے زعما۔ خاکسار اور ان کے قائدین اور دوسرے غیر مسلم لیگیوں کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتا حالانکہ تحریکوں اور جماعتوں کے مابین اختلاف اور تضادات کے باوجود ان میں ایک لاشعوری رشتہ ہوتا ہے اور ایک تحریک جو زمین ہموار کرتی ہے، جو بیج ڈالتی ہے اس سے بہت دفعہ دوسری جماعت اپنی کوششوں اور بہتر وسائل اور نعروں سے پھل حاصل کر لیتی ہے۔ چنانچہ کیا اس واقعہ سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ مجلس احرار یا خدائی خدمت گار یا خاکساروں نے عوام کو جو شعور بخشا، فعال تنظیم عطا کی، جو نعرے دیئے وہ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لیے کھاد کے طور پر استعمال نہیں ہوئے یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مسلم لیگ ان جماعتوں سے متحدہ محاذ نہ بنا سکی اور دونوں ایک دوسرے کی متحارب صفوں میں کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے جس سے رواداری اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کی روایت نے ہی جنم نہ لیا۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ مخصوص حالات نے مسلم لیگ کو قیام پاکستان کے بعد مجبور کیا کہ وہ عوام کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے ان کی نفرت کو اندرون ملک مختلف جماعتوں اور عناصر کے خلاف زندہ و پائندہ رکھے تاکہ عوام کی توجہ اصل مسائل کی طرف مبذول نہ ہونے پائے۔ اب یہ تمام عمل سیاسی میدان اور ہنگاموں کے لیے تو ممکن ہے کچھ وقت کے لیے مفید ثابت ہو، اور حکمرانوں کی زندگی قدرے طویل ہو جائے۔ لیکن اس عمل کے جو اثرات علمی دنیا پر مرتب ہوتے ہیں وہ کس قدر مہلک ثابت ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ ہم اپنے علمی فقدان سے لگا سکتے ہیں اور یہ علمی فقدان بالآخر کہاں لے جا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی تک خود قائداعظم کی سلیقے کی سوانح نہیں لکھی جا سکی۔ کیوں؟ ہر کوئی ڈرتا ہے کہ بات پتہ نہیں لکھنی ہے کہ نہیں! یہ خوف علمی کاموں کے لیے ہمیشہ مہلک ہوتا ہے۔

تحریک اور جماعت

سیاسی جماعتوں کا پورا اندازہ اور تجزیہ ان کے نعروں، اور منشوروں کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کیلئے ان کے عمل اور اس عمل کے نتائج کو بھی سامنے رکھنا ہوتا ہے اور اسی سے تعین ہوتا ہے کہ کون سی جماعت کس طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ درست ہے کہ جماعتیں بڑے وثوق، بڑے دعوے اور بڑے طمطراق سے اپنے کو قوم کی نمائندہ بتاتی ہیں۔ لیکن تجزیہ نگار کو یہ بھی تو جاننا ہوگا۔ کہ اس دور میں قوم ایک سی تھی یا نہیں، اگر نہیں تو وہ کن طبقوں سے متشکل ہوتی تھی، ان میں خواص تھے، سرمایہ دار تھے، جاگیردار تھے، بڑے زمیندار تھے، مذہبی رہنما تھے، ذہنی کام کرنے والے دانشور تھے، کالجوں سکولوں میں پڑھنے والے طلبا و طالبات تھے، حکومت کا کاروبار چلانے والے افسر اور کلرک تھے، پھر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور اور کھیتوں پر کام کرنے والے کاشت کار تھے۔ ان سب گروہوں اور طبقوں سے ہی ایک قوم اور معاشرہ ترتیب پاتا ہے اور اکثر و بیشتر ان طبقات اور گروہوں کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، جب مزدور زیادہ اجرت مانگتا ہے تو ظاہر ہے کارخانے کا مالک اس کو پسند نہیں کرے گا۔ جب کاشت کار اپنی بٹائی کے حصے میں اضافہ چاہے گا تو یہ بات مسلمہ ہے کہ زمیندار اور جاگیردار اس پر ناک بھوں چڑھائے گا۔ اب کوئی سیاسی جماعت کن عوام اور کس "قوم" کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لئے آواز اٹھائے گی یا سرمایہ داروں کے منافعوں کی حفاظت کے لیے کاشت کار کی بٹائی میں زیادہ حصے کا مطالبہ کرے گی یا زمیندار اور جاگیردار کے حقوق کی حفاظت کرے گی۔ اس صورت حال میں ظاہر ہے کہ یہ سیاسی جماعتیں اپنے دعاوی کے باوجود بالآخر کسی نہ کسی طبقے کے مفاد کی حفاظت کا فریضہ سر انجام دیتی ہیں، اس لیے یہ جماعتیں اپنے تمام نعروں اور منشوروں کے باوجود عملاً کسی نہ کسی طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس لیے ان کے ناموں، ان کے دعاوی ان کے منشوروں کی بنیاد پر صحیح تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے کہ یہ منشور یہ دعاوی یہ نعرے سبھی تجزیے میں ممد ہوتے ہیں اور ان جماعتوں اور تحریکوں کے صحیح عزائم جاننے کی طرف راہنمائی کرتے ہیں لیکن اصل

ہیں ان جماعتوں کی تمام سرگرمیوں اور مختلف مواقع پر ان کے عمل کا بغور مطالعہ ہی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ وہ کس طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ کیونکہ جو جماعتیں اوپری طبقوں کے مفادات کی حفاظت کرتی ہیں، وہ اس امر کو تسلیم کبھی نہیں کریں گی نام وہ عوام کا لیں گی، نعرہ وہ اسلام کا دیں گی، دہائی وہ ہندو دشمنی کی دیں گی، لیکن اصل میں وہ کسی نہ کسی طبقے کے مفادات کے لیے کوشاں ہوں گی اور ایسی سیاسی فضا اور نظام کے لیے جدوجہد کریں گی جن میں ان کے ممدوح طبقے اور اس کے مفادات محفوظ رہیں۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ تحریکوں کی تاریخ بیان کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے سے پہلے اس معاشرے اور اس وقت کے سماج کا نقشہ پیش نظر رکھا جائے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ سماجی پیداوار کے دوران لوگوں کے آپس میں ایسے رشتے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو ان کی خواہشوں اور تمناؤں سے ماوریٰ ہوتے ہیں، جن کے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ اور لطف یہ ہے کہ ان رشتوں کا انحصار لوگوں کے ارادے پر نہیں ہوتا۔ یہ رشتے بنیادی طور پر ترقی کی اس منزل سے ہم آہنگ ہوتے جاتے ہیں، جن پر پیداوار کی مادّی قوتیں پہنچ چکی ہوتی ہیں چنانچہ جتنی دیر کوئی جماعت یا تحریک لوگوں کی ترقی اور ان کی ضرورتوں کی تھوڑی بہت حد تک تشفی کرتی ہے تو وہ ان مخصوص طبقوں کو ساتھ رکھتی ہے اور یہ کبھی بھی نہیں ہوتا کہ کوئی جماعت یا تحریک ان طبقوں سے ماوریٰ ہو اور اس کے عزائم پورے سماج کے لیے ہوں۔ اس لیے کسی دور میں مخصوص تحریکوں اور سیاسی جماعتوں کے متعلق تحقیق و تفتیش اور تجزیہ کے لیے اس دور کی سماجی حالت، اس دور کے مختلف طبقات کا تناسب ان کے تضادات سبھی پر نگاہ رکھنی ہو گی اور سچ یہ ہے کہ ان طبقات اور سماج کے اندر ان طبقات کے تضادات کے پورے علم کے بغیر تحریکوں کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں بدقسمتی سے تاریخ سے متعلق علوم ویسے ہی ابھی گھٹنوں چل رہے ہیں۔ لیکن تاریخ کو کھنگالنے کا علم تو سرے سے ہی مفقود ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تاریخ کے متعلق ہم اپنا نقطہ نظر متعین کریں۔ کیونکہ تاریخ واقعات کی ترتیب کا نام نہیں واقعات کی پشت پر کام کرنے والے عوامل اور ان کے ردّعمل کے نتائج کے مرقع کا نام ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ عمل اتنا گڈمڈ ہوتا ہے کہ اس کو سمجھنا خاصا مشکل کام ہے۔ لیکن اسی مشکل پر قابو پانا ہی تو اصل کام ہے۔

تاریخ کیا ہے؟

تاریخ کے علم کے بارے میں غلط تصوّرات بھی ہمارا راستہ روکے ہوئے ہیں، اور یہ تصوّرات عالموں اور قارئین دونوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں، دراصل کسی بھی علم کے بارے میں تصورات کی چھان پھٹک بھی بحث و تمحیص اور عوام کے سیاسی اور علمی شعور ہی سے ہوتی ہے۔ اور بحث و تمحیص کی فضا اور علمی شعور کی نشوونما کے لیے جدوجہد جس میں سیاسی، معاشی اور دوسرے مسائل کے لیے جدوجہد شامل ہوتی ہے ایک لازمی شرط ہوتی ہے۔ اہل علم عام طور پر ہنگاموں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا خود اپنا علم اور اس کے متعلق نظریے اسی جدوجہد کی بھٹی میں ہی تپ کر کندن ہوتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ نومبر ۱۹۶۸ء سے لے کر ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء تک پاکستان کے طول و عرض میں جو ہنگامے ہوئے اس نے اہل علم اور سیاستدانوں کے تمام پرانے اور فرسودہ نظریات کو متروک قرار دیا اور ان عالموں اور اہل ثروت سیاستدانوں کے نظریات کو باطل قرار دینے والے کون تھے۔ ان پڑھ مزدور، کسان اور شہروں اور قصبوں کے عام پسے ہوئے شہری، اور دفتروں میں کام کرنے والے کلرک، انہوں نے ہی آگے بڑھ کر یہ ثابت کیا کہ جمہوریت معاشی آزادی اور معاشی انصاف کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ پہلی بار معاشی مسائل اور سوشلزم ہماری قومی زندگی کا ایک اہم جزو قرار پایا۔ یہی نہیں بلکہ علم کی مسلّمہ بنیادیں ہل گئیں، منبر و محراب بھی ان مباحث کی لپیٹ میں آ گئے۔

یہ عمل ہمارے ہاں ہی نہیں ہوا بلکہ ہم تو اس عالم کا ایک بہت ہی حقیر حصّہ ہیں، یہ ہنگامے تو پوری سرمایہ دار، ترقی پذیر دنیا میں رونما ہو رہے ہیں، فرانس ہو یا مغربی جرمنی، امریکہ ہو یا انگلستان، متحدہ عرب جمہوریہ ہو یا بھارت، پاکستان ہو یا افغانستان کون سا خطّہ ہے جہاں آج طلبا اور پسے ہوئے عوام کی فوج ظفر موج اپنی غلامی، جہالت، غربت، پسماندگی اور زبوں حالی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے گلی کوچوں میں نہ نکل رہی ہو۔ لیکن یہ ہم فراموش کر جاتے ہیں کہ جب عوام کی یہ فوجیں گلی کوچوں میں نکلتی ہیں، تو ایک طرف اگر وہ حکمرانوں اور ان

کے سرپرست سامراجیوں کے محلوں میں تہلکہ مچا دیتی ہیں۔ تو دوسری طرف وہ علم و فن کے تمام مروجہ اقدار اور اسلوبوں کو بھی تہس نہس کر دیتی ہیں، اور اہل علم مجبور ہوتے ہیں کہ وہ ان ہنگاموں کا تجزیہ کریں اور اپنے علم کی بنیاد ان نئے عوامل پر رکھیں، جنہوں نے ان عوام کو گلی کوچوں میں دھکیل دیا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ امریکہ جیسا معاشرہ ان ہنگاموں سے ہل گیا ہے۔ اور اب وہاں کے اہل علم ان ہنگاموں کی وجہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ دنیا بھر کے عالم اور تجزیہ نگار ایک وجہ پر متحد و متفق ہیں، وہ ہے ویت نام کے سپوتوں کی بے مثال بہادری اور جواں ہمتی، جس بے جگری سے یہ ویت نامی سالہا سال سے امریکی افواج کے خلاف سینہ سپر ہیں، اس نے پوری دنیا کے عوام میں بہادری اور بے خوفی کی جوت جگا دی ہے۔ ان کے اندر ایک شمع فروزاں کر دی ہے۔ ویت نام کے جنگلوں میں مر مرنے والے ویت نامی کی آواز چار دانگ عالم میں پہنچ رہی ہے کہ سامراجیوں اور ان کے ہمنواؤں کو شکست دی جا سکتی ہے۔ ظالم کا ہاتھ روکا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ پلٹ کر اس کے سامنے کھڑا ہو جایا جائے۔ چنانچہ یہی آواز تھی جس نے یورپ اور افریقہ اور ایشیا کے نوجوانوں کو اپنے اپنے ملکوں کے ظالموں کے خلاف گلی کوچوں میں نکلنے اور لڑنے پر اکسایا۔ یہ درست ہے کہ یہ ہنگامے وقتی ہوتے ہیں، ہاں! ہر انقلاب وقتی ہوتا ہے۔ لیکن اس میں سماجی ترتیب سالہا سال کے لیے بدل جاتی ہے۔ جب سماجی ترتیب بدلتی ہے تو اس سے سیاست، معیشت اور علم و فن سبھی بدلتے ہیں۔ مروّجہ اقدار میں بھی انقلاب بپا ہوتا ہے۔ اس لیے کسی بھی اہل علم اور مورّخ کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ان ہنگاموں سے آنکھیں بند کر لے۔ کیونکہ انہی ہنگاموں کی ظاہری اور باطنی وجوہات علم تاریخ کی اساس ہوتی ہیں۔ اور اس سے ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے کہ تحریکیں حالات کی پیداوار ہوتی ہیں، ان حالات میں معاشی، تعلیمی، علمی اور مذہبی سبھی حالات شامل ہوتے ہیں، اور ان تحریکوں میں بلند کیے جانے والے نعرے وقت کی مخصوص ضرورتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ نعرے بعض دفعہ صرف خول ہوتے ہیں۔ ان کے اندر لوگوں کی ہزار ہا محرومیاں چھپی ہوتی ہیں اور وہ نعرے ان محرومیوں اور تشنگیوں کا مظہر بن جاتے ہیں، اور جب مورّخ ان نعروں کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہے، تو وہ صرف خول کو دیکھتا ہے۔ وہ ان نعروں کے "بول" پرکھتا ہے،

اور آگے بڑھ جاتا ہے وہ ان نعروں کا تجزیہ نہیں کرتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری تحریک کے بارے میں غلط رائے قائم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے قائدین کا معاملہ ہوتا ہے، اور یہ سمجھا جانے لگتا ہے کہ اشخاص یا افراد تحریکوں کو جنم دیتے ہیں، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا ایک دَور، پوری ایک تحریک افراد کے کھاتے میں پڑ جاتی ہے۔

انیسویں صدی کا فرانسیسی مؤرخ۔ جو اپنے دَور میں علم التاریخ کے ممتاز ترین نمائندوں میں شمار ہوتا تھا، تاریخ کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"مؤرخ اس بات کے بہت زیادہ عادی ہیں، کہ انسانی سرگرمیوں کے صرف تابندہ، پرشور اور چند روزہ مظاہروں اور عظیم انسانوں اور عظیم واقعات کی طرف توجہ دیں، بجائے اس کے کہ اقتصادی حالات اور معاشرتی اداروں کی عظیم اور سست رفتار تبدیلیوں کی تصویر کشی کریں جو کہ ارتقائے انسانی کا واقعی دلچسپ اور مستقل جزو ترکیبی ہیں۔ وہ جزو جسے ایک حد تک قوانین کی شکل دی جا سکتی ہے اور جسے ایک حد تک قطعی تجزیہ کا تابع بنایا جا سکتا ہے دراصل اہم واقعات اور افراد عین بین مذکورہ بالا ارتقا کے مختلف لمحات کے نشانات اور علامات کی حیثیت سے اہم ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر واقعات کو جو تاریخی کہلاتے ہیں، اصلی تاریخ سے وہی نسبت ہے جیسی کہ ان لہروں کو جو سمندر کی سطح سے اٹھتی ہیں۔ روشنی میں ایک لمحے کے لیے فروزاں ہوتی ہیں اور اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑے بغیر ریتلے ساحل سے ٹکرا کر ختم ہو جاتی ہیں۔"

یورپ میں تاریخ کو اقتصادی اور معاشرتی حالات کے پس منظر میں جانچنے کا نظریہ صنعتی انقلاب کے بعد سے ہی ظاہر ہونے لگا تھا۔ لیکن شروع میں دوسرے نظریوں کی طرح ان نظریات میں بھی کچا پن موجود تھا۔ اور ابتدا میں یہ نظریات تاریخ میں فرد کے رول اور کردار کے بارے میں کوئی واضح اور معین حل پیش نہیں کر سکے۔ گو انقلاب فرانس کے بعد ان نظریات نے بہت ترقی کی تاہم پختگی حاصل نہ کر سکے۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں فرانس میں جو زبردست انقلاب آئے اور تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں اس نے

بھی علم التاریخ کے نئے نظریوں کے لیے زمین ہموار کی لیکن چونکہ یہ تمام تبدیلیاں اس تیزی سے ہوئیں اور ان کا عبوری دَور کافی دنوں جاری ساری رہا۔ اس لیے ان نظریوں میں بھی یک گونہ غیر واضح پن شامل رہا۔ اور تاریخ کے بارے میں مختلف وقتوں میں مختلف رجحانات سر نکالتے رہے۔ یہ جاننا ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بھی غیر شعوری طور پر تاریخ کے بارے میں مختلف نظریے پیدا کر رہے ہیں۔ اور سیاسی تحریکوں کے تجزیے میں مختلف اصولوں اور قواعد کو پیمانے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن دو سو برس پہلے فرانس میں رونما ہونے والی تبدیلیاں ہوں یا پھر پچھلی نصف صدی میں جو تغیرات اس برصغیر میں رونما ہو رہے ہیں، یہ سب ایک بات کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کہ تاریخی واقعات کی رفتار کسی صورت میں بھی محض انسانوں کے شعوری عمل سے متعین نہیں ہوتی بلکہ ان میں کئی ایک غیر شعوری عوامل بھی شامل ہوتے ہیں، ان غیر شعوری عوامل میں روایت، عقیدہ، پسند اور ناپسند سبھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ شعوری اور غیر شعوری دونوں عوامل کے پیچھے مخصوص مادّی تقاضے کام کر رہے ہوتے ہیں، لیکن جب یہ شعور کی سطح پر آتے ہیں تو یہ تمام مادّی تقاضے بہت گہرے دفن ہو گئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی مورّخ اور تجزیہ نگار ان تقاضوں کا ذکر کرتا ہے تو عام طور پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ اور کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تصوّر تو فلاں شخص نے دیا، لیکن یہ کیوں نہیں کوئی سوچتا کہ آخر اس تصوّر کے جنم لینے اور اس کی مقبولیت کے لیے بھی تو کچھ تقاضے ہوں گے یا اس کی بالآخر ناکامی میں بھی کوئی طاقت اور بعض حالات مصروف عمل ہوں گے۔

تاریخ کا نظریہ اور ابن خلدون

دراصل علم التاریخ کو زیادہ سائنسی بنیادوں پر گامزن کرنے کے آغاز کا سہرا ابن خلدون کے سر بندھتا ہے۔ چنانچہ علم التاریخ کے عالموں میں وہی پہلا عالم تھا جس نے اپنے مقدمہ میں لکھا تھا:

تاریخ ظاہر میں تو زمانوں اور سلطنتوں کی روایتوں سے زیادہ کوئی حقیقت

نہیں رکھتی لیکن باطن وہ نام ہے نظر و تحقیق کا، مخلوقات اور اس کے اصول کی باریک تحلیل کا، اس گہرے علم کا جس کا تعلق واقعات کی کیفیات اور اسباب سے ہے اور اس حیثیت سے اس کے رگ و ریشے فن حکمت سے وابستہ ہیں، اور وہ اس کی مستحق ہے کہ اس کا شمار حکیمانہ علوم میں کیا جائے۔"

ابن خلدون نے اپنے دور میں علم تاریخ کو آگے بڑھانے میں جو نمایاں کام کیا اس کا ایک عالم معترف ہے اور اس نے پہلی بار علم تاریخ کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی وہ علم تاریخ کا پہلا عالم ہے جس نے ان اسباب سے بحث کرنا ضروری خیال کیا جن کی وجہ سے یہ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ اس نے ان اسباب کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک سبب مورّخ کی جانبداری اور اپنے مخصوص عقیدے کی پاسداری کو قرار دیا اس کا کہنا ہے کہ ایک تو مصنفین کی جانبداری جو مورّخ کی نفسیات کو متعین کرتی ہے۔ اور یہ ایسے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے۔ جو مصنف کو فیصلہ کی آزادی سے روک دیتی ہے۔ اور اس کو ہر ممکن ذریعے سے اس اعتقاد کی تائید پر مجبور کرتی ہے۔ مثلاً اپنی موجودہ فطرت کی بنا پر ایک شیعی کا ذاتی میلان یہ ہوتا ہے کہ وہ بنو امیہ کی تاریخ کو سخت سے سخت برائیوں سے بھر دے"۔ یا پھر ایک اور میلان کا بھی ابن خلدون ذکر کرتا ہے۔ یہ میلان ہے طاقتور یا برسر اقتدار کی خوشنامد اس طرح سے تاریخ کو آقا کی مدح و ستائش کی مبالغہ آمیز کہانیوں کا مجموعہ بنا دیا جاتا ہے۔

ابن خلدون علم تاریخ کی کمزوری کی وجوہ میں ایک اہم وجہ تمدن کے حالات سے عدم واقفیت بھی بتاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"جو مورّخ اجتماع کی حقیقت پر نگاہ نہیں ڈالتا اور جو چیزیں اجتماع کی حقیقت سے موافقت اور ناموافقت رکھتی ہیں۔ ان میں فرق نہیں کر سکتا وہ واقعات کی تخلیق کا ایک قیمتی ذریعہ کھو دیتا ہے"۔

ابن خلدون کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے علت و معلول کے قانون کا تاریخ پر اطلاق کیا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"ہم دنیا اور دنیا کی تمام مخلوقات کو جس شکل میں دیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ

ان میں ایک خاص ترتیب و نظام پایا جاتا ہے۔ اسباب اپنے نتائج کے ساتھ گہرا ربط و تعلق رکھتے ہیں۔ ایک مخلوق دوسری مخلوق سے وابستہ ہے بعض موجودات دوسری موجودات کی شکل بدل لیتے ہیں، غرض نہ اس کی کوئی انتہا ہے نہ ان عجائبات کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔"

چنانچہ وہ اس اصول کو علم تاریخ پر لاگو کرنے پر اصرار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر علم کا اصلی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ان علائق کو معلوم کرے جو ایک خاص مخلوق اور اس کے اسباب کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ آخر تاریخ سمجھنے کے لیے یہی روش کیوں اختیار نہ کی جائے۔

لاریب ابن خلدون نے علم تاریخ کو آگے بڑھانے میں اپنے مقدمے کی صورت میں بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ لیکن یہ بات بھی اتنی ہی صحیح ہے کہ اس زمانے میں ابھی سائنس اور ٹیکنالوجی نے نہ تو اتنی ترقی کی تھی، کہ موجودات کی تبدیلی کے صحیح اسباب کی نشاندہی ہوسکتی اور نہ ہی سائنس کی بنیادیں اتنی استوار ہوئی تھیں کہ سماجی علوم پر ان کا اطلاق کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں جن اصولوں پر اصرار کرتا ہے۔ خود تاریخ میں ان کو پوری طرح استعمال نہیں کر پاتا۔ اور خود بھی اپنے عقائد کی زنجیروں میں جکڑا رہتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ وہ اولیا کی کرامات میں یقین رکھتا ہے اور ہر زمانہ اور ہر مقام پر اس کے ممکن الوجود ہونے کو تسلیم کرتا ہے۔ اور متکلمین کی تعریف کے مطابق معجزہ یا کرامت ایک ایسی چیز ہے جو طبعی قوانین کو توڑ دیتی ہے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ بقول ڈاکٹر طٰہٰ حسین ابن خلدون ایک طرف تصوّف سے اور دوسری طرف اسکندریہ اسکول کے فلسفہ الٰہیہ اشراقیہ سے متاثر ہے یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ بعض انسانی روحوں میں ایک ایسی خارق عادت قوّت ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ نہ صرف آیندہ کے لیے پیشگوئی کرسکتی ہیں۔ بلکہ واقعات کی رفتار پر بھی اثرانداز ہوسکتی ہیں۔

صنعتی دور اور علم تاریخ

دراصل ابن خلدون نے جب علم تاریخ کے متعلق اپنے نظریات کو ترتیب دیا تو اس وقت یہ جہان رنگ و بو صنعتی انقلاب سے دوچار نہ ہوا تھا۔ ابھی تک ایشیا اور افریقہ اور یورپ جاگیری یا ابتدائی قبائلی دور میں رہ رہے تھے۔ اور انسانی ضرورتوں نے سائنسی علوم کی نشوونما کے لیے فضا سازگار کی تھی، لیکن جب صنعتی انقلاب برپا ہوگیا۔ تو دنیا اور اس کے علوم بھی بدل گئے انسان کی نگاہوں میں بلا کی وسعت اور تیقن پیدا ہوگیا۔ اس وسعت اور تیقن نے معاشرے سے متعلق قوانین اور قاعدوں میں بھی پہلی بار تیقن اور ضبط پیدا کیا۔ چنانچہ یہی وہ دور تھا۔ جب مارکس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "سرمایہ" کی جلد اوّل میں لکھا تھا۔ "ٹیکنالوجی یہ راز افشا کرتی ہے کہ انسان کا فطرت سے عملی رشتہ کیا ہے۔ یہی ٹیکنالوجی پیداوار کے ان طریقوں کو ہماری نظر کے سامنے لاتی ہے جن سے وہ گذر بسر کرتا رہا ہے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انسان کے سماجی حالات کس طرح ترتیب پاتے رہے ہیں۔ اور ان کی بنا پر جو ذہنی تصورات بنتے رہے اور پروان چڑھتے رہے ان کی حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے"۔ مارکس کے سر دراصل علم التاریخ کو نئے اسلوب سے جانچنے کا سہرا بندھتا ہے اور اس نے پہلی بار صنعتی دور میں پیدا ہونے والی قوتوں کا تجزیہ کیا۔ اور اس تجزیہ کی بنیاد پر ایسے کلیے مرتب کیے جن کی بنیاد پر پوری انسانی تاریخ کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"زندگی کی سماجی پیداوار کے دوران عامۃ الناس کے آپس میں ایسے رشتے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اور ان رشتوں کا انحصار لوگوں کے ارادے پر نہیں ہوتا یہ پیداواری رشتے اصل میں سماجی ترقی کی اس خاص منزل کے مطابق ہوتے ہیں۔ جس پر پیداوار کی مادی قوتیں پہنچ چکی ہوتی ہیں"

اور سچ تو یہ ہے کہ اس فلسفے کے مطابق انہی پیداواری رشتوں کی بنیاد پر ہی کسی سماج کا معاشی ڈھانچہ بنتا ہے اور پھر یہی معاشی ڈھانچہ وہ بنیاد ہوتا ہے۔ جس پر قانون اور

سیاست کا پورا ڈھانچہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور سماجی شعور یا سماجی تصوّرات کی متقرہ شکلیں اسی کے مطابق ترتیب پاتی ہیں۔ مادّی زندگی کا طریق پیداوار ہی فیصلہ کرتا ہے، اس بات کا کہ سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی عام طور سے کس راہ پر چلے اور کیسے چلے ہم عام طور پر مغالطہ میں رہتے ہیں۔ کہ لوگوں کا شعور یا ان کے تصوّرات و افکار ان کی زندگی کے چلن یا اسکے رسم و رواج، اقدار اور اخلاقیات کا فیصلہ کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کی سماجی زندگی اور ان کا سماجی وجود ان کے تصوّر یا شعور کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے اور یہ فیصلہ عام طور پر ایسے نامعلوم طریقوں سے ہوتا ہے کہ خود فیصلہ کرنے والے یہ نہیں جان سکتے کہ کل تک جس قدر کو، جس روایت کو، درست تسلیم کرتے تھے، وہ آج یکایک متروک کیسے ہو گئی۔ مثال کے طور پر پردہ کو ہی لیجئے کل تک یہ شرافت تہذیب اور اخلاق کا مظہر تصوّر ہوتا تھا لیکن آج برقعہ متروک ہے اور شرافت تہذیب اور اخلاق کا عین تقاضا یہ ہے کہ عورت مرد کے دوش بدوش زندگی کے ہنگامہ ہاؤ ہو میں شریک ہو اس قسم کے سینکڑوں تغیرات اور تبدیلیاں روزانہ ہماری زندگی میں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ہم ان کی وجوہ اور اسباب پر غور نہیں کرتے عام آدمی تو ایک طرف ہمارا استاد اور عالم بھی ان اسباب کی نشاندہی سے گریز کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس دنیائے دلفریب کو بنی بنائی چیزوں کا ایک مرکب یا مجموعہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ مرکب ہے عمل کے سلسلوں کا جس میں بظاہر چیزیں ساکن وثابت دکھائی دیتی ہیں۔ اور ہمارے دماغوں میں ان کا تصوّر بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ اشیا ساکن وثابت نہیں ہوتیں بلکہ یہ ہمیشہ اور مسلسل ایک قسم کی بے روک تبدیلی اور تغیر سے گزرتی رہتی ہیں۔ مسلسل وجود میں آتی اور ختم ہو جاتی ہیں۔ یہی حال افکار و تصوّرات کا ہوتا ہے۔ چنانچہ جدلیاتی فلسفے کے نام لیواؤں کے نزدیک کوئی شئے کوئی بات نہ تو آخری اور حتمی ہے نہ مطلق اور مقدس۔ یہ فلسفہ ہر شئے کے عبوری اور گذراں کردار کو اور ہر شئے کے اندر کارفرما اور بدلتی ہوئی کیفیت کو کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اس فلسفے کے سامنے کسی شئے کو ثبات نہیں، سوائے تغیر کے، سوائے اس بے روک لوک عمل کے کہ اشیاء وجود میں آئیں اور گذر جائیں۔ چنانچہ تاریخ کے عمل میں بھی کچھ اسی قسم کا سلسلہ رواں دواں رہتا ہے۔ دراصل

ترقی یا نشوونما کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر سماج میں پیداوار کی مادی طاقتیں پیداوار کے سلسلے میں جو باہمی رشتے اور تعلقات موجود ہوتے ہیں، ان سے ٹکراتی ہیں، یعنی ملکیت کے جن تعلقات کے اندر اب تک سماج کا کام چلتا آیا تھا ترقی کی کسی خاص منزل تک پہنچ کر سماج میں پیداوار کی مادی طاقتیں ان سے ٹکرا جاتی ہیں۔ یہ رشتے پہلے تو پیداواری طاقتوں کی ترقی کی شکل میں قائم ہوئے لیکن آگے چل کر یہی پیداواری رشتے ان کے پیروں میں زنجیر بن جاتے ہیں۔ جب یہ صورت پیش آتی ہے تو سماجی انقلاب کا دور شروع ہوتا ہے معاشی اور اقتصادی ڈھانچہ بدلنے سے وہ عظیم اوپری ڈھانچہ کم و بیش یا پورے کا پورا تیزی کے ساتھ بدل جاتا ہے۔

تبدیلیوں کے ان اصولوں سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ معاشی ڈھانچہ بدلتے ہی اوپر کا سیاسی اور افکار کا ڈھانچہ فی الفور بدل جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے تاہم ہمیں ان دونوں چیزوں کی تبدیلیوں کے درمیان فرق یا امتیاز ضرور کرنا چاہیے۔ پیداوار کے معاشی حالات کی قلب ماہیت جس کا اندازہ قدرتی سائنس کے اندازوں کی طرح ٹھیک ٹھیک لگایا جاسکتا ہے اور اس تبدیلی میں اور اس تغیر میں بڑا فرق ہے۔ جو قانونی، سیاسی، مذہبی اور فن و ہنر یعنی جمالیاتی افکار میں رونما ہوتا ہے۔ اور انہی کے ذریعے لوگ اس تصادم سے آگاہ اور آشنا ہوتے ہیں۔ اور پھر اسی شعور کی بنیاد پر وہ ان تبدیلیوں کو زیادہ واضح صورت دینے کے لیے میدان عمل میں کود پڑتے ہیں۔ مارکس اس ضمن میں اینگلز کو ایک خط میں لکھتا ہے:

"جس طرح ہم کسی ایک آدمی کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت یہ مدِ نظر نہیں رکھتے کہ وہ خود اپنے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ اسی طرح ہم اس تبدیلی کے دور کو اس سے نہیں جانچیں گے کہ اس دور کا عام شعور کیا تھا۔ بلکہ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہ شعور مادی زندگی کے کن کن تصادموں سے پیدا ہوا۔ یعنی ہم نظر ڈالیں گے اس ٹکراؤ پر جو سماج کی پیداواری طاقتوں اور پیداواری رشتوں کے درمیان موجود تھا۔"

تاریخ کے نظریے پر اس جدلی فلسفے کے اطلاق سے تاریخ کے بہت سے عیب دُور

ہو گئے اور پہلے تاریخ کا جو مطالعہ زیادہ سے زیادہ اس قدر ہوا کرتا تھا کہ تاریخ کے ماہرین انسانیت کی تاریخی سرگرمیوں کے لئے صرف قائدین اور چند افراد کے فکری اور نظری محرکات کی چھان بین کر لیں اور اس طرف نگاہ ہی نہ کریں کہ آخر ان فکری اور نظری تحریکوں کو جنم دینے والے کون سے عوامل تھے، اور کون سے خارجی قانون تھے جنہوں نے ان تحریکوں کو مہمیز کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ تاریخ میں عام لوگوں کی سرگرمیوں اور جدوجہد کا کہیں ذکر ہی نہیں ملتا تھا۔ تبدیلیوں اور انقلابات کے جاننے کے بارے میں پہلی بار اس فلسفے نے ایک انقلاب آفریں دور کا آغاز کیا۔ اور پہلی بار یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ جتنے خیالات اور رجحانات ہوتے ہیں۔ بلا استثنا ان کی جڑیں پیداوار کی مادی طاقتوں کی موجودہ حالت میں دبی ہوئی ہیں بلاشک لوگ اپنی تاریخ خود بناتے ہیں، لیکن وہ کیا چیز ہے جو لوگوں کے محرکات کا فیصلہ کرتی ہے؟ جو ان کو سرگرم عمل کرتی ہے؟ جو عام لوگوں کے ارادوں کو کسی راہ پر ڈالتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو ایک دوسرے سے متضاد خیالات ارادوں اور تمناؤں کے ٹکراؤ کو جنم دیتی ہے وہ کیا ہے جو انسانی سماجوں کے تمام تر تصادموں کا حاصل حصول ہے اور زندگی میں پیداوار کے وہ خارجی حالات کیا ہوتے ہیں جو بنیاد بنتے ہیں۔ انسان کی تمام تاریخی سرگرمی کا ان حالات کے نشوونما پانے کا کیا قانون ہے۔ دراصل ان سوالوں کے جواب پر ہی تاریخ کے سائنسی علم کی بنیاد ہے۔

تاریخ کی صحیح بنیادیں

تاریخ کی صحیح بنیادوں کی تلاش کے سلسلے میں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تاریخ معاشی عمل کا نام ہے، معاشی عمل سے مراد ذرائع پیداوار کی ترکیب و تشکیل ہے اور ذرائع پیداوار کے مالک اور ان ذرائع پیداوار کو استعمال کرنے والے محنت کشوں کے درمیان استوار ہونے والے رشتوں اور تعلقات کو اس معاشی عمل کی جان سمجھنا چاہیئے۔ جیسے جیسے ذرائع پیداوار میں تبدیلیاں ہوتی ہیں تو ان سے محنت کرنے والوں اور ان ذرائع پیداوار کے مالک لوگوں کے رشتوں ناطوں میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو یہ تبدیلیاں پوری سماج میں تبدیلی کی اساس بنتی ہیں۔ لیکن ان نظریات سے اور مارکس کے ان اصولوں سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ انسان معاشی

مقاصد کے علاوہ جدوجہد ہی نہیں کرتا۔ واقعہ یہ ہے کہ مارکس خود اپنی تحریروں میں جگہ جگہ اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل اور ارتقا میں معاشی اسباب کے ساتھ ساتھ دوسرے عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی مختلف ادوار میں تاریخ کے ارتقا، سماجی تبدیلیوں اور انقلابوں میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام عناصر ذرائع پیداوار اور سماجی رشتوں کے درمیان یا تو واسطہ بنتے ہیں یا پھر ان ذرائع پیداوار اور ان پہ کام کرنے والوں کے مابین رونما ہونے والے تضادوں کو زیادہ واضح کرتے ہیں، ان کو آگے بڑھاتے ہیں، اور اس طرح سے انقلاب کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں۔

مارکس نے انسانی تاریخ کے اس نظریے کو باقاعدہ ایک قانون کی شکل دی اور اس نے انسانی تاریخ اور اس کے ماضی پہ اس قانون کا اطلاق کر کے ثابت کر دکھایا کہ تاریخ کو سمجھنے کا یہی واحد راستہ ہے اور یہی بہترین طریقہ ہے کیونکہ مارکس کا یہ طریق فکر ایک طرف ماضی کی تاریخ کو سمجھنے میں راہنمائی کرتا ہے تو دوسری طرف وہ تاریخ کو بدلنے اور معاشرے میں انقلاب برپا کرنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ اب چونکہ مارکس کے وضع کردہ قوانین وضوابط اور اصول عام انسانوں اور بالخصوص محنت کرنے والے طبقوں کو استحصال کرنے والے طبقوں کے خلاف منظم ہونے کا سبق دیتے ہیں اور انہیں انقلاب کا مژدہ سناتے ہیں تو ظاہر ہے ان حالات میں وہ طبقے جو استحصال کر رہے ہیں، جن کے مفادات لوٹ کھسوٹ کے ساتھ وابستہ ہیں وہ مارکس کے اصولوں کو کبھی پسند نہیں کریں گے اور نہ ہی ان پہ یقین لائیں گے۔ اسی طرح سے وہ عالم اور مورخ جو اس استحصالی نظام کا ایک جزو ہیں اور جو انقلاب سے لرزاں و ترساں ہیں وہ مارکس کی تعلیمات کی غلط توجیہات کرتے ہیں اور غلط معانی پہناتے ہیں اور وہ نعرہ لگاتے ہیں کہ انسان صرف پیٹ کا بندہ نہیں۔ جیسے مارکس یہ کہتا ہے کہ انسان صرف پیٹ کا بندہ ہے۔ مارکس تو فقط یہ کہتا ہے کہ انسانی سماج کے ارتقا کے چند اصول ہیں۔ ان اصولوں میں بنیادی اہمیت ذرائع پیداوار کو حاصل ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ کسی مخصوص سماج میں عام لوگ روٹی روزگار کیسے حاصل کرتے ہیں اور اس روٹی روزگار کے حصول میں جو ذرائع پیداوار کا وہ استعمال کرتے ہیں ان کا کون مالک ہے اور اس مالک کے ساتھ ان کا کیا رشتہ ہے۔

مثال کے طور پر اگر عام آبادی زمین پر کاشت کرتی ہے تو اس سماج میں زمین ہی ذریعہ پیداوار کہلائے گی۔ اب زمین اگر بڑے زمینداروں کی ملکیت ہے اور عام کاشت کاران کا مزارعہ ہے تو یہ زمینداری نظام کہلائے گا اگر کسی ملک میں صنعت ترقی کر چکی ہے اور یہ کارخانے انفرادی یا مشترکہ کمپنیوں کی ملکیت ہیں جو مزدوروں سے کام لیتے ہیں اور تمام منافع پر مالکان کا حق ہوتا ہے تو وہ صنعتی سرمایہ داری نظام کہلائے گا کیونکہ زمین پر کاشت کے دوران مالک زمین اور مزارعہ کے درمیان جو رشتہ قائم ہوا وہ ذرائع پیداوار یعنی زمین کی بنیاد پر ہی استوار ہوا۔ اس لئے ذریعہ پیداوار کی بنیاد پر تمام سماجی ڈھانچہ جس میں افکار، اخلاق اور تہذیب شامل ہیں استوار ہو گا یہی وجہ ہے کہ زمینداری نظام کے حامی نواب کالاباغ کی سوچ کا انداز حکومت اخلاقی اقدار، میل جول کے طریقے سبھی سہگل، یا آدم جی کے نظریات اور اقدار سے مختلف ہونگے۔ اسی لیے مارکس نے فریڈرک اینگلز کو ایک خط میں تحریر کیا تھا۔

"مجلسی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابات کے اسباب کی تلاش افراد کے ذہنوں میں نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ذرائع پیداوار اور مبادلہ کی تبدیلیوں میں ان کو ڈھونڈنا چاہیئے۔ ان اسباب کی تلاش فلسفے میں نہیں بلکہ متعلقہ ازمنہ کی معاشیات میں کرنا چاہیئے۔"

مارکس کی تحریروں سے اس امر کا بھی کافی ثبوت ملتا ہے کہ تاریخ کے معاشی نظریے پر بحث کرتے وقت ذرائع پیداوار سے اس کی مراد صرف پیداوار کا طریق ہی نہیں بلکہ مزدوروں کی عام حالت، ان کی تنظیم، تقسیم کار، اتحاد محنت خود صنعت کاروں کی تنظیم، یہ سب عناصر ذرائع پیداوار کے وسیع معنوں میں شامل ہیں اور تجزیے کے موقع پر ان سب کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔ چنانچہ مارکس کا کہنا ہے۔

"جدید بارآور قوتوں کو کام میں لانے کے لئے انسان اپنے ذرائع پیداوار کو بدلتے رہتے ہیں اور اس تبدیلی میں وہ اپنے ذرائع معاش کو بھی بدل دیتے ہیں اور اس سے وہ اپنے تمام مجلسی تعلقات بھی بدل دیتے ہیں۔"

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سوشلسٹ سماج سے قطع نظر باقی تمام معاشرے اور سماج مختلف طبقات کا مجموعہ ہیں، یہ طبقات ایک دوسرے سے متصادم اور متحارب صفوں میں کھڑے نظر آتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ کسی مقررہ سماج میں اس کے کچھ لوگوں کی تمنائیں اور خواہشیں دوسروں کی

تمناؤں اور خواہشوں سے ٹکراتی ہیں۔ متصادم ہوتی ہیں اور یہ بات یہیں پر نہیں رُکتی بلکہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ کہ قوموں اور سماجوں کے اندر بھی باہمی کش مکش رہی ہے۔ اور اب بھی رہتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے خلاف برسرپیکار رہی ہے۔ اور اب بھی ہے۔ اور ایک سماج دوسرے سماج کے خلاف آج بھی تلوار بدست میدان جنگ میں اترنے کے لئے تیاریاں کرتا نظر آتا ہے۔ اس لئے بین الاقوامی تاریخ ہو یا ملکوں کے اندر کی ہر حال میں یہ طبقاتی کش مکش کا ایک پرتو ہوتا ہے۔ خود سوشلسٹ ممالک کے اندر اور باہر کے تضادات بھی طبقاتی کش مکش کا مظہر ہیں۔ اس لئے تاریخ ہر حال میں طبقاتی جدوجہد کے جانے بغیر قلمبند نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ جدوجہد کبھی سامنے نظر آتی ہے اور کبھی آنکھوں سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس لئے صحیح تاریخ کے رقم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سماج کے مختلف طبقات کا تجزیہ ہو۔ انکی خواہشات و تمناؤں کا ذکر ہو۔ ان کے تصادم کی کہانی ہو۔ ان کے ظاہر اور باطن کا تذکرہ ہو۔ کیونکہ بہت دفعہ یہ تصادم نظر آتا ہے اور بہت دفعہ سطح آب خاموش اور ساکن دکھائی دیتی ہے۔ لیکن تاریخ کے تجزیہ نگاروں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس سطح آب کے نیچے پرورش پانے والے سیلابوں پر بھی نگاہ رکھیں اور ان کا حال بھی قلم بند کریں۔ میں نے ان صفحات میں کچھ اسی قسم کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے اس انداز سے یہ پہلی کوشش ہے ظاہر ہے کہ اس کوشش پر کچھ حلقے چونکیں گے پھر کچھ ناک بھوں چڑھائیں گے۔ پھر اس کے بعد کچھ شاید "شمشیر بدست" مخالفت پر بھی اتر آئیں۔ لیکن یہ سب باتیں اپنی جگہ پر درست ہوں گی کیونکہ یہ بھی تصادم اور طبقات کی کش مکش کی نشانیاں ہوں گی اور یہ بذات خود تاریخی مواد کا ایک اہم حصہ فراہم کریں گی۔ بہرحال علمی زندگی میں بھی تصادم ناگزیر ہوتا ہے اور اس تصادم سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے امید ہے کہ یہ صفحات اور ماضی کی ان تحریکوں کا تذکرہ ہمیں آج کی تحریکوں اور آج کے تصادم کے سمجھنے میں بہت حد تک مدد دے گا۔

راشٹریہ سیوک سنگھ

پنجاب کا مخصوص کردار

تقسیم سے قبل کا متحدہ پنجاب ہو یا تقسیم کے بعد کا مسلم پنجاب ہو اور یا پھر مغربی پاکستان میں ضم ہونے والا پنجاب ہو۔ بہرحال یہ مخصوص سماجی عوامل کا حامل رہا ہے۔ اس لیے اس خطے میں رونما ہونے والی تحریکوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں پنجاب کے ان مخصوص سماجی عوامل کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ چنانچہ یہی مخصوص سماجی عوامل آج بھی دونوں طرف پنجاب کو اہمیت بخش رہے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ:

آج کا بھارت ہو یا آلیس پینتس برس پہلے کا متحدہ ہندوستان ان دونوں میں ایک مماثلت ضرور موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس دور میں بھی فرقہ واریت کا زہر شمالی ہندوستان کے رگ و ریشے میں دوڑتا نظر آتا تھا۔ اور آج بھی اگر ہندو تعصب اور جنون کی فضا سب سے زیادہ متحرک اور متشدد نظر آتی ہے تو وہ یہی شمالی بھارت ہے۔ چنانچہ جن سنگھ کی تحریک کو بھی تائید و حمایت اسی علاقے سے نصیب ہو رہی ہے۔ سکھوں کی سب سے متشدد اور متعصب اکالی تحریک نے بھی یہیں جنم لیا اور آج بھی بھارت میں ہندو فرقہ واریت کے خلاف یہ تحریک فرقہ داری کے

ہتھیار سے ہی نبرد آزما ہے۔ اور آج سے قریب قریب ایک صدی پہلے بھی اگر ہندو فرقہ داریت اور ہندو تعصب کی سب سے فعال تحریک آریہ سماج کو کہیں پناہ ملی تو وہ شمالی ہندوستان ہی تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ آریہ سماج کی تحریک کا بانی دیانند سرسوتی خود گجرات کاٹھیاواڑ کا رہنے والا تھا۔ وہ پنجابی اور اردو سے جو شمالی ہندوستان کی اہم زبانیں تھیں، بالکل ناآشنا تھا۔ اور تو اور اسے ہندی کی شدبدھ بھی حاصل نہ تھی وہ صرف گجراتی اور سنسکرت جانتا تھا۔ لیکن اس کی تحریک کو جتنی مقبولیت پنجاب اور یوپی کے اضلاع میں حاصل ہوئی اس کا عشرِ عشیر بھی گجرات کاٹھیاواڑ یا مہاراشٹر یا بنگال میں حاصل نہ ہو سکا۔ دراصل یہی اہم سوال ہے جو فرقہ واریت کی تاریخ کی بنیاد ہے۔ اگر اس سوال کا صحیح اور قابلِ فہم جواب تلاش کیا جا سکے تو یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس خطے میں ہی کیوں ان متشددانہ تحریکوں کو پناہ ملتی رہی ہے۔ اور یا یہاں سے یہ تحریکیں کیوں اٹھتی رہی ہیں۔

سچ یہ ہے کہ صرف ہندو تعصب اور جنون ہی کی تحریک کو اس فضا میں پناہ نہیں ملی بلکہ خود مسلمانوں کی متشددانہ تحریکیں بھی یہیں پل کر جوان ہوئیں اور اسی شمالی ہندوستان میں ان تحریکوں کو سازگار فضا میسر آئی۔ ہجرت کی تحریک ہو یا چھپن فیصدی کا نعرہ، وہ یہیں سے بلند ہوا۔ اور صرف سیاسی تحریکوں کو ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی مذہبی تحریکوں اور نئے فرقوں کو یہی فضا میسر آئی۔ اور اسی خطے کی مٹی راس آئی۔ احمدیت (مرزائیت) کی تحریک کسی اور صوبے اور خطے میں کیوں پیدا نہ ہوئی۔ اہلِ قرآن کو یہی خطہ راس آیا۔ اور پھر خاکساروں نے بھی اسی شمالی ہندوستان میں چپ راست کا نعرہ لگایا اور یہیں پر مجلس احرار نے جوا ایمان دلسیار کیا۔ شہید گنج کے مسلمانوں نے بھی یہیں گولیاں کھائیں اور تو اور جماعت اسلامی کے خالق مولانا مودودی حیدر آباد دکن میں پلے اور جوان ہوئے۔ وہیں ان کے علم کا شہرہ بلند ہوا۔ لیکن جماعت اسلامی اور اس کے فلسفہ کے پرچار کے لیے ان کو حیدر آباد نہیں بلکہ پنجاب کی سرزمین میں ہی کشش محسوس ہوئی اور یہیں انہوں نے ڈیرے ڈالے اور جب پٹھانکوٹ سے اٹھے تو لاہور آئے۔ کہیں اور نہیں گئے اس بنیادی گتھی کا جواب پنجاب کی سرزمین میں مختلف طبقوں، فرقوں اور مذاہب کی آمیزش اور آویزش میں پوشیدہ ہے۔ پنجاب میں جب انگریزوں کی عملداری شروع ہوئی تو

یہاں بھی انہوں نے نظامِ ارض کو اپنی مرضی اور اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کے اقدام کیے اور اس طرح سے زمین میں انفرادی ملکیت کی ابتداء ہوئی۔ کیونکہ انگریزوں سے پہلے متحدہ ہندوستان میں زمین پر انفرادی ملکیت کا رواج کہیں نہ تھا۔ اور زمین پہ حکمران کا حق تسلیم ہوتا تھا لیکن زمین کو زیرِ کاشت لانے والے کاشت کاروں کو حاکم کے مقرر کردہ جاگیرداروں کو اپنی فصلوں کا ایک حصہ دینے کا رواج تھا۔

پنجاب انگریزوں کی آمد سے پہلے

انگریزی تسلط سے پہلے پنجاب میں زراعت کا انحصار بارش، دریاؤں کی طغیانی اور جہاں پانی کی زیرِ زمین سطح کم تھی، وہاں کنوؤں پر تھا۔ سب سے زیادہ زرخیز اور گنجان آباد خطے دریاؤں کے قریباً دس دس پندرہ پندرہ میل چوڑے علاقوں میں تھے۔ انہی دریاؤں کے کنارے پر پنجاب کے بڑے بڑے تجارتی شہر اور تہذیبی مرکز وجود میں آئے۔ اور انہوں نے تاریخ کے سینہ پر اپنا نام ثبت کیا۔ دریاؤں کے کناروں سے ہٹ کر زراعت کی ترقی ان خطّوں میں ہوئی۔ جہاں بارش کے امکانات زیادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مغربی پنجاب کے ان علاقوں میں جہاں بارش کم ہوتی تھی۔ وہاں کی قریب قریب تمام آبادیاں صرف دریاؤں کے کناروں پر ہی وجود میں آئیں اور مغربی پنجاب کے مقابلے میں مشرقی پنجاب میں بارشوں اور دریاؤں کی وجہ سے زراعت کے میدان میں زیادہ ترقی اور آبادی نظر آتی تھی، ان زرعی آبادی کے علاقوں کے علاوہ پنجاب کا تمام علاقہ لق و دق میدان تھا، یا ریگستان، چنانچہ ان علاقوں میں خانہ بدوش، نیم وحشی قبائل، مویشی پالتے، ڈاکے ڈالتے اور مویشی چوری کرتے یا پھر یہ قبائل ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرتے۔ اس طرح سکھوں کی حکومت کے خاتمہ تک پنجاب زیادہ تر بنجر اور غیر آباد علاقوں پر مشتمل تھا۔ اور اجتماعی طور پر یہاں کا نظام مقابلتاً پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ تھا۔ اس نظام کی پسماندگی کی ایک اور اہم وجہ بیرونی حملہ آوروں کی لوٹ مار اور قتل و غارت بھی تھی، کیونکہ یہ خطہ حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ اور آئے دن حملہ آوروں کے گھوڑوں کی یلغار سے روندا جاتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی دیہی زندگی میں اکھاڑ پچھاڑ روزمرہ کا معمول بن گئی۔ لیکن اس اکھاڑ پچھاڑ اور

تبدیلیوں کے باوجود دیہی زندگی کی خود کفیلی بدستور قائم و دائم رہی۔ یعنی اگر کوئی گاؤں حملہ آوروں کی زد میں آیا تو وہاں سے پورے گاؤں نے نقل مکانی کی اور دوسری جگہ جا کر اپنی بستی بسائی لیکن دیہی نظام میں رخنہ نہیں پڑنے دیا۔ اس دیہی خود کفیلی کا مطلب یہ تھا کہ گاؤں بذاتِ خود ایک خود کفیل اکائی تھا جس کو اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں باہر کی دنیا سے زیادہ رابطہ کی ضرورت نہ پڑتی تھی، یعنی گاؤں میں کاشت ہوتی اس کاشت کے بل بوتے پر گاؤں میں ترکھان، لوہار، جولاہے، موچی زندہ رہتے اور اس کے بدلے گاؤں والوں کی ضرورت کی اشیاء تیار کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ گاؤں کو کسی منڈی اور تاجر کا دست نگر نہ ہونا پڑتا تھا۔

زمین گاؤں یا قبیلہ کی مشترکہ ملکیت تصور ہوتی تھی، اور جب بادشاہ کا تقرر کردہ جاگیردار مالیہ وصول کرتا تو وہ بھی مشترکہ طور پر ہی مالیہ وصول کرتا تھا۔ اور اس جاگیردار کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا۔ کہ وہ اس جاگیر کا مالک ہو گیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا تھا۔ کہ وہ اس اراضی سے مالیہ وصول کر کے مرکز کو بھجوا دے اور اس میں سے ایک حصہ وہ اپنے لیے رکھ لے۔ جاگیردار کو اراضی کی فروخت کا نہ تو حق تھا اور نہ اس زمانے میں اراضی کی فروخت کا تصور ہی وجود میں آیا تھا۔

انگریزوں کا نیا نظام

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب پنجاب کی تسخیر کا عمل مکمل کیا تو ان کی ضرورتیں مختلف تھیں۔ ان کا مقصد تو ہندوستان کی تسخیر سے اپنے تجارتی مفادات کی تشفی اور تسکین تھی اور ان مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ مالیہ وصول ہو۔ چنانچہ مالیہ میں اضافے کے پیش نظر اراضی پر انفرادی ملکیت کا رواج وجود میں لایا گیا۔ جیسا کہ خود برطانیہ میں رواج پا چکا تھا اور جس طرح سے برطانیہ کے اندر بھی زرعی اراضی منڈی کی ایک قابل فروخت شئے بن گئی تھی، اسی طرح سے متحدہ ہندوستان میں زرعی اراضی کی شکل بنا دی گئی۔ چنانچہ اب مالیہ ادا کرنے کی ذمہ داری انفرادی طور پر کاشت کار پر ڈالی گئی۔ اور گاؤں یا قبیلہ کی مشترکہ ذمہ داریوں کا رواج ختم کر دیا گیا۔ پہلے مالیہ پیداوار کا ایک حصہ ہوتا تھا۔ لیکن انگریزوں نے رقبہ کے اعتبار سے

مالیہ مقرر کر دیا۔ اور روپوں کی صورت میں وصولی لازمی قرار دے دی۔ روپیہ ان دنوں شاذ ہی ہوتا تھا۔ پورے لین دین کا طریقہ فصل اور اناج کے ذریعے عمل میں آتا تھا۔ اب جب کہ سکہ چل نکلا تو پھر کاشت کاروں نے اتنی ہی اراضی اپنے قبضہ میں رکھی، جتنی کا وہ مالیہ ادا کر سکتے تھے، جو مالیہ ادا کرنے سے معذور نکلے وہ اپنے سرداروں اور گزشتہ حکومتوں کے اعلیٰ افسروں، اہلکاروں اور جاگیرداروں کے مزارع بن گئے، اور اس طرح بڑے زمینداروں اور مزارعوں کے طبقے وجود میں آئے

انگریزوں کے عہدِ حکومت میں پنجاب کا دیہی نظام

اراضی پر ذاتی ملکیت کے قیام سے پورا پرانا نظام ہل گیا۔ اور ساتھ ہی برطانوی کارخانوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی مفادات نے اگر ایک طرف اراضی پر انفرادی ملکیت کو رواج دیا تو دوسری طرف انہوں نے خام مال کو خریدتے اور انگلستان کی بنی ہوئی صنعتی اشیاء کی فروخت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس طرح سے پورا گاؤں ایک منڈی بن گیا۔ جب یہ منڈی وجود میں آئی تو اس کا ایک اور لازمہ بھی وجود میں آیا اور یہ لازمہ تھا "بنیا اور آڑھتی"۔

پنجاب کی اس صورتِ حال کا نقشہ خود انگریزوں نے اپنے ابتدائی سالوں کی تنظیمی رپورٹوں میں کھینچا ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۴ء کی تنظیمی رپورٹ میں پنجاب کے چیف کمشنر لکھتے ہیں:

"یہاں کوئی آڑھتی اور دلال نہیں ہے اور نہ ہی بڑے زمیندار ہیں۔ اصولی طور پر کاشت کار اپنا ٹکڑا اراضی کاشت کرتا ہے اور اسی کے مطابق وہ مالیہ ادا کرتا ہے۔ اور باقی ماندہ تمام فصل سے وہ خود استفادہ کرتا ہے۔ اس کو مزید کسی قسم کا کرایہ یا بار نہیں اٹھانا پڑتا۔ اس پر صرف دو ذمہ داریاں ہیں، ایک سرکاری مالیہ اور دوسرا کاشت کے بنیادی اخراجات ان دو خرچوں کو نکال کر باقی تمام آمدنی اس کی اور اس کے خاندان کی ہوتی ہے۔ اور اسی سے وہ ان کی کفالت کرتا ہے۔ اور پس انداز کرتا ہے۔ ایک گاؤں میں بسنے والے ایک دوسرے سے غیر متعلق نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کا آپس میں گہرا ناطہ رشتہ ہوتا ہے اور اکثر ان کی بد ایک ہی ہوتی ہے اور ان کا مشترکہ سردار ہوتا ہے۔ جس کے حکم پر تمام سر جھکا لیتے ہیں اور اس کے

اشارے پر ہی پورا گاؤں متحرک ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے پنجاب کی دیہی زندگی کو دیہی نظام کہا جائے تو درست ہے۔"

یہ تھا پنجاب کا بنیادی نظامِ زندگی، جس میں انگریزی عملداری نے دراڑیں ڈالنی شروع کیں اور آہستہ آہستہ یہ نظام زندگی درہم برہم ہونا شروع ہو گیا۔ یہ تنزل، یہ تباہی، اور یہ بربادی جو پنجاب کی دیہی زندگی کا مقدر ہو چکی تھی، اس کے خلاف فوری طور پر نہ تو کسی حاکم نے توجہ دی اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی ردِ عمل ہوا۔ تا آنکہ ۱۸۷۰ء میں انگریز مال افسروں نے دیہی زندگی میں رونما ہونے والے کرب کو محسوس کرنا شروع کیا۔ اس احساس کی وجہ یہ تھی کہ مالیہ جس انداز سے نافذ کیا جاتا۔ اور وصول کیا جا رہا تھا۔ اس نے کاشت کاروں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اور عدالتیں ایسی صورت میں جس سختی کے ساتھ کاشت کاروں کو بے دخل کرنے لگی تھیں۔ اس نے بھی پنجابی کاشت کار کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں قرض دینے والے بنیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

بنیوں کے اسی سلسلے نے پنجاب میں فرقہ واریت کو جنم دیا۔ یہ بنیوں کا طبقہ ہندوؤں سے متعلق تھا۔ مسلمان مذہباً اس پیشے سے متعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے یہ میدان ہندو کے لیے بلا شرکت غیرے کھلا تھا۔ کاشت کار مسلمان تھا۔ زمیندار مسلمان تھا۔ سود دینے والا مسلمان اور سود لینے والا ہندو۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب اس لین دین میں بنیئے کی زیادتیاں ناقابل برداشت ہونے لگیں اور عدالتوں کی طرف رجوع ہونے لگا۔ تو عدالت کی کرسی پر بھی ہندو بطور منصف کے بیٹھا ہوا تھا۔ یہی نہیں وکیل بھی ہندو تھا۔ بلکہ صورت حال روز بروز تشویشناک ہونے لگی۔ کہ سودی کاروبار کے عوض زرعی اراضی منتقل ہونے لگی۔ جب مسلمان کاشت کار اور زمیندار سود اور اصل ادا نہ کر سکتا تھا تو اس کی مرہونہ اراضی بنیئے کی تحویل میں چلی جاتی۔ چنانچہ یہ کاروبار نہایت وسیع پیمانے پر ہونے لگا اور وکیل اور منصف جو اکثر ہندو ہوتے تھے۔ وہ بھی اپنی پس انداز پونجی بنیئے کے حوالے کر دیتے تھے۔ تاکہ سودی کاروبار میں لگائی جا سکے۔ اس طرح بنیئے، وکیل اور منصف تینوں کا ایک غیر شعوری اتحاد وجود میں آیا۔ اس اتحاد نے زمیندار کی زندگی اجیرن کر دی، جب یہ صورت حال بگڑنے لگی، تو انگریز حاکموں کو محسوس ہوا کہ زرعی اراضی ایسے ہاتھوں میں تیزی سے منتقل ہو رہی ہے جو بنیادی طور پر اس

پیشے سے متعلق نہیں۔ اس سے لازماً پیداوار اور مالیہ دونوں متاثر ہوں گے۔ چنانچہ اس صورت حال کے خلاف انگریز افسروں نے آوازیں اٹھانی شروع کیں۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پنجاب میں انگریز افسر دو گروہوں میں بٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف افسروں کا وہ گروہ تھا جو انگریزی LAW OF CONTRACT کا سہارا لے کر صورت حال میں عدم مداخلت کی تبلیغ کرتا تھا لیکن دوسری طرف بندوبست اراضی سے متعلق انگریز افسروں کا دوسرا گروہ تھا۔ جو اس صورت حال پر شدید تشویش کا اظہار کر رہا تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق پورے بیس پچیس برس زبردست مہم چلتی رہی اور دونوں گروہ اپنے اپنے موقف کے بارے میں رپورٹیں مرتب کرتے رہے۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ تھا جب تھوربرن نے اپنی معرکۃ الآرا رپورٹ "پنجابی مسلمان اور ساہوکار" کے عنوان سے مرتب کی۔ جو بعد میں ۱۸۸۶ء میں انگلستان سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں وہ اس زمانے کی صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:

"پنجاب ایک زرعی صوبہ ہے۔ یہ مالک کسانوں کا خطہ ہے لیکن ان کی بہت بھاری اکثریت ہر سال ساہوکاروں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جا رہی ہے۔ اور اس طرح سے بتدریج اراضی اپنے قدرتی اور روایتی مالک یعنی کاشت کار کے ہاتھ سے نکل کر زیرک لیکن ... ترہندو ساہوکار اور تاجر کے پاس جا رہی ہے۔ اور اس عمل کی بنیادی وجہ ہمارا نظام حکومت اور قانون ہے اس کی کلیتہً ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے اور اگر بروقت اس صورت حال کا ازالہ نہ کیا، تو یہ ہماری حکومت کے استحکام کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ اس صورت حال کا خطرہ پنجاب کے مغربی حصّوں کو وسطی پنجاب اور مشرقی پنجاب کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ مغربی پنجاب کی دیہی آبادی تمام کی تمام مسلمان قبائل پر مشتمل ہے اور اس طرح یہ اقتصادی تضاد مذہبی تضاد میں بدل جائے گا۔ جیسا کہ مشرقی یورپ میں ہے۔ وہاں یہودیوں کے خلاف نفرت مذہبی بنیادوں پر اصل میں نہیں ہے۔ بلکہ اصل وجہ ان کی اقتصادی اور معاشی کامیابیاں ہیں یہی حال ہندو بنیئے کا ہوگا۔ وہ صرف اس لیے قابل نفرت نہیں ہیں کہ وہ مواحد زراعت پیشہ لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ اصل میں ان کے خلاف غم و غصہ اور

نفرت کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ دھاندلی کرنے والے تاجر ہیں اور ساتھ ہی وہ بُت پرست بھی ہیں"۔

متشددانہ فلسفے کا اقتصادی پس منظر

اس صورتِ حال نے یہاں فرقہ پرستی کا بیج بویا۔ اور متشددانہ تحریکوں کو جنم دیا جب انگریز حاکموں نے انتقال اراضی پر پابندیوں کے متعلق سوچنا شروع کیا تو ہندو بنیئے، ہندو وکیل، ہندو استاد، ہندو منصف غرضیکہ پورے ہندو درمیانے طبقے کو ایک متشددانہ فلسفہ کی ضرورت پڑی، جو ان کو منظم کرے اور ان کا خون گرمائے۔ تاکہ وہ مسلمان کاشت کار اور انتقال اراضی پر پابندی لگانے والے انگریز حاکموں کے خلاف جد و جہد کر سکیں۔ اس ضرورت کو آریہ سماج کے فلسفے نے پورا کیا۔ چنانچہ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔ پنجاب کا پڑھا لکھا ہندو اور بنیا عام طور پر آریہ سماج سے منسلک ہو گیا اور جو تحریک کہ گجرات کاٹھیاواڑ سے ابھری تھی۔ اس نے پنجاب کی سرزمین میں پناہ ہی نہیں لی۔ بلکہ یہاں وہ ایک تناور درخت بن گئی جس کی چھاؤں میں ہندو تعصب پھلا پھولا۔ جب اس تعصب نے قوم پرستی کا روپ بھی دھارا تو اس کی نیو میں یہی مسلم دشمنی کا زہر، جسے اقتصادی مفادات پر ضرب نے جنم دیا تھا۔ کام کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ لاجپت رائے ایک طرف اگر انگریز کا جانی دشمن ٹھہرتا ہے تو ساتھ ہی وہ مسلمان سے بھی اتنی شدید نفرت کرتا ہے اور پنجاب میں چونکہ ہندو سرمایہ دار عددی طور پر اقلیت میں تھا۔ اس لیے اکثریت پر قابو پا جانے رکھنے کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ متشددانہ فلسفہ کی ضرورت تھی۔ ادھر مسلمان اکثریت میں ہونے ہوئے ہندو کی بالادستی کے نیچے پس رہا تھا۔ اس لیے اسے بھی اتنی ہی متشددانہ تحریکوں کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ اصلاح کے میدان میں ہو۔ یا مذہب کے دائرہ میں انگریز دوستی کی بنیاد پر ہوں یا انگریز دشمنی کی بنیاد پر، ان سب کی پشت پر پنجاب کی مخصوص زرعی اور اقتصادی صورتِ حال کام کر رہی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ شمالی بھارت میں آج بھی فرقہ وارانہ تحریکوں اور جنون خیزیوں کی پشت پر اکثر و بیشتر جو فلسفہ کام کر رہا ہے وہ آریہ سماج ہی کا فلسفہ ہے۔ اور ادھر پاکستان میں پنجاب کا یہی وہ خطہ ہے جہاں آج بھی ہندو دشمنی

*زیادہ زوروں پر ہے

راشٹریہ سیوک سنگھ کی ابتداء

پنجاب اور شمالی ہند کے شہروں میں جس دور میں خاکسار تحریک بے روزگار مسلم نوجوانوں کا خون گرما رہی تھی اور ان کو چپ راست کے ذریعے اسلامی نظام کا مژدہ جانفزا سنا رہی تھی تو اسی زمانے میں ہندوؤں میں بھی انہی خطوط پر تحریک پروان چڑھ رہی تھی۔ یہ درست ہے کہ اس تحریک کی داغ بیل خاکسار تحریک کے اجراء سے چند سال پہلے پڑی اور یہ بھی درست ہے کہ اس کا اجراء شمالی ہند میں نہیں ہوا بلکہ مہاراشٹر کے خطے میں ہوا لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ تحریک اگر پروان چڑھی اور اس نے اگر کسی علاقے کو زیادہ متاثر کیا تو وہ پنجاب اور شمالی ہند کا ہی علاقہ تھا، یہ تحریک راشٹریہ سیوک سنگھ تھی۔

خاکسار تحریک اور راشٹریہ سیوک سنگھ میں جہاں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے وہاں راشٹریہ سیوک سنگھ کے کچھ خصوصی پہلو بھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں مسلمانوں اور پاکستان کے قیام سے پہلے ہی خاکسار تحریک نے دم توڑ دیا اور مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے سامنے اس کا چراغ ٹمٹمانے لگ گیا اور اس کی روشنی بالکل مدھم ہو گئی تھی تا آنکہ یہ تحریک قصہ پارینہ بن گئی وہاں راشٹریہ سیوک سنگھ زندہ رہی یہ درست ہے کہ آزادی سے پہلے کانگرس کے سامنے اس کا اثر و رسوخ زیادہ نہ پھیل سکا لیکن اس نے دم نہیں توڑا اور جیسے ملک تقسیم ہونے لگا اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا تو راشٹریہ سیوک سنگھ آناً فاناً شمالی ہندوستان کے ہندوؤں کی ایک بہت ہی فعال، جماعت بننا شروع ہو گئی اور آج بھی بھارت میں جن سنگھ اسی تحریک کا دوسرا نام ہے۔ اس لحاظ سے راشٹریہ سیوک سنگھ ماضی کی تحریک نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے ہمسائے ملک میں آج بھی جاری و ساری ہے اور تعصب و فرقہ واریت کا زہر گھول رہی ہے۔ میں نے یہاں اس تحریک کا ماضی اور حال سبھی تفصیل سے بیان کر دیا ہے اور اس کی موجودہ سرگرمیوں پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈال دی ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ راشٹریہ سیوک سنگھ ہی وہ تنظیم ہے جس کی کوکھ سے بھارتیہ جن سنگھ نے جنم لیا۔ اسی جماعت نے اس نئی تنظیم کو فلسفہ مہیا کیا۔ اسی نے فعال کارکن اور مبلغ مہیا کیے۔ اس لیے جن سنگھ کے قیام اور

اس کی تاریخ سمجھنے کے لیے خود راشٹریہ سیوک سنگھ کی تاریخ اور پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔ کیونکہ اصل میں یہی وہ منبع ہے جس سے فرقہ واریت کا زہر پھوٹا ہے۔ یہی وہ جماعت ہے جس کے ایک ہیرو اور نام لیوا نے گاندھی جی کے خون سے ہاتھ رنگے اور اسی جماعت کے رضا کار تھے، جنہوں نے پنجاب دہلی، اور یو۔پی میں تقسیم ملک کے موقع پر فسادات کو منظم کیا ان کو اپنے دامن سے ہوا دی، گاؤں کے بھولے بھالے ہندوؤں اور سکھوں کو اکسایا۔ انہیں مسلح کیا، اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ہلاکت، قتل وغارت کا باعث بنے اور دونوں مملکتوں کے لیے مہاجرین اور شرنارتھیوں کا نہ حل ہونے والا مسئلہ پیدا کیا۔

راشٹریہ سیوک سنگھ کا باقاعدہ قیام ۱۹۲۵ء میں عمل میں آیا۔ اس تنظیم کا بانی اور خالق ایک مرہٹہ ڈاکٹر ہیجویر تھا۔ یہ ہیجویر مدھیہ پردیش کے ایک اہم شہر ناگپور میں پیدا ہوا تھا۔ انیسوی صدی کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ جب ناگپور کے ایک عام مرہٹہ گھرانے میں تیسرا لڑکا کشیب ہیجویر پیدا ہوا۔ ۱۸۸۹ء کا سال تھا۔ اس خاندان کا اصل وطن حیدرآباد دکن کا ایک گاؤں کہنہ لرتی تھا۔ لیکن کئی پشتوں سے یہ خاندان ناگپور میں آباد چلا آرہا تھا۔ کشیب ہیجویر ابھی تیرہ برس کا تھا۔ کہ اس کے سر سے ماں اور باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا۔ اس کے ماں اور باپ ۱۹۰۲ میں طاعون کی وبا کا شکار ہو گئے اور تیرہ سالہ کشیب کی پرورش کا بوجھ اس کے چچا کے ناتواں کندھوں پر آن پڑا۔ یہ پورا خاندان بہت مذہبی اور متعصب خاندان تھا۔ چنانچہ اسی ماحول میں اس ننھے بچے نے شعور حاصل کیا۔

مرہٹہ قوم پرستی

کشیب کی پرورش کی ذمہ داری جب اس کے چچا پر پڑی تو یہ دور مرہٹہ قوم پرستی کا دور تھا۔ اور یہی وہ زمانہ تھا، جب لوکمانیہ تلک مرہٹوں کو منظم کرنے میں مصروف تھا۔ اور یہ تلک ہی تھا۔ جس نے مرہٹہ قوم پرستی کے لیے شیواجی کو مظہر بنایا۔ تلک نے جب شیواجی کو مرہٹہ قوم پرستی کا مظہر بنایا تو اس میں ایک طرف اگر مرہٹہ قوم پرستی کے جذبات بیدار اور متحرک ہوئے تو دوسری طرف مسلم دشمنی کے جذبات بھی بیدار ہوتے۔ اس طرح سے مرہٹہ قوم پرستی کی بنیاد ایک طرف اگر انگریز

دشمنی پر پڑی تو ساتھ ہی مسلم دشمنی بھی اس قوم پرستی کی اہم اساس قرار پائی۔ پاک و ہند کے برصغیر کی تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ اس کی تاریخ مذہبی مناقشات اور جھگڑوں سے شدید طور پر گڈمڈ ہوگئی ہے۔ اور برطانوی شہنشاہیت نے بھی تاریخ کو اسی انداز میں پیش کیا۔ جس کی وجہ سے یہ بات ذہنوں میں سرایت کرگئی کہ ہر لڑائی اور ہر بغاوت کی پشت پر مذہبی نفرت اور جنون کا ہی زور رہا ہے۔ چنانچہ شیواجی کی اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کو بھی ایک ہندو کی مسلمان بادشاہ کے خلاف بغاوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ان بغاوتوں کی پشت پر اور وجوہات بھی ہوسکتی ہیں۔ جب اورنگ زیب نے اپنے باپ کو قید کیا تھا اور اپنے بھائیوں کو شکستیں دی تھیں۔ تو اس کی پشت پر کون سا مذہبی فریضہ یا اس کا تحفظ کارفرما تھا؟ فقط سلطنت پر قبضہ مقصود تھا۔ اسی طرح سے شیواجی نے جب بغاوت کی تو اس کی پشت پر مذہبی تحفظ سے زیادہ اپنے علاقے کی آزادی اور حصول اقتدار مقصود تھا۔ اور اس میں قدرتی کامیابی اس لیے ہوئی کہ اورنگ زیب کی مسلسل مہموں نے زرعی بحران کو جنم دیا تھا۔ اور کسان مفلوک الحال ہو رہے تھے۔ چنانچہ زرعی معیشت میں جب بھی بحران آتا ہے تو وہ اپنے ساتھ ڈاکہ اور لوٹ مار کو جنم دیتا ہے آج سے تین صدی پہلے لوگوں کو اپنی غربت اور افلاس کے خلاف آواز اٹھانے کا یہی ایک طریقہ آتا تھا۔ کہ وہ ہتھیار اٹھا کر لوٹ مار شروع کر دیں۔ چنانچہ شیواجی نے بھی اس زرعی بحران کے زمانے میں ہتھیار اٹھا لیے اور مہاراشٹر کے کسانوں کے دکھوں کا مظہر بن گیا۔ اورنگ زیب کے خلاف بغاوت ایک جاگیرداری نظام کے محافظ کے خلاف جنگ تھی۔ اس میں ہندو اور مسلمان کی تمیز نہ تھی۔ اگر تخت پر کوئی ہندو ہوتا اور یہی حالات ہوتے تو اسی طرح کوئی شیواجی پیدا ہوتا۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ اس کو بعد میں ہندو مسلم مسئلے کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ اور اس طرح سے شیواجی مسلمانوں کا دشمن ٹھہرا۔ اور اورنگ زیب ہندوؤں کا قاتل قرار پایا۔ حالانکہ نہ وہ مسلم دشمن اور نہ یہ ہندو دشمن! دونوں اپنی اپنی ضرورتوں کے تحفظ کے لیے سر بکف میدان میں نکلے ہوئے تھے۔۔ اورنگ زیب کی فوج میں ہندو سپہ سالار موجود تھے۔ جنہوں نے شیواجی کی سرکوبی کی' اور خود شیواجی کی باغی فوج میں کمان ایک مسلمان کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے شیواجی اور اورنگ زیب کو ایک دوسرے کے خلاف مذہب کی بنا پر صف آرا قرار دینا تاریخی طور پر غلط ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ یہ غلط نظریے نہ صرف راسخ ہوگئے بلکہ ان کی بنیاد

پر کئی عوامی تحریکوں کو منظم کیا گیا ہے۔ انہی میں مرہٹہ قوم پرستی کی تحریک بھی تھی۔ تلک نے شیواجی کا نام لے کر اس تحریک کو ابھارا۔ چنانچہ اس تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ جس نے راشٹریہ سیوک سنگھ کے خالق کیشب ہیجوار کو بچپن سے ہی متاثر کرنا شروع کیا۔

تقسیم بنگال کا اثر

تلک کے خلاف برطانوی حکومت کے غیظ و غضب اور قید و بند کی سزاؤں نے کیشب کے اندر برطانوی ملوکیت کے خلاف شدید غم و غصہ اور نفرت کو جنم دیا۔ اور اس نفرت اور غم و غصہ کو تقسیم بنگال کے خلاف ایجی ٹیشن اور تحریک نے اور بھی ہوا دی لیکن ساتھ ہی اس تحریک نے مسلم دشمنی کے جذبات کو بھی پختہ کر دیا کیونکہ لارڈ کرزن نے بنگال کے وسیع و عریض صوبے کو ۱۹۰۵ء میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس تقسیم میں مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہو جاتی تھی اور لامحالہ اس نئے صوبے میں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہی ہوتا۔ اب بنگال کا یہ وہ حصہ تھا۔ کہ جہاں کی نوّے فی صدی زمینداری ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی جن میں سے اکثر کلکتہ میں رہتے تھے۔ اور ان کے مزارعین مسلمان تھے۔ چنانچہ بنگال کا ہندو زمیندار اس تقسیم کو کیسے قبول کر سکتا تھا۔ اور جب کہ بنگال کی نوکر شاہی میں بھی اسی ہندو زمیندار کے عزیز و اقارب اور صاحبزادگان یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کر کے پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ اس صورتِ حال نے تقسیم بنگال کے خلاف زبردست تحریک کو جنم دیا۔ اب یہ تحریک ایک طرف اگر برطانوی حکومت کے فیصلے کے خلاف تھی، تو دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف بھی تھی، کیونکہ متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں اور بنگال کے مسلمانوں کی قیادت عمومی طور پر اس تقسیم کے حق میں تھی کیونکہ بنگالی مسلمان سمجھتا تھا۔ کہ اس نئے صوبے سے وہ اپنی پسماندگی کو دُور کر سکیں گے اور اب جہاں بنگالی ہندو اسے آگے نہیں بڑھنے دیتا وہاں وہ رکاوٹ تو کسی حد تک دُور ہو جائے گی۔ اس لیئے مسلمان عمومی طور پر اس نئے مشرقی بنگال کی تخلیق پر مسرور و شادمان تھے، یہ بات دوسری تھی کہ اس نے ہندو اور مسلمان کی تفریق کو اور بھی وسیع کر دیا۔ چنانچہ اس تفریق اور اس کی وسعت نے نوجوان کیشب میں برطانیہ دشمنی کے ساتھ مسلم دشمنی کے جذبات کو بہت حد

تک پروان چڑھایا۔

پہلی جنگ عظیم کا ہندوستان میں کیا ردّعمل ہوا !

تقسیم بنگال کا زمانہ تھا جب کشیب ہجویر پہلی بار سیاسی تحریک میں شریک ہوا۔ اس نے طلبا کو منظم کر کے تقسیم بنگال کے خلاف تحریک میں حصّہ لیا۔ جس پر اس کو سکول سے نکال دیا گیا۔ اس نے برار کے ایک دوسرے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ لیکن یہ سکول جلد ہی بند ہو گیا۔ اور اس کے بعد کشیب پونہ چلا گیا۔ اور یہیں سے اس نے ڈگری حاصل کی۔ اور اس کے بعد روٹی روزگار کے چکر میں اس نے کئی ایک ملازمتیں کیں جن میں سکول میں استاد کی حیثیت سے ملازمت بھی شامل تھی، یہاں اس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے کچھ روپیہ جمع کر لیا۔ بالآخر اس نے ۱۹۱۵ء میں جبکہ پہلی جنگ عظیم کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ کلکتہ نیشنل میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح سے اس نے پونہ اور کلکتہ دونوں شہروں کی سیاسی زندگی سے اثر لیا اور اس کی سیاست سے دلچسپی روز بروز گہری ہوتی گئی۔ اس نے اپنے کلکتہ کے قیام کے دَوران میں مختلف تحریکوں اور تنظیموں میں دلچسپی لی، اور تو اور اس زمانے میں اس نے دہشت پسندوں کے ساتھ بھی رابطہ قائم کیا لیکن ان تمام سرگرمیوں کے باوجود اس زمانے میں کشیب ہجویر کو سیاسی میدان میں کوئی اتنی اہمیت حاصل نہ ہو سکی اور نہ ہی پولیس نے اس کو کوئی اہمیت دی چنانچہ اس دَور میں وہ کبھی بھی نہ تو "خطرناک" سمجھا گیا۔ اور نہ ہی اسے قید و بند کی صعوبت برداشت کرنا پڑی۔

ہندو مہاسبھا میں شرکت

کشیب ہجویر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ناگپور لوٹ آیا۔ اور یہاں آ کر اس نے اپنا مطب شروع کر دیا۔ لیکن مطب کے ساتھ ساتھ اس کی عملی سیاست میں دلچسپی بدستور قائم رہی یہی دلچسپی اس کو ہندو مہاسبھا کے قریب لے گئی اور اس جماعت میں اس نے باقاعدہ طور پر شرکت کر لی۔ ہندو مہاسبھا اس وقت کوئی عوامی جماعت نہ تھی، بلکہ ہندوؤں کے اوپری طبقے کی نمائندگی کرتی تھی۔ جس کا مقصد ملازمتوں اور کاروبار، اور حکومت کے دوسرے شعبوں میں ہندو مفادات

کی حفاظت تھا۔ یہ جماعت ایک طرح سے غیر سیاسی تھی، اور ہندوؤں کو کانگرس سے الگ رکھنے کی کوشش میں رہتی تھی، چنانچہ ایسی جماعت میں کشیب ہجویر جیسے گرم مزاج نوجوان کتنے دن مطمئن سیاسی زندگی گذار سکتے تھے؟

چنانچہ ہوا یہ کہ جیسے ہی کانگرس اور تحریک خلافت نے اجتماعی طور پر عدم تعاون کی ابتدا کی، تو کشیب اپنی گرمیٔ طبع کی تسکین و تشفی کے لیے اس عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو گیا اور اس نے کچھ عرصہ قید کی مصیبت بھی جھیلی،

کانگرس میں شرکت اور علیحدگی

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہی نہیں بلکہ ابھی جرمنوں نے باقاعدہ ہتھیار بھی نہیں ڈالے تھے کہ یورپ مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں بے چینی، احتجاج اور بغاوت کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن ان آثار اور جذبات کو سوویت روس کے انقلاب نے زبردست ہوا دی۔ اور تمام ممالک کے عوام کو بالعموم اور محنت کش طبقے کو بالخصوص یہ یقین دلایا کہ انقلاب اور تبدیلی ممکن ہے۔ برسرِ اقتدار طبقہ کو شکست دینا ان کے بس میں ہے۔ غلامی کی زنجیروں کو کاٹنا ان کے اپنے احاطۂ قدرت میں ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم جنگ کے دوران میں مختلف ممالک میں جو چھوٹی چھوٹی بغاوتیں دیکھتے ہیں وہ جنگ کے بعد اہم تحریکوں اور مسلح انقلابات کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ ہنگری، جرمنی، ترکی اور مصر میں جو زبردست بغاوتیں ہوئیں وہ ان نئے بدلے ہوئے حالات کی آئینہ دار تھیں۔ یہ درست ہے کہ اکثر ممالک میں تبدیلی اور انقلاب کی یہ تحریکیں ناکام ہو گئیں۔ لیکن ان تحریکوں نے اپنے اثرات ضرور چھوڑے۔ ان ممالک کی تاریخ میں ان تمام ناکام بغاوتوں کی چھاپ اب بھی موجود ہے۔ اور ان کے بعد کی تحریکوں نے ان ناکامیوں سے سبق سیکھا ہے۔ متحدہ ہندوستان بھی دنیا میں ان تبدیلیوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ جو رونما ہو رہی تھیں، اور خود پہلی عالمگیر جنگ نے اس کے اقتصادی اور معاشی حالات میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں، یہ تبدیلیاں حکومت اور انتظامیہ میں تبدیلیوں کی متقاضی تھیں، لیکن شہنشاہیت نے جب ان نئے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے سے انکار کر دیا تو یہ تضاد، کانگرس اور خلافت کی صورت

میں پھٹ پڑا کیونکہ جب پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو اس وقت متحدہ ہندوستان بنیادی طور پر زرعی ملک تھا۔ اور صرف بندرگاہوں کے قرب و جوار کے علاقے تھے۔ جہاں کچھ صنعتیں موجود تھیں، ان میں بمبئی، احمد آباد اور کلکتہ نمایاں تھے، اور بنیادی طور پر متحدہ ہندوستان، برطانوی صنعت کاروں کی ایک عظیم منڈی تھا۔

پہلی عالمگیر جنگ اور متحدہ ہندوستان

پہلی عالمگیر جنگ نے ہندوستان میں طبقاتی توازن میں زبردست تبدیلی پیدا کی، جنگ سے پہلے تک متحدہ ہندوستان کے اندر کا زمیندار اور دیہی معیشت سے متعلق مختلف طبقات عام طور پر حکومت برطانیہ کے وفادار سمجھے جاتے تھے اور یہی وہ زمینداروں کا طبقہ تھا جس پر برطانوی شہنشاہیت زیادہ تر انحصار کرتی تھی، لیکن جنگ کے دوران جب فوجی بھرتی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس مقصد کے لیے برطانوی شہنشاہیت کے نمائندوں نے جو اودھم مچایا اور ہندوستان کے دیہات میں جو مظالم ڈھاتے اس نے زبردست بے چینی پیدا کر دی اور خود اس زمیندار طبقے میں بھی حکومت سے نفرت پیدا کر دی، چنانچہ یہ واقعہ ہوا کہ شمالی ہندوستان اور بالخصوص پنجاب کے علاقوں میں فوجی بھرتی کے نام پر شدید مظالم ڈھائے گئے اور دیہات نوجوانوں سے خالی ہو گئے۔ چنانچہ یہ جبری بھرتی ہی کا سلسلہ تھا کہ کئی ایک نوجوان پنجاب کے دیہات سے فرار ہوئے، اور انہوں نے مختلف ملکوں میں پناہ لی اسی بے چینی نے جنگ کے دوران میں پنجاب میں بغاوت کی بنیاد رکھی۔

دوسری طرف جنگ نے ہندوستان کی صنعت میں معتدبہ اضافہ کیا۔ کیونکہ برطانوی صنعت کار روزمرہ کی اشیاء کی تیاری میں مصروف نہیں رہ سکے۔ ان کی توجہ پوری طرح جنگی ضروریات کا سامان تیار کرنے اور بالخصوص اسلحہ کی تیاری کی طرف تھی۔ چنانچہ روزمرہ کے استعمال کی اشیاء اور عام جنگی استعمال کی اشیاء کی پیداوار کے لیے ہندوستان میں ہی کارخانے کھولنے کی طرف توجہ دی گئی اور جو صنعتیں موجود تھیں ان میں بھی زبردست توسیع ہونے لگی، یہی وجہ ہے کہ جنگ کے دوران میں ہندوستانی صنعت کو زبردست ترقی کے مواقع ملے اور خود سرکاری صنعتوں میں بھی توسیع ہوئی جن میں سب سے زیادہ توسیع ریلوے کی ورکشاپوں میں ہوئی۔ کیونکہ جنگ کے دوران میں نظام

رسل و رسائل کی توسیع ضروری ہوگئی تھی، ان سب ضرورتوں نے دو طبقوں کو جنم ہی نہیں دیا بلکہ ان کو جاندار بنایا۔

ایک طبقہ صنعت کاروں کا تھا۔ سب سے زیادہ توسیع سوتی کپڑے کے کارخانوں میں ہوئی تھی، چنانچہ جب جنگ ختم ہوئی تو ہندوستان کی معیشت میں یہ طبقہ زبردست اہمیت اختیار کر گیا۔ اب جنگ کے خاتمے پر اس طبقے کو یہ توقع تھی، کہ ہندوستان کو قدرے وسیع اختیارات مل جائیں گے۔ اور وہ ان اختیارات کو بروئے کار لاکر اپنی صنعتوں کی حفاظت کر سکے گا۔ ورنہ اسے یہ ڈر تھا کہ جنگ کے خاتمے پر لنکا شائر کے کارخانہ دار دوبارہ سوتی کپڑے کی پیداوار کی طرف متوجہ ہوکر اپنی مصنوعات کو ہندوستان بھیجنا شروع کر دیں گے۔ تو ہندوستانی صنعت کاروں کا بیڑا ہو جائیگا۔ اس لیے اس طبقے کی طرف سے جنگ کے اختتام سے پہلے ہی اختیارات کے حصول کے لیے آواز بلند ہونا شروع ہوگئی تھی۔

دوسرا طبقہ جس کو اس جنگ نے جنم دیا۔ محنت کشوں کا طبقہ تھا۔ صنعتوں میں پھیلاؤ اور توسیع کے ساتھ ساتھ یہ نیا طبقہ بھی عددی اور طاقت کے لحاظ سے ترقی کر رہا تھا۔ جنگ کے دوران جب صنعتوں میں توسیع ہو رہی تھی، تو محنت کش طبقہ کو روٹی، روزگار مل رہا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد جب صنعتی بحران شروع ہوا اور کارخانے بند ہونے لگے تو محنت کش طبقہ میں ہیجان پیدا ہوگیا چنانچہ یہ دو طبقے تھے، جنہوں نے بغاوت کا پرچم اٹھایا۔ لیکن تحریکوں اور بغاوتوں کے نعروں کے پیچھے جو اقتصادی اور معاشی تقاضے کام کرتے ہیں۔ وہ اتنے تہہ در تہہ ہوتے ہیں کہ ان سے خود بغاوت کی تحریکوں میں شریک ہونے والے عناصر بھی بعض دفعہ شعوری طور پر باخبر نہیں ہوتے۔ ان کو دوسری ضرورتیں اور تقاضے مقابلتاً زیادہ اہم معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ خود تحریکوں کے قائدین جو اوپر کے طبقوں سے آتے ہیں وہ دوسرے نعروں کو دلفریب بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام جن میں اپنی معاشی ضرورتوں نے غیض و غضب پیدا کیا ہوتا ہے وہ دوسرے نعروں سے متاثر ہونے لگتے ہیں۔ والانکہ غیض و غضب کی وجہ وہی معاشی تقاضے ہوتے ہیں۔ لیکن دکھائی ایسے دیتا ہے جیسے دوسرے نعرے عوام کو مسحور کر رہے ہیں۔ اور دراصل سرمایہ دار قائدین کے پاس چونکہ تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بے پناہ وسائل ہوتے ہیں۔ وہ عوام کو ان کے صحیح معاشی

اور روزمرہ مسائل سے زیادہ آسمانی اور آفاقی مسائل میں الجھا دینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ الجھانے کی یہ کوششیں کئی بار بظاہر بالکل دیانتدارانہ ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے نتائج ہمیشہ ملکوں اور قوموں کے لیے مہلک نکلتے ہیں۔ اب متحدہ ہندوستان میں بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال ہوئی کہ عوام کے مختلف طبقوں میں پہلی عالمگیر جنگ نے جو ردعمل پیدا کیا تھا۔ اس کو خلافت اور کانگریس نے ملکی مسائل سے زیادہ مذہبی اور آفاقی بنانے کی کوشش کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے باوجود عوام کا غم وغصہ برطانوی ملوکیت کے خلاف ہی رہا۔ اور اس طرح سے جنگ کے خاتمے نے متحدہ ہندوستان میں ایک عظیم الشان سامراج دشمن تحریک کو جنم دیا۔ اس عظیم تحریک میں سبھی طبقے اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو لے کر شریک ہوئے۔ لیکن جب متحدہ ہندوستان کے رہنماؤں نے بیچ راہ میں ہتھیار ڈال دیئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں طرف مایوسی اور ناامیدی کی فضا پیدا ہوگئی اور جس پُرامید خوشگوار مستقبل کے خواب نے عوام کے مختلف طبقوں اور مذاہب میں اتحاد کی فضا پیدا کی تھی اور ہندو مسلم ایک اٹوٹ دیوار بن گئی تھی، اسی متحدہ دیوار میں شگاف پڑنے لگے۔ اور چاروں طرف ہندو مسلمان دست و گریبان ہونے لگے اور فسادات کا ایسا ریلا چل نکلا کہ وہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

انہی فسادات اور مار کٹائی نے ہندو تعصب اور جنون کو ہوا دی، اور آریہ سماج کا فلسفہ عام ہونے لگا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آریہ سماج کے زبردست مفکر اور مبلغ لالہ لاجپت رائے نے بنگال کے رہنما سی آر داس کو خط لکھتے ہوئے ہندوستان کے مسلمانوں کی وفاداریوں کے متعلق شک وشبہ کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ اسی فضا نے ایک طرف ہندو اور کسی حد تک مسلمانوں کے تعصب اور جنون کو ہوا دی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ چونکہ ہندو اکثریت میں تھے۔ وہ تعلیم میں بھی بہت آگے تھے، مال و دولت بھی ان کے گھر کی باندی تھی۔ اس لیے اب ان میں ایک گونہ رعونت اور غرور آگیا تھا ان کے معاشی تقاضے بھی یہی تھے کہ ہندوستان کے سیاہ وسفید کے کلیتۃً وہی مالک ہوں۔ چنانچہ انہی جذبات کی نمائندگی کشیب ہیجوئیر کر رہا تھا۔ اور جب ۱۹۲۵ء میں اس نے راشٹریہ سیوک سنگھ کے قیام کا فیصلہ کیا۔ تو یہ ہندو تعصب اور جنون کی تشفی کی طرف ہی ایک قدم تھا۔

راشٹریہ سیوک سنگھ نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ برطانوی ملوکیت کی مخالفت کے ساتھ ساتھ

فرقہ واریت کی فضا تھی، ہندو مسلمانوں کی جان کے دشمن ہو رہے تھے، اور مسلمان ہندوؤں کی جان کے لاگو نظر آتے تھے، اور یہ تھی وہ فضا جس نے بڑے بڑے مسلّمہ قوم پرست رہنماؤں کو برطانوی ملوکیت سے زیادہ ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا۔ خلافت و کانگریس کی تحریک کی ناکامی نے دراصل ان قوم پرست لیڈروں اور عوام دونوں میں ایک قسم کی یاس و ناامیدی پیدا کر دی تھی، اور عوام و رہنما دونوں کے ذہنوں میں ایک ہی سوال ابھر رہا تھا، کہ آخر اتنی زبردست قربانیوں کا کیا نتیجہ نکلا۔ قید و بند کی صعوبتوں کا کیا صلہ ملا۔ گولیوں اور بندوقوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کا کچھ تو انعام ہونا چاہیئے۔ پھانسی پر چڑھنے اور سُولی پر لٹکنے کا کچھ ردِعمل ہو۔ لیکن ہوا کیا ہے کہ تحریک ناکام ہو گئی ہے انگریزی حکومت اتنی ہی مضبوط اور مستحکم ہے۔ جتنی پہلے تھی اس صورتحال نے جو غصّہ اور جھنجلاہٹ پیدا کی تھی اس نے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ اور انگریزی حکومت نے التزاماً ایسی صورتِ حال پیدا کر دی کہ تحریک کی ناکامی کی ذمّہ داری ایک دوسرے پر ڈالی جانے لگی۔ ہندوؤں میں یہ موقف عام ہونے لگا۔ کہ برطانوی شہنشاہیت سے گلو خلاصی کے لیے مسلمانوں سے نپٹنا بھی ضروری ہے اور اس لیے ہندوؤں کو فوجی تربیت حاصل کرنی چاہیئے۔ منظم ہونا چاہیئے اور اپنے مذہب پر کاربند ہونا چاہیئے۔

ہندوؤں میں فرقہ واریت اور تعصب کی فضا کی نشو و نما میں کانگریس و خلافت کی تحریک کی ناکامی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جو ہندو مسلم فسادات ہوئے انہوں نے بھی اہم رول ادا کیا۔ کیونکہ ہندوؤں میں مجموعی طور پر یہ تاثر سرایت کر گیا کہ کوہاٹ ہو یا ملتان، کانپور ہو یا ناگپور کا علاقہ ہر جگہ پر ہندوؤں کو مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی ہے اور ان تمام فسادات میں مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا ہے۔

ہندوؤں میں مظلومیت کے احساس نے شدید ردِعمل پیدا کیا، راشٹریہ سیوک سنگھ اسی ردِعمل کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ اس تنظیم کے بانی اور اس کے ہمنواؤں کا بنیادی اعتقاد یہی تھا۔ کہ بھارت ورشا کی آزادی کے لیے ہندوؤں کی ایک فعال تنظیم ضروری و لابدی ہے۔ اور ہندوؤں کی نجات اور آزادی ہندو مسلم اتحاد میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہندو الگ رہ، اپنے آپ کو منظم کریں"۔ چنانچہ "ہندو مملکت" کا تصور عام ہونے لگا۔ اس مملکت کے تصور میں تنگ

بھرے جانے لگے اور سمجھا جانے لگا کہ یہ ایک ایسی مملکت ہوگی جس میں ہندوؤں کا اقتدار مسلّم ہوگا۔ یہی راشٹریہ سیوک سنگھ کا بنیادی اعتقاد ٹھہرا، یہ درست ہے کہ مسلمانوں میں بھی کچھ اسی قسم کا ردِّعمل موجود تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان میں فسطائی رجحانات بہت بعد میں اُبھرے۔

اس نئی جماعت کے بنیادی اعتقادات میں ہندوؤں کی پرانی خاندانی وحدت پر اصرار کیا گیا اور یہ بھی اصرار کیا جانے لگا کہ مشترکہ خاندان قائم ودائم رہنا چاہیئے۔ یہ خاندانی وحدت اور اشتراک پر اصرار کیوں تھا؟

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جس علاقے میں یہ تنظیم ابھر رہی تھی، اس میں ہندوؤں کا خاندانی اتحاد اور وحدت کا شیرازہ بکھر رہا تھا کیونکہ یہاں کے ہندوؤں میں صنعتی سرمایہ داری کی جڑیں گہری ہوتی جارہی تھیں، اور جہاں بھی صنعتی سرمایہ داری گہری ہوگی، وہاں خاندان کی وحدت قائم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ اس نظام میں ہر فرد کی محنت الگ سی قیمت رکھتی ہے۔ اور جب ہر فرد کی الگ سی قیمت ڈالی جائے گی، وہاں خاندان کی وحدت کا شیشہ بھی چکنا چور ہونا لازمی ہوگا۔ چنانچہ اسی لیے مہاراشٹر کا درمیانہ طبقہ جو اس صنعتی سرمایہ داری کی لپیٹ میں ابھی نہیں آیا تھا، وہ صنعتی سرمایہ داری نظام کی یلغار کے خلاف آواز بلند کر رہا تھا۔ اس طبقہ کو ابھی تک جاگیرداری نظام کا پروردہ تصور خاندانی وحدت بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح سے یہ جماعت صرف ہندوستانی سیاست کی سطح پر ہی رجعت پسند نہ تھی، بلکہ خود ثقافتی اور سماجی اقدار کی سطح پر بھی اس کا کردار ہندو معاشرے کو ترقی کی طرف لے جانے کی بجائے پیچھے کی طرف لے جانے والا تھا۔

مہاراشٹر میں عدم مقبولیّت

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اس جماعت کا بانی، مہاراشٹر کا رہنے والا برہمن تھا۔ یہ جماعت بھی اسی خطّے اور اس کے گرد و نواح میں قائم ہوئی تھی یہ پورا خطّہ سیاسی طور پر خاصا بیدار بھی تھا یہاں کے ہندو سیاسی تحریک اور مال و دولت کا جہاں تک تعلق تھا دونوں میدانوں میں بہت آگے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس امر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ جماعت اس پورے خطّے میں کوئی زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ شروع میں تو خود اس جماعت کے بانی اور خالق ہجویز کیشب نے اس کی رکنیت کو

خاصا محدود رکھنے کی کوشش کی اور اس کی دلی خواہش یہی ہوتی تھی کہ اس جماعت میں زیادہ تعداد مہاراشٹر کے برہمنوں ہی کی رہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس جماعت پر آخری دم تک مہاراشٹر کے برہمنوں کی چھاپ قائم رہی ہے، اور اسی چھاپ نے اسے مہاراشٹر اور اس کے گرد و نواح میں عوامی حیثیت حاصل نہیں کرنے دی۔ کیونکہ مہاراشٹر میں برہمن کوئی زیادہ مقبول جماعت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا تعلق لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے سے بہت گہرا تھا۔ انگریزی راج میں تو خود برہمن بھی زمیندار بن گیا تھا۔ اور جو زمیندار نہ بن پایا تھا۔ اس کا زمینداروں سے ناطہ اتنا گہرا تھا کہ مہاراشٹر کا کسان ان سے نفرت کرنے لگ گیا تھا۔ اس جماعت کی اس خطے میں عدم مقبولیت کی ایک وجہ اس کی قیادت کی برہمنیت تھی۔

اس خطے میں ایسی جماعت کی عدم مقبولیت اور عوامی نہ بننے کی اور بھی اہم وجوہ موجود تھیں۔ ان میں سب سے اہم وجہ تو یہ تھی کہ اس خطے میں ہندو فلسفے اور ہندو تعصب و جارحیت کے لیے نظریاتی فضا تو ہو سکتی تھی، لیکن عملی طور پر اس فلسفے کی کوئی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی کیونکہ جارحانہ فلسفہ کے مقبول ہونے میں سب سے اہم اور بنیادی شرط یہ ہوتی ہے کہ جارحیت کی تبلیغ کسی اہم دشمن کے خلاف ہو۔ اور ایسا دشمن ہو جو سامنے موجود ہو۔ اور جس کی دشمنی کے متعلق عامۃ الناس کو قدرے یقین ہو۔ چنانچہ اسی لیے جرمنی میں آریائی نسل کی برتری کا فلسفہ جب پیش ہوا تو وہاں یہودی موجود تھے۔ اور یہودیوں کی لوٹ کھسوٹ اور برتری سے عام جرمن نالاں بھی تھے۔ چنانچہ اس میں یہ فلسفہ مقبول ہو گیا۔ لیکن مہاراشٹر میں تو مسلمان عددی طور پر بہت ہی کم تعداد میں تھے۔ اور جو تھے وہ عام مرہٹہ کسانوں کی طرح مظلوم و پسماندہ تھے۔ اس لیے مسلم دشمنی اس خطے میں کیسے سرایت کر سکتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راشٹریہ سیوک سنگھ اپنے بانی کے خطے میں مقبول نہ ہو سکی۔ بالکل اسی طرح آریہ سماج کی تحریک اس کے بانی کی جنم بھومی اور اس کے گرد و نواح میں اپنے لیے پیرو تلاش نہ کر سکی اور اس سے بھی دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مہاراشٹر کے دیہات میں شاذ ہی ہندو مسلم فساد دیکھنے میں آتے ہیں۔ بمبئی میں تو فسادات کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں۔ لیکن مہاراشٹر اس آگ سے محفوظ ہی رہا

راشٹریہ سیوک سنگھ کا قیام

ہیجوار نے اس جماعت کے قیام کا رسمی طور پر اعلان ۱۹۲۵ء میں وجے دشمی کے دن کیا یہ دن بھی ہندوؤں کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لیے جماعت کے قیام کے لیے اسے منتخب کیا گیا۔ یہی وہ دن ہے جس کے متعلق رامائن میں کہا گیا ہے کہ اس دن راون کو رام کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی اور سیتا کو آزادی ملی۔ یہ ایک طرح سے سچائی اور مظلومیت کی بالآخر جیت اور کامیابی و کامرانی کا دن تصور ہوتا ہے۔ اس جماعت کے بانیوں میں ہیجوار کے ساتھ تین اور افراد بھی شامل تھے۔ ان میں ایک ناگپور کا تاجر آپاجی جوشی تھا۔ یہ آپاجی جوشی کانگرس میں سرگرم رکن رہ چکا تھا۔ اور واردھا آشرم کی تحریک میں بھی خاصا سرگرم تھا۔ لیکن یہ بھی کانگرس سے مایوس ہو گیا تھا۔ تیسرا شریک کار بابا صاحب آپٹے تھا۔ یہ پہلے رام کرشنا مشن کا بہت سرگرم کارکن تھا۔ اس جماعت کا چوتھا بانی داوپرنارتھ تھا۔ یہ پہلے دہشت پسند بھی رہ چکا تھا۔ چنانچہ ان چاروں نے اس جماعت کے قیام میں حصہ لیا۔ اور ان کا اس جماعت پر کافی مدت تک بہت ہی گہرا اثر رہا۔ اور قیادت اسی گروہ کے ہاتھ میں رہی۔

اس جماعت کے شروع کے چھ سات برس کی سرگرمیوں کے متعلق کوئی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس جماعت کا کوئی زیادہ نہ تو اثر تھا۔ اور نہ ہی چرچا ہو۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء تک اس جماعت کی کل رکنیت کوئی پانچ سو سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ اور یہ پانچ سو میں بھی زیادہ تر اراکین ناگپور سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ اس جماعت کی بظاہر کانگرس دشمنی اتنی سطحی اور اوپری تھی کہ جب گاندھی جی اور کانگرس نے ۱۹۳۰ء میں تحریک شروع کی تو اس جماعت کے اراکین کی اکثریت بھی گاندھی جی اور کانگرس کی دوسری اور تیسری سول نافرمانی کی تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور ان میں سے اکثریت سول نافرمانی کی تحریکوں میں شامل ہو گئی اور تو اور خود کشیب ہیجوار بھی سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہو گیا۔ اور اس کی پاداش میں اسے جیل جانا پڑا لیکن جب سول نافرمانی کی یہ تحریکیں بھی ناکام ہو گئیں اور پھر ایک بار ہندو مسلم مسلہ ہندوستان کی سیاست کے اہم مسئلے کے طور پر ابھرا تو یہ جماعت بھی دوبارہ زندہ ہو گئی۔ اور اب کے اسے اچھا خاصا وسیع میدان ملا اور متعابلتہً زیادہ کامیابی ہوئی۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب پھر ایک

بار ہندوستان فسادات کے شعلوں میں جھلس رہا تھا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کی ترقی اور نشو و نما کی تاریخ پر جب ذرا گہرائی سے غور کیا جاتا ہے تو بعض اہم ادوار اور اہم پہلو اجاگر ہوتے ہیں ۔ اولاً یہ کہ ہندوستان میں پہلی شہنشاہیت مخالف تحریک ناکام ہوتی ہے۔ تو یہ ناکامی اور اس ناکامی سے پیدا ہونے والی مایوسی اور شکست خوردگی اپنی کوکھ میں ہندو جارحیت کو جنم دیتی ہے۔ دوسری سامراج دشمن تحریک ناکام ہوتی ہے تو ہندو جارحیت کو مزید نشو و نما ہوتی ہے اور یہی راشٹریہ سیوک سنگھ ۱۹۴۷ء تک تمام ہندوستان بالخصوص شمالی ہندوستان میں بے حد مقبول ہونے لگتی ہے آخر ایسا کیوں ہے ؟ لیکن یہ صرف تصویر کا ایک رُخ اور ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اور رُخ یہ ہے کہ ان دونوں تحریکوں کی ناکامی نے اگر ایک طرف ہندو مسلم جارحیت کو جنم دیا اور پروان چڑھایا تو دوسری طرف نئی غیر مذہبی اور لادینی انقلابی تحریکوں کو بھی تخلیق کیا اور اس مایوسی کی فضا میں ان انقلابی تحریکوں کو کہیں زیادہ جاندار بنا دیا لیکن ان دونوں پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم پہلو بھی ہے جس پر عام طور پر لکھنے اور قلم اٹھانے سے اجتناب کیا جاتا ہے وہ ہے مذہب اور سیاست کو اس طریقے سے گڈمڈ کرنا کہ مذہب ہی بالآخر سیاست کا مسلک ٹھہرے چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ہماری تمام تحریکوں پر مذہب کی بہت گہری چھاپ رہی ہے۔ اس چھاپ نے بھی مذہبی منافرت کو تیز کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

سیاست کو مذہب کے تابع کرنے اور عوام کو سیاسی و اقتصادی مطالبات کے لیے منظم کرنے کے لیے مذہبی نعروں کو استعمال کرنے کا رواج متحدہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن سیاست کو مذہبی رنگ دینے کا سہرا ایک طرف مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سر ہے ۔ تو دوسری طرف سب سے زیادہ منظم طریق سے مذہبی نعروں کو مقبول بنانے کی ذمہ داری گاندھی جی پر ہے ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب کانگرس اور خلافت کی تحریکیں ابھریں تو جہاں تک ان تحریکوں کے بنیادی کردار کا تعلق ہے وہ شہنشاہیت دشمن ہی تھا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان تحریکوں کا خول مذہبی تھا۔ اور اسی خول نے بعد میں مذہبی منافرت اور ہندو مسلم جارحیت کے لیے زمین ہموار کی۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کا بنیادی کردار اور چلن خالصتاً سیاسی تھا۔ اور ۱۹۴۷ء تک کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے پلیٹ فارموں سے اپنے مطالبات سیاسی زبان اور سیاسی اسلوب میں پیش کیے جاتے تھے چنانچہ

۱۹۱۷ء کے بعد سے فوجی بھرتی کے بائیکاٹ کی جو تحریک چلی تو اس نے برطانوی حکومت کی فوج میں بھرتی کا بھی جو مقاطعہ ہوا وہ سیاسی بنیاد پر نہیں بلکہ مذہبی بنیاد پر ہی کیا گیا اور پوری عدم تعاون کی تحریک کی تائید میں بھی مذہب کا سہارا لیا گیا۔ چنانچہ ہندوستان کے ۲۵ علماء نے فتویٰ صادر کیا کہ برطانوی حکومت کے تمام اداروں سے لاتعلقی اور انقطاع مذہبی فریضہ ہے۔ اسی طرح سے ہندو پنڈتوں اور گاندھی جی نے بھی مذہب ہی کی بنا پر تحریک کی تشریح شروع کی۔ چنانچہ شنکراچاریہ کا عدالت میں بیان ہو، یا مولانا محمد علی کا، گاندھی جی کا یا مولانا ابوالکلام کا۔ ان سب علماء نے اس سامراج دشمن تحریک کی توجیہہ اور وضاحت اپنے اپنے مذہب کی حدود اور طریق کار کے مطابق کی یہ مذہبی اسلوب اس وقت تک جب تحریک زور پکڑ رہی تھی اور غیض و غضب اور جوش فتح و کامرانی کا مژدہ دے رہا تھا تو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب تحریک کو ناکامی ہوئی اور عوام کی قربانیاں رائیگاں جانے لگیں تو دونوں طرف سے ایک دوسرے کا مذہب اور ایک دوسرے کا وجود برا لگنے لگا۔ کیونکہ جب آپ مذہبی بنیادوں پر عوام کو متاثر کریں گے۔ تو عوامی سطح پر یہ عقیدہ زیادہ شدت اختیار کرنے لگتا ہے کہ میرا اور فقط میرا مذہب سب سے بہتر سب سے ارفع اور سب سے اعلیٰ ہے۔ تو یہ اعتقاد اپنے اندر ایک اور معنی بھی رکھتا ہے کہ میرا مذہب جب سب سے سچا ارفع و اعلیٰ ہے تو ظاہر ہے دوسرے مذاہب کم سچے اور ہیچ نظر آنے لگتے ہیں اور یہیں سے فسطائی رجحانات کو سازگار فضا ملنے لگتی ہے اور ہندوؤں میں یہ فسطائیت اس لیے زیادہ جلدی اور منظم صورت اختیار کر گئی کیونکہ ان میں وہ طبقہ اور وہ جماعت موجود تھی جس کو اس قسم کے فلسفے اور اپنی برتری کا لوہا منوانے کی اشد ضرورت تھی۔

ہندو سرمایہ دار طبقہ

پہلی جنگ عظیم میں جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ ہندوؤں میں صنعتی سرمایہ داری نے جنم لیا اور ایک مضبوط سرمایہ دار طبقہ پیدا ہو گیا۔ جس کا مقصد اور خواہشیں لامحدود ہونے لگیں۔ وہ اپنی نشوونما کی راہ میں تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے فلسفہ چاہتا تھا۔ جس طرح گاندھی جی نے بدیسی کپڑے کے مقاطع سے ان کی اقتصادی امنگوں کی تشفی کی۔ اور لنکاشائر کے کپڑے کی صنعت پر شدید چوٹ

لگائی۔ اسی طرح سے کیشب ہجویئر نے بھی ایک ضرورت کی تشفی کی اور وہ ضرورت اس وقت گو شدت سے محسوس نہیں کی جا رہی تھی، لیکن بہر حال یہ ایک طبقے کو شعور بخشنے کے لیے کافی تھی۔ یہ ضرورت تھی کہ پورا ملک ہندو سرمایہ دار طبقے کے قبضۂ قدرت میں ہو اور وہ راس کماری سے لے کر خیبر تک کے پورے علاقے کو اپنے مال کی منڈی بنا سکیں اور یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ سیاسی اقتدار ان کے قبضے میں ہو۔ یہ درست ہے کہ ۱۹۲۵ء میں ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ جو مخصوص تاریخی حالات کی بنا پر خاص خطوں اور صرف ہندو مذہب کے نام لیواؤں سے ابھرا اس کو مسلمان دشمنی کا جذبہ فوری طور پر متاثر نہیں کر رہا تھا کیونکہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ سیاسی اقتدار تھا۔ اور اس کے لیے اسے برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنا مقصود تھا۔ اور اس دباؤ کے لیے کانگرس اور گاندھی جی جو کردار ادا کر رہے تھے وہ اس طبقے کی تمام شعوری اور غیر شعوری ضروریات کو پورا کر رہا تھا۔ اس لیے اس طبقہ کو اس دور میں کیشب ہجویئر کی کوئی چنداں ضرورت نہ تھی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء تک کیشب ہجویئر اور اس کی تنظیم نے کوئی زیادہ پر پُرزے نہیں نکالے۔

فاشزم کیا ہے؟

جو جماعت ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۴ء تک زیادہ پر پُرزے نہ نکال سکی، وہ بیسویں صدی، کی تیسری دہائی میں یکدم اچھی خاصی مقبولیت حاصل کر لیتی ہے آخر دس سال کے بعد کیا حالات تھے۔ جس نے یکدم اس تحریک کو تقویت بخش دی۔ اور مقبول بنا دیا اس میں قریب قریب وہی حالات کام کر رہے تھے۔ جس نے یورپ میں فاشزم کو ابھرنے میں مدد دی، اور نو آبادیاتی ممالک میں رجعت پسند جماعتوں کے لیے فضا سازگار بنائی۔

۱۹۳۰ء میں پورا سرمایہ داری نظام ایک شدید بحران میں مبتلا ہو گیا تھا۔ در اصل یہ اقتصادی بحران سرمایہ داری نظام کی ایک خصوصیت ہے۔ کیونکہ آزاد تجارت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ منافع اور لوٹ کھسوٹ کی آزادی ہو۔ چنانچہ سرمایہ دار طبقہ کا منافع اور اس کے ساتھ اس کی پیداوار جوں جوں بڑھتی ہے تو وہ اپنے ساتھ افلاس اور قوت خرید میں کمی بھی لاتی ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار کا منافع اصل میں مزدور طبقہ کی لوٹ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ مزدور طبقہ میں قوت خرید کم ہونے لگتی ہے

اور اس قوت خریدکی کمی سرمایہ دار طبقہ کی پیدا کردہ مصنوعات کی کھپت میں رکاوٹ بننے لگتی ہے اور اس طرح سے پیداوار اور کھپت میں زبردست تفاوت رونما ہونے لگتا ہے۔ یہ تفاوت اپنے جلو میں کئی ہلاکتیں اور کئی تضادات لاتا ہے۔ اوّلاً جب پیداوار کھپت سے کہیں زیادہ ہوجاتی ہے تو پھر کارخانہ دار پیداوار کم کرنے پر مجبور ہوتا ہے وہ کارخانہ بند کرتا ہے۔ یا شفٹوں میں کمی کرتا ہے۔ یا اجرتوں میں کمی کا نعرہ دیتا ہے۔ ان تمام اقدامات سے مزدور طبقہ جو پہلے ہی مفلوک الحال ہوتا ہے۔ وہ مزید پریشان ہونے لگتا ہے۔ سڑکوں پر بیکاروں کے ہجوم نظر آنے لگتے ہیں۔ ہڑتالیں شروع ہوتی ہیں۔ مظاہرے روزمرہ کا معمول بن جاتے ہیں۔ پولیس لاٹھیاں لے کر نکل آتی ہے۔ فوج مشین گنیں سنبھال لیتی ہے۔ اور اس طرح سے ایک ایسی فضا جنم لیتی ہے۔ جس میں انقلابی تبدیلیوں کے جراثیم موجود ہوتے ہیں، ایسے موقعوں پر سرمایہ دار طبقہ اپنی نام نہاد جمہوریت کا بہروپ اتار پھینکتا ہے اور وہ وحشیانہ بربریت اور آمریت کی فضا قائم کرکے مزدور طبقہ اور اس کی سیاسی جماعت کو کچل دیتا ہے اور یہی فاشزم کہلاتا ہے۔ فاشزم کی دوسری ضرورت یہ ہوتی ہے کہ نوآبادیاں حاصل ہوں تاکہ جو اشیاء اپنے ملک میں فروخت نہیں کرسکتا۔ وہ دوسرے ممالک میں فروخت کرسکے اور وہاں سے خام مال سستے داموں حاصل کرسکے۔

۱۹۳۰ء میں سرمایہ دار دنیا نے تاریخ کا سب سے بڑا اور مہلک اقتصادی بحران دیکھا تھا۔ اس بحران نے تمام سرمایہ دار دنیا اور اس کی نوآبادیات کو شدید طور پر متاثر کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگلستان جیسے ترقی یافتہ صنعتی اور سامراجی ملک کے لاکھوں باشندے بھی بیکاری اور بیروزگاری کا شکار ہو رہے تھے۔ امریکہ ہو یا انگلستان، فرانس ہو یا جرمن کوئی سرمایہ دار ملک ایسا نہیں تھا جہاں بحران کی پرچھائیاں نہ پڑی ہوں۔ ان پرچھائیوں نے عوام کو متاثر کیا اور تمام ممالک میں ہڑتالیں اور مظاہرے ہونے لگے۔ اس بحران نے سرمایہ دار طبقہ کو بے حد پریشان کردیا۔ پریشانی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف سرمایہ دار دنیا اقتصادی بحران کا شکار ہو رہی تھی۔ اس دنیا میں بے روزگاروں کے جلوس نکل رہے تھے۔ صنعتی پیداوار گودام میں پڑی سڑ رہی تھی۔ اور کوئی خریدار نہیں ملتا تھا۔ مگر اس کے بالکل الٹ سوویت روس جو پہلا اشتراکی ملک تھا۔ اس میں پہلا پنجسالہ منصوبہ وقت سے پہلے مکمل ہوگیا تھا۔ اور اس میں صنعتی پیداوار میں معتدبہ اضافہ ہوا تھا۔ بے روزگاری قریب قریب

ختم ہو رہی تھی۔ اس نقشے نے سرمایہ دار دنیا کے مزدوروں اور محنت کشوں کو سیاسی سوجھ بوجھ عطا کی، اور وہ محسوس کرنے لگے۔ کہ بنیادی طور پر سرمایہ داری نظام میں کچھ خرابیاں ہیں۔ اور ان خرابیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس نظام کو تبدیل کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ اشتراکی نظام لایا جائے۔ سرمایہ داری نظام کے خاتمے اور اشتراکی نظام کے قیام کے لیے ایک معاشرتی انقلاب لازمی ہے۔ اور یہ انقلاب لانے کا فریضہ کمیونسٹ پارٹیاں ہی ادا کر سکتی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ہر ملک میں کمیونسٹ پارٹیوں کے پیرو کاروں میں اچھا خاصا اضافہ ہوا۔ مزدور طبقہ کی تنظیم میں زیادہ وسعت آئی۔ کسان سبھائیں منظم ہونے لگیں۔ اور اس طرح سے اس اقتصادی بحران نے پوری سرمایہ دار دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔

ہندوستان میں بھی اس بحران کے اثرات کوئی کم واضح نہ تھے۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں بھی بائیں بازو کے رجحانات بہت مقبول اور موثر ہونے شروع ہوئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کانگرس کے اندر بھی انقلابی خیالات پروان چڑھنے لگے۔ یہی وہ دن ہیں جب پنڈت جواہر لال نہرو سوویت روس کا دورہ کرتے ہیں۔ اور وہاں سے متاثر ہو کر آتے ہیں۔ اور ہندوستان میں بھی نوجوانوں کی ایک الگ جماعت کی داغ بیل ڈالتے ہیں پھر سب سے بڑھ کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جو کمیونسٹ خیالات کے حامل گروپ سرگرم عمل تھے۔ انہوں نے ایک متحدہ کمیونسٹ پارٹی کی داغ بیل ڈالی اور اس کمیونسٹ پارٹی کی راہنمائی میں ہندوستان کے صنعتی علاقوں میں محنت کشوں کی تحریکوں اور ہڑتالوں کی راہنمائی کی جانے لگی۔ لیکن یہ سب حالات سامراجی حکمرانوں کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس پریشانی اور غم و غصہ کا اظہار ہندوستان کے حاکموں کی طرف سے کیا جانے لگا۔ اقتصادی بحران نے ہندوستان کے صنعتی مزدوروں کو بھی شدید طور پر پریشان کرنا شروع کر دیا چنانچہ ۱۹۲۸ء کے اوائل میں احمد آباد، بمبئی، کلکتہ، مدراس اور دوسرے صنعتی علاقوں میں ہزاروں مزدور بیکار ہو گئے اور بیکاری کے خلاف شدید احتجاجی مظاہرے ہونے لگے۔ جو کارخانے تھوڑے بہت کام کر رہے تھے۔ ان میں بھی بے کاری اور شفٹوں کی کمی کے خلاف احتجاجی ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔ ان ہڑتالوں کی راہنمائی بائیں بازو کے عناصر کر رہے تھے۔ اور مزدور تحریک کی تنظیم میں بھی کافی وسعت آگئی تھی۔ چنانچہ کل ہند ٹریڈ یونین کانگرس کے جنرل سیکرٹری خود پنڈت

نہرو منتخب ہوگئے۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ جب لارڈ ارون نے مرکزی اسمبلی میں کمیونسٹ اثرات کی شدید مخالفت اور مذمت کرتے ہوئے کہا تھا:

"موجودہ صنعتی تنازعات کے ایک بہت ہی اہم پہلو پر روشنی ڈالنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ مزدوروں کی جائز تکالیف اور شکایات کا ازالہ ہونا چاہیئے۔ لیکن پچھلے ایک سال سے مزدور طبقہ جس بے اطمینانی کا اظہار اور مظاہرہ کر رہا ہے۔ وہ حقیقتاً جائز شکایات سے زیادہ سماج دشمن عناصر کی سرگرمیوں کا نتیجہ دکھائی دیتا ہے۔ اور کمیونسٹ اثرات جس تیزی سے پھیل رہے ہیں، وہ میرے اور میری حکومت کے لیے خاصی تشویش کا موجب بن رہے ہیں، موجودہ ہڑتالوں کی پشت پر غیر ملکی کمیونسٹ وایجنٹ سرگرم ہیں، اور ان کا واضح طور پر پروگرام یہی ہے کہ وہ اس ملک کا پورا معاشی ڈھانچہ تہس نہس کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ ان کے اس پروگرام سے تمام طبقات کو تشویش ہونی چاہیئے اور کوئی حکومت بھی اس قسم کی سرگرمیوں اور عزائم سے چشم پوشی نہیں کر سکتی۔"

لارڈ ارون کی یہ تقریر دراصل بائیں بازو اور کمیونسٹ تحریک پر حملہ کا اعلان تھا۔ وائسرائے نے یہ تقریر ۲۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو کی تھی، یعنی کانگرس کی مکمل آزادی کی قرارداد سے صرف تین دن بعد اور مارچ ۱۹۲۹ء میں ہندوستان کے بائیں بازو اور مزدور طبقہ کے ۳۲ سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری ہندوستان کے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۱۔ الف کے تحت ہوئی تھی۔ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۱۔ الف میں کہا گیا تھا:

"جو شخص بھی برطانوی ہند کے اندر یا باہر شہنشاہ ہند کو ان کے اختیارات خسروانہ سے محروم کرنے کی کوشش کرے گا یا ہندوستان کے کسی بھی حصہ میں مجرمانہ تشدد سے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا مرتکب ہوتا ہے۔ تو وہ ہندوستان کے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۱۔ الف کے تحت مستوجب سزا ہوگا۔ یہ سزا حبس دوام اور کم سے کم دس سال قید تک ہو سکتی ہے۔"

برطانوی کمیونسٹ اور تحریک آزادیٔ ہند

ان ۳۲ رہنماؤں میں تین رہنما انگریز تھے۔ جو برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے اہم رکن تھے اور

ہندوستانی مزدور تحریک کی امداد کے لیے ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ یہ نام آج بھی ہماری تحریک میں ایک گونہ اہمیت رکھتے ہیں، اس لیے کہ یہی وہ افراد تھے جنہوں نے بعد میں ہندوستان میں ایک سیکولر روشن خیال تحریک کو پروان چڑھایا اور آج بھی اگر ہندوستان میں رجعت پسند، فرقہ وارانہ اور متعصب ہندو جارحیت کو شکست دے سکتے ہیں، تو یہی وہ عناصر ہیں، جنہوں نے چالیس برس پہلے اس بائیں بازو کی تحریک کا علم بلند کیا تھا۔ ان رہنماؤں میں فلپ سپریٹ تھا۔ یہ برطانوی کمیونسٹ پارٹی کا سرگرم رکن تھا لیکن ہندوستان کی آزادی کی تحریک سے اسے گہری وابستگی تھی۔ اسی لیے یہ ہندوستان چلا آیا۔ اور یہاں اس نے مزدور طبقہ کو منظم کرنے کے لیے انتھک کام کیا۔ اور جس وقت یہ گرفتار ہوا۔ اس وقت یہ کل ہند ٹریڈ یونین کانگرس کی مجلس عاملہ کا رکن تھا۔ فلپ سپریٹ نے مارکسی نقطہ نظر سے گاندھی جی کی تعلیمات کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ اور حقیقتاً گاندھی جی کے فلسفہ کے رجعت پسندانہ پہلوؤں پر سے نقاب کشائی کا سہرا اسی برطانوی کمیونسٹ کے سر ہے۔ اس کتاب کا نام ہی گاندھی ازم کا ایک تجزیہ تھا۔ یہ انگریزی زبان میں تھی اور تقریباً تیس سال پہلے جب گاندھی ازم کا طوطی بول رہا تھا۔ شائع ہوئی تھی۔

دوسرا انگریز جو اس سازش میں ماخوذ کیا گیا۔ وہ بی ایف بریڈلے تھا۔ یہ بھی برطانوی کمیونسٹ پارٹی کا اہم رکن اور انجینئرنگ کے مزدوروں کی وسیع اور متحدہ انجمن کا اہم رکن تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں اس نے جی آئی پی ریلوے مزدوروں کی تنظیم کی، اور اس کی مجلس عاملہ کا رکن منتخب ہو گیا۔ یہ بمبئی کے مزدوروں کی عظیم جماعت گرنی کامگار یونین کی مجلس عاملہ کا بھی رکن تھا۔ پھر ہندوستان میں چلنے والی ریلوے کے مزدوروں کی جو کل ہند جماعت قائم ہوئی جس کا نام آل انڈیا ریلوے مین فیڈریشن تھا۔ اور جو آج بھی موجود ہے اس کا نائب صدر اور بمبئی میں سوتی کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں کی ہڑتال کمیٹی کا جائنٹ سیکرٹری تھا۔

تیسرا انگریز ہچنن تھا یہ صحافی اور دانشور تھا۔ اس نے ہندوستان کے بارے میں بعض معرکتہ الآرا پمفلٹ اور کتابیں لکھی ہیں، یہ بھی کمیونسٹ تھا۔ اس نے بعد میں میرٹھ مقدمہ سازش کے متعلق بھی ایک تفصیلی کتاب لکھی تھی۔

جہاں تک اس مقدمہ میں ماخوذ ہندوستانیوں کا تعلق ہے۔ ان میں ایس اے ڈانگے تھے،

یہی وہ ڈانگے ہیں، جو آجکل ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے صدر ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں یہ ٹریڈ یونین کانگرس کے اسسٹنٹ سیکرٹری تھے اور یہ اس سے پہلے کانپور سازش کیس میں بھی ماخوذ ہوئے تھے۔ اور ان کو سزا بھی ہوئی تھی، یہ مرہٹہ برہمن ہیں، ان کے علاوہ مہاراشٹر میں گرفتار ہونے والوں میں، ایس، وی، گھاٹے تھے، یہ بھی ٹریڈ یونین کانگرس کے اسسٹنٹ سیکرٹری رہ چکے تھے۔ اور اس وقت بمبئی میونسپل کمیٹی کے ملازمین کی یونین کے نائب صدر تھے۔ تیسرے مرہٹہ جوگلنے کر تھے۔ یہ جی آئی ریلوے ورکرز یونین کے سیکرٹری اور گرنی کامگار یونین کے نائب صدر تھے۔

بنگال

بنگال کے مزدوروں کے رہنماؤں میں کشوری لال گھوش تھے۔ یہ بنگال ٹریڈ یونین فیڈریشن کے سیکرٹری تھے۔ دوسرے مظفر احمد تھے۔ جو بنگال کی مزدور کسان پارٹی کے سیکرٹری اور کل ہند ٹریڈ یونین کانگرس کے نائب صدر تھے، وہ اس سے پہلے کانپور سازش کیس میں بھی ماخوذ ہو کر سزا پا چکے تھے، مظفر احمد کا شمار ہندوستان کی کمیونسٹ تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ اب بھی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں ہیں، لیکن اب وہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے قیام کے متعلق اپنی یادداشت بھی مرتب کی ہے۔ بنگال جیوٹ ورکرز ایسوسی ایشن کے اسسٹنٹ سیکرٹری دھارانی گوسوامی، اسی جیوٹ ورکرز ایسوسی ایشن کے سیکرٹری رادھا رام مترا اور شب ناتھ بنرجی، جو ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ یہ بھی اس مقدمۂ سازش میں ماخوذ تھے۔ ان کے علاوہ بنگال کی ٹرانسپورٹ ورکرز یونین کے سیکرٹری شمس الہدیٰ اور مشرقی بنگال ریلوے یونین کے سیکرٹری گوپندر اچکراورتی بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ بنگال مزدور کسان پارٹی کے سرگرم کارکن، اجودھیا پرشاد بھی تھے۔

پنجاب

اس طرح سے پنجاب میں میاں عبدالمجید، کیدار ناتھ سہگل، اور سوہن سنگھ جوش گرفتار کیے گئے۔ میاں عبدالمجید ہجرت کی تحریک میں شامل تھے۔ اس زمانے میں وہ افغانستان سے سوویت روس چلے گئے اور وہاں سے واپسی پر پنجاب میں کرتی کسان پارٹی کے بانیوں میں تھے اور پنجاب یوتھ لیگ کے

بانیوں میں بھی تھے۔ سوہن سنگھ جوش بھی مارکسی خیالات کے حامل تھے، اور پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی جو اس وقت کرتی کسان پارٹی کے نام سے موسوم تھی، کی بنیاد رکھنے والوں میں تھے۔

بمبئی

بمبئی کی مزدور تحریک سے تعلق رکھنے والے بھی کئی ایک رہنما اس مقدمۂ سازش میں گرفتار کیے گئے: ان میں ایس، ایس میراجکر تھے۔ جو بمبئی کی سب سے انقلابی مزدور یونین گرنی کامگار کے اسسٹنٹ سیکرٹری تھے اسی طرح سے اس یونین کے صدر رائے، اسے علوی بھی اس مقدمہ میں دھر لیے گئے۔ ڈاکٹر ادھیکاری، جو بمبئی کے ہفت روزہ "شعلہ" کے مدیر تھے، کو بھی اسی سازش کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔ بمبئی سے مزید گرفتار ہونے والوں میں گوپال باسک، جو اشتراکی نوجوانوں کی انجمن کے صدر تھے، بی آر کاسلے اور آر ایس نمبکر، جیسے مزدور رہنما بھی شامل تھے۔

یو۔پی

صوبجات متحدہ، جو آج کل اتر پردیش کہلاتا ہے سے پی سی جوشی گرفتار کیے گئے۔ پی سی جوشی اپنے صوبے کی مزدور کسان پارٹی کے سیکرٹری تھے۔ بعد میں یہی پی سی جوشی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور یہ تقریباً بارہ برس تک اس عہدے پر فائز رہے ان کے علاوہ مزدور کسان پارٹی کے صدر روشوا ناتھ مکرجی کو بھی پکڑ لیا گیا۔ اسی جماعت کے ایک اور رکن گدرٹی شنکر بھی دھر لیے گئے۔ ویسے بنگال اور مہاراشٹر کے بعد سب سے زیادہ گرفتاریاں یو۔پی میں ہی ہوئی تھیں۔ ان میں شوکت عثمانی بھی تھے، جو اس سے پہلے ۱۹۲۴ء کے مقدمہ سازش میں بھی شامل تھے۔ اور سزا یافتہ تھے۔ شوکت عثمانی ہجرت کی تحریک میں شامل تھے۔ اور اسی تحریک کے دوران وہ سوویت روس گئے تھے۔ جہاں سے وہ کمیونسٹ خیالات لے کر واپس آئے، اور بالآخر مزدوروں، کسانوں کی تحریک کو مقبول بنانے کے لیے اردو میں ایک ہفتہ وار پرچہ نکالنا شروع کیا۔ غرضیکہ یہ ۳۲۔ افراد تھے، جن کو پورے ہندوستان سے گرفتار کر کے میرٹھ کی جیل میں بند کیا گیا۔ اور جیل کے اندر ہی ان پر جارج پنجم کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں شرکت کے الزام

میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمہ نے ہندوستان میں بائیں بازو کے خیالات اور عناصر کو مقبول اور مؤثر بنانے میں بہت مدد کی۔ یہ مقدمہ چار برس تک چلتا رہا۔ اور اس مقدمہ سے حکومت کا یہ مقصد تھا کہ ہندوستان کے اندر اپنے متشددانہ اقدام کا جواز پیدا کیا جائے اور عالمی رائے عامہ کو کمیونزم کے خطرے سے متاثر کیا جائے۔ یہ مقدمہ چار برس تک چلتا رہا۔ اور اس پر اس زمانہ میں چودہ لاکھ کی خطیر رقم صرف ہوئی۔

بیکاری اور بیروزگاری کے خلاف احتجاجی تحریکوں کا ایک یہ جواب تھا۔ دوسرا جواب نوجوان بھارت سبھا کے کارکنوں اور رہنماؤں کی گرفتاریاں اور ان کو پھانسی پر لٹکانا تھا تیسرے کانگرس کی تحریک کو کچلنا تھا۔ ان تمام کارروائیوں نے ملک میں ایک بار پھر مایوسی پیدا کر دی۔ چنانچہ اس مایوسی اور ناامیدی کی فضا میں پھر ایک بار فسادات کی رو بہہ نکلی۔ اور اب کے پھر فسادات کا اثر شمالی ہندوستان میں ہی پڑا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۰ء کے بعد شمالی ہند میں بے روزگار ہندو نوجوان راشٹریہ سیوک سنگھ کی طرف راغب ہونے لگا۔ اور مسلمان نوجوان جو بے چارہ غربت کا مارا ہوتا تھا۔ وہ خاکسار بننے لگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۳۸ء میں راشٹریہ سیوک سنگھ کی پورے برصغیر میں تقریباً چار صد شاخیں قائم ہو چکی تھیں، زیادہ تر شاخیں شمالی ہند میں قائم ہوئی تھیں لطف یہ ہے کہ یہی وہ دور ہے جب شمالی ہندوستان میں خاکساروں کی تنظیم کو مسلمانوں کے عام نچلے شہری طبقوں میں مقبولیت حاصل ہو رہی تھی اور بالکل اسی طرح راشٹریہ سیوک سنگھ کا زیادہ تر زور بڑے شہروں میں تھا البتہ راشٹریہ سیوک سنگھ نے ہندو طلبا کو خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کیا۔ لیکن ۱۹۴۰ء جون میں راشٹریہ سیوک سنگھ کا قائد ڈاکٹر ہیجوئیر چل بسا۔ لیکن اس نے اپنی موت (جو ۲۱ جون کو واقع ہوئی) سے چند روز پہلے راشٹریہ سیوک سنگھ کے جنرل سیکرٹری گوالکر کو جماعت کا قائد نامزد کر دیا۔ گوالکر کی قیادت کا باقاعدہ جشن ۲ جولائی ۱۹۴۰ء کو منایا گیا۔

گوالکر کا پورا نام مہادیو سادا شیو گوالکر ہے۔ وہ فروری ۱۹۰۶ء میں ناگپور کے قریبی گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہ بھی راشٹریہ سیوک سنگھ کے دوسرے قائدین کی مانند برہمن گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور مرہٹہ تھا۔ اس کا باپ سکول ماسٹر تھا۔ جو اپنے لڑکے کو سائنس کی تعلیم دلانے کا متمنی تھا۔ لیکن گوالکر بچپن سے ہی کچھ روحانیت کی طرف مائل تھا۔ روحانیت کے اس شوق اور

والد کے اس اصرار نے کہ وہ سائنس دان بنے، اس کے اندر یک گونہ کش مکش پیدا کر دی۔ وہ ابھی سن بلوغت کو ہی پہنچا تھا کہ وہ ویدوں کو ازبر کرنے کے چکر میں پڑ گیا اور وہ ان کی تعلیمات سے متاثر بھی ہوا۔ وہ زندگی اس کے لیے وقف کرنا چاہتا تھا۔ لیکن باپ کو ناراض کرنے کی بھی ہمت اس میں موجود نہ تھی، چنانچہ ۱۹۲۴ء میں اس نے بنارس یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہ نباتات اور حیوانیات پڑھنے پر مجبور رہا۔ بالآخر اس نے ۱۹۲۸ء میں زولوجی میں ایم اے پاس کر لیا۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ یونیورسٹی میں اوّل آیا۔ چنانچہ یونیورسٹی میں ہی اس نے پڑھانا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۳ء تک وہ بحیثیت لیکچرار کام کرتا رہا۔

یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران میں ہی گوالکر کو راشٹریہ سیوک سنگھ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے قائد کیشیب ہیجویر سے اس کی پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں بنارس میں ہی ہوئی چنانچہ گوالکر نے ۱۹۳۱ء میں راشٹریہ سیوک سنگھ میں باقاعدہ طور پر شرکت کی۔ ۱۹۳۳ء تک اس نے جماعت کے لیے دن رات کام کیا۔ ۱۹۳۳ء میں ہیجویر نے نوجوان گوالکر کو جماعت کے ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے پر رضامند کر لیا اور اس نے یونیورسٹی سے استعفا دے دیا۔ اور ناگپور میں جماعت کے ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے کے لیے چلا گیا۔ لیکن روحانیت سے اس کی دلچسپی نے اسے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ وہ ۱۹۳۷ء میں راشٹریہ سیوک سنگھ سے الگ ہو گیا۔ اور بنگال کے سوامی اکھانڈا نند کا چیلا بن گیا۔ اس نے اپنے گورو، سوامی کی ہدایت پر داڑھی رکھ لی اور سر کے بال بڑھا لیے اور آخر دم تک اس نے اپنا یہ حلیہ برقرار رکھا لیکن سوامی اکھانڈا نند کی فوری موت نے اسے پھر بے چین کر دیا اور وہ پھر واپس ناگپور میں ہیجویر کے پاس آ گیا۔ اور راشٹریہ سیوک سنگھ میں دوبارہ شرکت کر لی۔ اس کے بعد ہیجویر اور گوالکر کی قربت بہت بڑھ گئی۔ ہیجویر کی تمام سرگرمیوں میں گوالکر نمایاں نظر آنے لگا۔ جہاں ہیجویر خود نہ جا سکتا وہاں گوالکر ہی اس کی نمائندگی کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ چنانچہ اس کو ۱۹۳۸ء میں جماعت کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ اور موت سے پہلے ہیجویر نے باقاعدہ اعلان کیا :

"میرے بعد تم سب لوگ گورو گوالکر کی پیروی کرنا"۔ اور گوالکر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "اب جماعت کی رہنمائی اور کام کی نگرانی کی ذمہ داری واحد تم پر ہی ہے"۔

دُوسری جنگ عظیم

دوسری جنگ عظیم میں جب کانگرس نے برطانوی حکومت کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی اور کانگرس کے قائدین اور کارکن جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے اور دوسری طرف مسلم لیگ عوام میں مقبول ہونے لگی تو اس زمانے میں گوالکر کی قیادت میں راشٹریہ سیوک سنگھ نے مسلم دشمنی کے نعرے کو استعمال کیا اور اپنی مقبولیت میں زبردست اضافہ کیا۔ چنانچہ اس کا اثر بالخصوص ان خطوں میں بہت تیزی سے بڑھنے لگا۔ جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اور پاکستان جہاں قائم ہونے کا احتمال تھا۔ چنانچہ جب جنگ کے خاتمے پر بہار اور بنگال میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو اس زمانے میں راشٹریہ سیوک سنگھ ہندوؤں کے محافظ کے طور پر میدان میں آئی اور جیسے جیسے حالات بدلنے لگے۔ مختلف ہندو اور سکھ رجواڑوں نے بھی اس جماعت کی پشت پناہی کی اور باقاعدہ اسلحہ مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ چنانچہ تقسیم ملک کے موقع پر راشٹریہ سیوک سنگھ کے رول کے بارے میں امریکی مصنف جے اے کرن لکھتا ہے:

"ان مہینوں میں عوام کے جوش و غروش نے راشٹریہ سیوک سنگھ کے لیے بڑی ہی سازگار فضا پیدا کر دی۔ ایک طرف اسلام اور پاکستان دشمنی کا نعرہ بلند کیا گیا۔ دوسری طرف کانگرسی حکومت پر "مسلمان دوستی" کا الزام لگا کر ہندو نوجوانوں کو متاثر کیا جانے لگا۔ اور اس طرح نئے نوجوان رضاکار اس جماعت میں بھرتی ہونے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس جماعت کو ہندو تاجروں، صنعت کاروں اور ہندو افسروں کی ہمدردیاں کھلے بندوں حاصل ہونے لگیں۔ اس افراتفری کے زمانے میں اس جماعت کے نظم و ضبط نے ہندو عوام پر گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ فسادات کے زمانے میں فوج نے کئی ایک علاقوں میں نظم و نسق کی دیکھ بھال کا کام ان کے سپرد کر دیا۔"

اس زمانے میں سردار پٹیل نے جو کانگرس کی پہلی حکومت میں نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کے عہدے پر فائز تھے راشٹریہ سیوک سنگھ کے قائد گوالکر کو ایک خط میں لکھا:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ راشٹریہ سیوک سنگھ نے ہندو سماج کی بے پناہ خدمت کی ہے۔ جن علاقوں میں لوگوں کو پناہ اور حفاظت کی ضرورت تھی، وہاں راشٹریہ سیوک

سنگھ کے نوجوانوں نے انتھک طریقے سے عورتوں اور بچوں کی حفاظت کی ہے ورنہ وہ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہوتے۔"

یہ تھی فضا جس میں راشٹریہ سیوک سنگھ بھارت میں ہندو راج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ مقبولیت کی اس فضا میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے قائدین نے اعلان کیا کہ بھارت میں کم از کم ۵۰ لاکھ ہندو بلاواسطہ یا بالواسطہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے پروگرام سے متفق ہیں۔ چنانچہ اسی نشے نے ان کو اقتدار پر جلد از جلد قابض ہونے کے لیے اکسایا اور اس وقت ان کو اقتدار کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ گاندھی جی کی شخصیت نظر آئی۔ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کی گولی گاندھی جی کے سینہ میں پیوست ہو گئی اس عمل نے راشٹریہ سیوک سنگھ کے اندازوں اور توقعات کے بالکل برعکس نتائج مرتب کیے۔ اس گولی نے ہندو جارحیت کو اور تیز کرنے کی بجائے اور کانگرس کے خلاف نفرت مہمیز کرنے کی بجائے پانسہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے خلاف پلٹ دیا۔ اور عوام کا غیض و غضب اس پر ٹوٹ پڑا۔ چنانچہ کانگرس حکومت نے اس جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا۔

لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں جماعت اسلامی بھی پاکستان میں قریب قریب وہی کردار ادا کر رہی تھی جو بھارت میں راشٹریہ سیوک سنگھ انجام دے رہی تھی۔ یہ درست ہے کہ جماعت اسلامی اس قدر نہ تو فعال تھی اور نہ اس کے پاس رضاکاروں کا وہ منظم نظام تھا جو راشٹریہ سیوک سنگھ کے پاس تھا۔ لیکن اس فرق کے باوجود طریق کار دونوں جماعتوں کا قریب قریب ایک سا تھا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کا مقصد بھی کانگرس سے لوگوں کو بیزار کرنا اور اہم شخصیتوں کو راستے سے ہٹانا تھا۔ جماعت اسلامی نے بھی اس زمانے میں مسلم لیگ پر شدید حملے کیے جب پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا نعرہ دیا۔ یہ بھی درست ہے کہ جماعت اسلامی کی جڑیں نہ تو مسلمان عوام میں گہری تھیں۔ اور نہ ان کی جنون خیزی کوئی بہت شدید تھی۔ جس سے عوام خاص طور پر متاثر ہوتے۔ کیونکہ اس وقت تو قریب قریب تمام جماعتیں فسادات کے المناک واقعات سے متاثر تھیں، اور سبھی جماعتوں میں یہ جنون انگیزیاں قدرے مشترک تھیں، بہرحال یہ حالات کم از کم بھارت میں ایک متعصب فرقہ وارانہ، جنون انگیز فسطائی جماعت کے لیے بہت حد تک سازگار تھے۔ اور ساتھ ہی بھارت میں وہ طبقہ بھی موجود تھا۔ جو اس قسم کی فسطائی جماعت کی اولاً بنیاد بن سکتا تھا۔ دوسرے اپنے طبقاتی مفادات کے لیے اس جماعت کو استعمال کر سکتا

تھا کیونکہ ان حالات میں جہاں جنوں انگیزیاں سر نکال رہی تھیں ۔ فرقہ واریت کا زہر پھیل رہا تھا قتل و غارت پر لوگ مائل تھے ۔ تو ساتھ ہی اقتصادی بدحالی بھی نمایاں ہو رہی تھی ۔ اور شرنارتھی ہوں یا مہاجر سبھی اپنی آبادکاری کے لیے پرانے معاشی ڈھانچے میں تبدیلیوں کے متعلق بھی سوچنے پر مجبور ہو رہے تھے اور یہی وہ صورتحال تھی جو اوپری طبقوں کو پسند نہ تھی ' اس لیے ان کے مفادات کا بھی تقاضا یہ تھا کہ وہ لوگوں کی توجہ بنیادی مسائل سے ہٹائے رکھیں ۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ آبادکاری کے مسائل سالہاسال تک پاکستان میں الجھے رہے اور بھارت میں بھی شروع کے کئی سال ان الجھنوں میں ضائع ہو گئے اور انہی الجھنوں میں راشٹریہ سیوک سنگھ اپنا کام کرتی رہی ۔

> **گوالکر کا نعرہ ۔ ۱۰ / نومبر ۱۹۴۹ء**
>
> " ہمارے آباؤ اجداد نے اکمل ترین طریق زندگی اور فلسفے کی داغ بیل ڈالی تھی وہ اسی فلسفے اور معیار پر پوری دنیا کو پرکھتے تھے ' لیکن ہم نے اس فلسفے کو فراموش کر دیا ۔ اور اس معیار کو پس پشت ڈال دیا ہے ۔ اس کی بنیادی وجہ مغربی کلچر کی یورش اور فتح ہے ۔ ہم نے ذہنی غلامی قبول کر لی ہے ۔ گو ہم نے آج سوراج حاصل کر لیا ہے ۔ لیکن ہم نے سوتنترتا حاصل نہیں کی ہے "

جماعتوں کے منشور اور پروگرام قواعد و ضوابط ' یہ سب جماعتوں کے ظاہری روپ ہوتے ہیں لیکن ان کے اصل کردار کا ان کے عمل ' ان کی ہمدردیوں ' ان کی جدوجہد اور اس جدوجہد کے طور طریقوں سے پتہ چلتا ہے ۔ اور انہی خصوصیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جماعت کس طبقے کی نمائندگی کرتی ہے اور کس کی بھلائی مقصود ہے ۔ کس قسم کا معاشرتی نظام وجود میں لانا چاہتی ہے جہاں تک راشٹریہ سیوک سنگھ کے پروگرام کا تعلق ہے ۔ اس کا پروگرام جو اس برصغیر کی تقسیم کے بعد وضع کیا گیا اس کی شق نمبر ۳ ۔ میں کہا گیا ہے :

> " راشٹریہ سیوک سنگھ کا مقصد ہندو سماج کے مختلف گروہوں اور عناصر کو ہندو دھرم اور تہذیب و کلچر کی بنیاد پر یکجا کرنا ' منظم اور متحرک کرنا ہے ۔ تاکہ ہم بھارت ورشا کی ترقی اور احیاء کے عمل کو تیز کر سکیں ۔

شق نمبر ۴ ۔ میں درج ہے :

> " (الف) راشٹریہ سیوک سنگھ سماج کے پرامن ارتقا میں یقین رکھتی ہے ۔ اور وہ پرامن

اور جائز ذرائع کے ذریعے اپنے ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔

(ب) ہندو سماج کے تہذیبی طور طریقوں کی بنیاد پر سنگھ اس امر پر پختہ یقین رکھتی ہے کہ تمام مذاہب بنیادی طور پر قابل احترام ہیں اور ان مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ رواداری کا سلوک سنگھ کا جزو ایمان ہے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ بنیادی طور پر سیاست سے لاتعلق ہے۔ اس کا بنیادی کام تہذیبی احیاء ہے۔ لیکن راشٹریہ سیوک سنگھ کے انفرادی کارکن اس امر کے لیے آزاد ہیں۔ کہ وہ کسی بھی سیاسی جماعت میں شرکت کر لیں۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی وہ کسی ایسی جماعت میں شرکت کے مجاز نہیں جو خفیہ طریقوں اور تشدد پر اعتقاد رکھتی ہو۔ ایسے لوگ راشٹریہ سیوک سنگھ کے رکن نہیں بن سکتے۔"

بظاہر یہ پروگرام تمام اعلیٰ مقاصد لیے ہوئے ہے۔ اس پروگرام سے شرافت، رواداری اور محبت کے سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں، لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے کیونکہ سنگھ جس وقت تہذیبی احیاء کی بات کرتی ہے تو وہ تہذیب زندگی کے تمام شعبوں پر احاطہ کیے ہوتی ہے اور تہذیب کے ان پہلوؤں کو معنی پہنانے کا کام کس کے سپرد ہوگا۔ اس کی ذمہ داری راشٹریہ سیوک سنگھ کے قائدین کے کندھوں پر ہوگی۔ اور ان پر عملدرآمد اس کے کارکن کریں گے ـــــ جس طرح جماعت اسلامی محض سیاسی جماعت نہیں بلکہ وہ اسلام کی عملداری کی مبلغ ہے۔ لیکن اس اسلام کی تمام تر توجیہہ اور عملدرآمد کی ذمہ داری وہ اپنے لیے محفوظ رکھتی ہے اور اسی مقصد کے لیے وہ سیاسی میدان میں اترتی ہے۔

راشٹریہ سیوک سنگھ کے پروگرام کی توجیہہ اس کے نمائندوں نے کئی بار کی، سب سے پہلے تو اس کے قائد نے راشٹریہ سیوک سنگھ کو خلاف قانون قرار دیئے جانے پر احتجاج کرتے ہوئے پنڈت نہرو کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:

"راشٹریہ سیوک سنگھ کا مقصد پہلے بھی اور اب بھی ہندو سوسائٹی کی از سر نو تشکیل ہے لیکن تخریبی ذرائع سے نہیں، بلکہ تعمیری ذریعوں سے وہ یہ مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کے لیے وہ ہندوؤں میں بلا تمیز ذات، رجحانات، زبان اور صوبائی

حد بندیوں، بھائی چارے اور اخوت کے جذبات ابھارنا چاہتی ہے۔ اور ان میں قومی کردار کے نشو و نما کی خواہشمند ہے۔

پابندیوں کے تقریباً ڈیڑھ برس بعد گوالکر نے ۲۴/اگست ۱۹۴۰ء کو اپنی جماعت کے اغراض و مقاصد کے سلسلے میں ایک تفصیلی بیان دیا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا:

"راشٹریہ سیوک سنگھ کا قیام ہندو دھرم کی اعلیٰ ترین اقدار کے احیاء کے لیے عمل میں آیا تھا اور اسی کے لیے وہ مسلسل جدوجہد کرتی رہی ہے۔ ہندو دھرم کی ان اقدار سے مراد بھارتی تہذیب ہے، اور اسی تہذیب کی ٹھوس بنیاد پر ہم ان تمام لوگوں کو جو اس تہذیب میں یقین رکھتے ہیں، ایک مستحکم اور مضبوط رسی میں پرو سکتے ہیں۔ ہم ہندوؤں کے اندر انتشار پھیلانے والے تمام رجحانات کو ختم کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، اور ان پر واضح کر رہے ہیں کہ وہ ایک مشترکہ تہذیب کے وارث ہیں اور یہ جو ظاہرہ تفرقات ہیں، یہ بنیادی اتحاد خیال کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے اور اس اتحاد خیال کی اساس مادر وطن سے محبت ہے۔"

گوالکر جگہ جگہ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی بھی مذمت کرتا ہے اور ان رجحانات اور خیالات کو مادہ پرستی قرار دیتا ہے۔ جو بھارتی طریق زندگی کے بالکل منافی ہیں۔ جہاں تک مختلف عوامی مطالبات کا تعلق ہے ان کے متعلق بھی گوالکر کبھی کھل کر بات نہیں کرتا تھا۔ بلکہ ایک قسم کا ابہام موجود ہوتا تھا۔ اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ وہ ہندو عوام کے سطحی غیظ و غضب کو برقرار رکھ کر اپنی جماعت کی مقبولیت کی اساس بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے زبان کے بارے میں کھل کر کبھی کوئی موقف اختیار نہیں کیا۔ البتہ دبے الفاظ میں ہندی کو قومی زبان بنانے کی حمایت کی۔ لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تقسیم کی بھی دبے الفاظ مخالفت کی۔

جہاں تک عوام کے معاشی مطالبات کا تعلق ہے۔ اس میں گوالکر اور راشٹریہ سیوک سنگھ کھلم کھلا سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی حمایت کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ راشٹریہ سیوک سنگھ کسی قسم کے ازم کی قائل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تمام "ازم" غیر بھارتی ہیں۔

یہ تمام اعلانات راشٹریہ سیوک سنگھ کی تعلیمات کا اصل ہیں۔ ان تعلیمات کا منبع وہ کتاب ہے

جو اس کے بانی کشیب ہجوئیر نے قلمبند کی تھی اور جس کو گوالکر نے ۱۹۳۹ء میں ترتیب دیا تھا اس کا نام تھا۔ "ہم یا ہماری قومیت کی توجیہہ" اس کتابچہ کو بجا طور پر راشٹریہ سیوک سنگھ کی بائبل کا لقب دیا جا سکتا ہے۔ گویہ کتابچہ اس وقت لکھا گیا جب برصغیر ابھی آزاد نہیں ہوا تھا۔ اور برطانوی تسلط قائم و دائم تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے کیونکہ ان صفحات میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے قائد کا مافی الضمیر نمایاں ہوتا ہے۔ اور یہی وہ ضمیر ہے۔ جس کی بنیاد پر سیوک سنگھ کے رضاکاروں کو متحرک و منظم کیا جاتا رہا ہے۔

اس کتابچہ کا بنیادی موضوع ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے جس طرح انگلستان انگریزوں کے لیے ہے۔ اور فرانس فرانسیسیوں کے لیے اور جرمنی جرمنوں کے لیے۔ چنانچہ اس کتابچہ میں قوم کی تعریف یوں کی گئی ہے :

"قوم پانچ عناصر سے تشکیل پاتی ہے۔ اور یہ پانچ ایک وحدت اختیار کر لیتے ہیں تو قوم تشکیل پاتی ہے یہ پانچ عناصر کیا ہیں — ؟ — جغرافیائی وحدت (ملک) نسل، مذہب، تہذیب اور زبان۔"

آگے چل کر ان پانچوں عناصر کی وضاحت کی گئی ہے جغرافیائی وحدت کے لیے کہا گیا ہے۔

جغرافیائی وحدت

کسی نسل کے لیے ایک قوم کی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک خطے کا ہونا ضروری ہے۔ اور اس کی حد بندی قدرتی ہو تو بہتر ہے۔ ایسا خطہ قومی زندگی کے لیے پہلی شرط ہے۔

نسلی وحدت

نسلی اتحاد کی اہمیت قومی زندگی میں مسلمہ ہے۔ ایک نسل کا مطلب ایسا معاشرہ ہے جس کو ورثے میں مشترکہ رسم و رواج، مشترکہ زبان، مشترکہ ماضی کی عظمتیں اور تلخیاں ملی ہوں مختصراً یہ ایسی آبادی ہے۔ جس کے مآخذ مشترکہ ہوں۔ اور ان کو ایک

مشترکہ تہذیب متحد کرتی ہو۔ ایسی نسل قومی تشکیل کے لیے ایک لازمی جزو ہے
اگر ان میں بیرونی نسل کے لوگ بھی ہوں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے کو اس
بڑی نسل میں کلی طور پر جذب کر لیں اور وہ اپنے کو اس کا جزو لاینفک سمجھنے لگیں۔

مذہبی اور تہذیبی عناصر

جہاں لوگوں کی اصل اساس ہی تہذیب ہو۔ جہاں فرد اور معاشرے کے تمام اعمال اسکے مذہب کی حدود کے تابع ہوں اور مختصراً جہاں دنیاوی اور روحانی اعمال کا منبع فقط مذہب ہو وہاں مذہب اور تہذیب میں کسی قسم کا فرق یا امتیاز کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک دوسرے میں ایسے خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ تہذیب اصل میں صدیوں پرانی روایات، رسم ورواج اور تاریخی اور بالخصوص مذہبی رجحانات، اجتماعی اثرات کا نام ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ تمام عناصر مذہب اور اس سے متعلق فلسفے کے تابع ہوتے ہیں اور یہی مذہبی فلسفہ، نسلاً بعد نسلٍ تمام معاشرتی زندگی کو متشکل کرتا ہے لیکن جہاں مذہب اصل بنیاد نہیں ہوتا۔ وہاں تہذیب زیادہ اہم شکل اختیار کر لیتی ہے ------- جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں مذہب ہی سب کچھ ہے۔ اور یہی ہمارے ناقابلِ تسخیر فلسفے کی اساس ہے اور یہ ہماری پوری زندگی کی روح ہے۔ اس لیے ہماری تہذیب، ہمارے مذہب ہی کا پرتو ہے۔

اسی طرح اس کتابچے میں لسانی وحدت کا ذکر کیا گیا ہے:

ہر نسل جو اپنے ملک میں رہتی ہے۔ وہ ایک زبان تخلیق کرتی ہے اور یہی زبان اس کی تہذیب، اس کے مذہب، اس کی تاریخ اور اس کی روایات کی مظہر ہوتی ہے۔ اس کو کسی اور کے ساتھ خلط ملط کرنا خطرناک اور مہلک ہوتا ہے۔

کسی قوم سے اس کی پرانی اور ازمنہ قدیم کی زبان چھین لی جائے تو اس کے ساتھ ہی اس کا پورا ادب ضائع ہو جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی قوم کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔
ان عناصر کی اہمیت اور ہندوستان کی قومیت کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے

گوالکر اس کتاب میں لکھتا ہے :-

"ہندوستان، ہندوؤں کا ملک ہے، ان کا گھر ہے، نسلاً بعد نسل یہ ان کا خطّہ ہے۔ اس کی جغرافیائی حد بندی ہے۔ اس کی حدیں، اور سرحدیں قدرت نے خود متعین کی ہیں۔ شمال میں بلند و بالا ہمالیہ ہے۔ اور تین طرف اتھاہ سمندر ہے۔ یہ ایک مثالی خطہ ارضی ہے جو ہر لحاظ سے اور ہر خصوصیت کی بنیاد پر ایک قوم کا گھر ہے۔ اس ملک میں زمانہ قبل از تاریخ سے ایک نسل جو ہندو کہلاتی رہی ہے۔ رہ رہی ہے۔ یہ نسل مشترکہ روایات اور تاریخی، سماجی، مذہبی تجربات کی یکسانیت کی بنیاد پر متحد رہی ہے۔ اس نے صدیوں اور ہزاروں سالوں کی جدوجہد سے ایک مشترکہ تہذیب کو جنم دیا ہے۔ ایک زبان وجود میں آئی ہے۔ مشترکہ رسم ورواج تخلیق ہوئے ہیں، اور اس اشتراک نے ان کی تمناؤں میں بھی یکسانیت پیدا کر دی ہے۔ یہ عظیم ہندو نسل اپنے شاندار ہندو مذہب کی پیرو ہے۔ یہ مذہب ہر شعبہ حیات میں اس کا رہنما ہے۔ اور اسی مذہب نے انفرادی، معاشرتی اور سیاسی میدان میں ایک عظیم ثقافت کو جنم دیا ہے۔ جو یورپی، اور مسلمانوں کی دس صدی کی مہلک تہذیب کے تمام گھناؤنے اثرات کے باوجود آج بھی ارفع ترین ثقافتوں میں شمار ہوتی ہے"

گوالکر کا فلسفہ یہیں پہنچ کر دم نہیں لیتا۔ بلکہ وہ اس کو بغیر کسی لگی لپٹی کے اس کے منطقی نتائج تک پہنچاتا ہے اور خود ہی اعلان کرتا ہے :

"ہم اس بات کو پھر دہراتے ہیں کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے اور اس میں صرف ہندو قوم ہی رہ سکتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں صرف وہی تحریکیں قومی کہلا سکتی ہیں جو ہندو قوم کے احیاء اور اس کی برتری کے لیے مصروف جہد ہوں، انہی تحریکوں سے متعلق لوگ محب وطن کہلا سکتے ہیں۔ اور دوسرے تمام لوگ خواہ وہ منہ سے اپنے آپ کو ہندو ہی کیوں نہ کہیں غدار ہیں، اور دشمن ہیں، اور اگر ان سے بہت ہی رعایت برتی جائے تو ان کو جاہل اور بیوقوف کہا جا سکتا ہے۔"

یہاں ہم یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ جو لوگ ہندو قوم کی خصوصیات نہیں رکھتے

ان کو قومی زندگی میں کوئی جگہ نہیں دی جا سکتی، تاوقتیکہ وہ اپنا تفاوت اور علیحدگی بالکل ختم نہیں کر دیتے۔ اور اپنے کو ہندو نسل میں پوری طرح جذب اور مدغم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو جاتے جب تک یہ لوگ اپنے مذہب اپنی مخصوص روایات اور اپنی نسلی علیحدگی پر اصرار کرتے ہیں، اس وقت تک وہ غیر ملکی ہی کہلائیں گے اور غیر ملکیوں کے بارے میں ہم صرف دو رویے روا رکھ سکتے ہیں، یا ہم ان کو دوست رکھیں یا ان سے ہم اپنا دامن بچائے رکھیں، اسی طرح ان غیر ملکیوں کے لیے بھی دو ہی راہیں کھلی ہیں۔ یا تو وہ اپنے کو قومی نسل میں جذب کر لیں، اور قومی تہذیب و ثقافت کو اپنا لیں، یہی واحد اور صحیح راستہ ہے، یا پھر وہ اپنے آپ کو غیر ملکی کے طور پر قوم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔"

اس قسم کا فلسفہ صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ممالک میں جہاں سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوتے ہیں، جنم لیتا ہے اور شروع میں اس فلسفہ کے محرک اور مبلغ بڑے نیک مقاصد کے ساتھ میدان میں آتے ہیں، لیکن بالآخر یہ فلسفہ سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقوں کے طبقاتی مفادات کا محافظ بن جاتا ہے۔ اب راشٹریہ سیوک سنگھ کے اس پروگرام کا تجزیہ کیا جائے تو اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ہندو عوام کے اپنے مطالبات، ان کے معاشی تقاضوں، ان کی سماجی ضرورتوں کو غلط راہ پر ڈالنے کی بھرپور کوشش تھی، کیونکہ اس برصغیر کی تقسیم کے بعد جو انتقال آبادی ہوا۔ جو معاشی ڈھانچہ تہس نہس ہوا۔ جو لاکھوں انسان بے گھر ہوئے تو ان تمام حقیقتوں کا تقاضا یہ تھا۔ کہ ہندوستان میں معاشی ڈھانچہ نئی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ جس میں عام لوگوں، مزدوروں، کسانوں، شہریوں کی معاشی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اب یہ ضرورتیں اسی صورت میں پوری ہو سکتی تھیں، کہ زمین کسان کو دی جاتی اور فالتو زمین پر شرنارتھیوں کو آباد کیا جاتا۔ بیرونی سرمایہ ضبط کر کے ملکی صنعتوں کو پھلنے پھولنے اور ان کو قومی تحویل میں لیا جاتا۔ اس سے معاشی ترقی کی نئی راہیں کھلتیں اور صحیح جمہوری معاشرہ وجود میں آتا۔ لیکن اس کے لیے سرمایہ دار طبقہ کے خلاف بھرپور جدوجہد ضروری تھی اور عوام کو ان بنیادوں پر منظم کیا جانا ضروری تھا۔ لیکن اس صورت سے بچنے کے لیے ہندو عوام کے غم و غصہ اور اس کے معاشی

تقاضوں کو بالکل دوسری راہوں پر ڈال دیا گیا اور یہ راہیں اقلیتوں کے خلاف نفرت اور فرقہ وارانہ فسادات کی طرف سے جاتی تھیں، چنانچہ راشٹریہ سیوک سنگھ نے ہندو عوام کو ہندو تہذیب کے احیاء کے سبز باغ دکھا کر مسحور کیا اور ان کو باور کرایا کہ ان کے تمام دکھ تمام تکلیفیں اور تمام صعوبتیں مسلمانوں کی وجہ سے ہیں، اگر ان مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے، اگر پاکستان کو ہندوستان میں شامل کر لیا جائے تو دودھ کی نہریں بہنی شروع ہو جائیں گی۔ ان ہندو عوام کی توجہ برلاؤں اور ٹاٹاؤں سے ہٹا کر مسلمان اقلیت کی طرف لگا دی گئی۔ یہی نہیں بلکہ نفرت کے ان سوتوں نے عیسائیوں اینگلو انڈین اور خود اچھوتوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ پاکستان میں بھی حکمران طبقوں نے یہ عمل روا رکھا اور اس طرح عوام کی توجہ ان کے اصل مسائل سے ہٹا کر بھارت دشمنی کی طرف مستقل لگائے رکھی۔ یہ بھی درست ہے کہ خود بھارت کے حکمران طبقوں نے کشمیر وغیرہ کے مسائل کو الجھا کر اس عمل کو اور تیز کر دیا۔ لیکن یہ بھی ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ پاکستان میں راشٹریہ سیوک سنگھ قسم کا کردار جماعت اسلامی ادا کرتی رہی ہے۔ چونکہ مغربی پاکستان میں ہندو اقلیت موجود نہیں ہے۔ کہ عوامی غیض و غضب کو ان کے خلاف موڑ دیا جاتا۔ اس لیے یہاں عوام کے غیض و غضب کو سیدھا سیدھا معاشی انصاف کا مطالبہ کرنے والوں کے خلاف موڑ دیا جاتا ہے۔ اور ان کو اسلام دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ مقصد ایک ہی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح عوام کو غلط فلسفوں میں الجھا کر ان کو لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقوں کے خلاف منظم نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ لطف یہ ہے کہ راشٹریہ سیوک سنگھ سوشلسٹ ممالک اور کمیونزم سے نفرت کے اظہار میں قریب قریب وہی زبان استعمال کرتی ہے۔ جو یہاں پاکستان میں جماعت اسلامی اور ان کے ہمنوا سوشلسٹوں اور عوامی جمہوریہ چین اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں کے دوستوں کے لیے استعمال کرتی ہے۔

فسطائی جماعتیں جو جنون اور تعصب کو ہوا دیتی ہیں۔ وہ اگر ایک طرف اپنے ملک کے محنت کش عوام کے مسائل سے اغماض برتتی ہیں اور ان کی توجہ جنون، تعصب اور نفرت کی راہوں پر لگاتی ہیں تو دوسری طرف وہ عوام کے توہمات، جہالت اور پسماندگی کو بھی ہوا دیتی ہیں اور وہ ترقی اور روشن خیالی کی ہر یلغار کے سامنے سینہ سپر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ لطف یہ ہے کہ اس ضمن میں بھی بھارت

کی راشٹریہ سیوک سنگھ کے مسلک اور پاکستان کی جماعت اسلامی کے موقف میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔ چنانچہ کانگرس نے ۱۹۴۹ء میں جب ہندو روایات اور قوانین کو منضبط کرنے اور ان کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ہندو کوڈ بل مرتب کیا۔ جس کے ذریعے ہندو عورت کو سماجی تحفظ دینا مقصود تھا۔ تو راشٹریہ سیوک سنگھ نے اس بل کی شدید مخالفت کی۔ چنانچہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے ترجمان "آرگنائزر" نے ایک اداریے میں لکھا تھا:

"ہم ہندو کوڈ بل کی شدید مخالفت کرتے ہیں، ہم اس کی مخالفت اس لیے کرتے ہیں، کیونکہ یہ مہلک اقدام ہیں جو غیر بھارتی اور غیر اخلاقی اصولوں پر مبنی ہیں۔ حکومت کا کہنا ہے کہ وہ ہندو قوانین کو منضبط کرنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ صرف ظاہرداری ہے، ہندو قانون 'ایک دنیا جانتی ہے۔ اس کو منضبط کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اصل میں حکومت ہندو قوانین میں تبدیلی اور ترمیم کرنا چاہتی ہے اس کی بنیاد بدلنا چاہتی ہے۔ یہ ان قوانین کو مغربی بنیادوں اور اصولوں پر ڈھالنا چاہتی ہے۔

ہندو قانون دراصل ہندو مت اور تہذیب کا ایک اٹوٹ انگ ہے اور کروڑہا ہندو ہزارہا برس سے اس قانون کو تسلیم کرتے آئے ہیں۔ اور انہوں نے اس کو اپنے لیے مفید پایا ہے۔ اب ان ہزارہا برس کے آزمائے ہوئے قوانین کی بجائے حکومت جدید فیشن کے مطابق ان قوانین کو ڈھالنا چاہتی ہے۔ کیونکہ امریکہ اور مغربی ممالک کے لوگ اپنی پسند کی شادی کر سکتے ہیں، اور طلاق بھی آزادانہ طور پر دے سکتے ہیں۔ اس لیے کیا ہم بھی یہاں یہی طور طریقے رائج کریں۔ اس قسم کا قانون جو ہندو سماج کی بنیادیں ہلانے والا ہو۔ وہ حکومت کے دائرۂ اختیار سے ہی باہر ہے۔ ایک لادینی ریاست کو لوگوں کے مذہبی احساسات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔"

راشٹریہ سیوک سنگھ اور اس کے اراکین کو اس امر پر بھی شدید اعتراض تھا۔ کہ یہ ہندو کوڈ بل پارلیمنٹ میں زیر بحث لایا جائے گا۔ جہاں اس پر کھلے بندوں بحث ہوگی، اور بحث کرنے والوں میں مسلمان، عیسائی اور اچھوت بھی ہوں گے۔ پورے بھارت میں عورتوں نے جب اپنے حقوق

کے لیے جدوجہد شروع کی اور جلسے جلوس منظم کرنے شروع کیے تو راشٹریہ سیوک سنگھ نے جگہ جگہ ان جلسوں اور جلوسوں کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی، اور بالآخر اپنے ممبروں کی ماؤں بہنوں سے پارلیمنٹ کے سامنے ایک مظاہرہ کروایا گیا تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ ہندو عورتیں آزادی نہیں چاہتیں۔ اسی طرح راشٹریہ سیوک سنگھ مخلوط تعلیم کی مخالف ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی بھی مخالف ہے۔ چنانچہ کانگرس حکومت نے ڈاکٹر رادھا کرشنن، جو بعد میں بھارت کے صدر کے عہدے پر بھی فائز ہوئے، کی سربراہی میں ایک یونیورسٹی کمیشن قائم کیا تھا۔ اور اس نے یہ سفارش کی تھی کہ یونیورسٹی کی تعلیم میں بھی مادری زبانوں کو رائج کیا جائے۔ اس پر راشٹریہ سیوک سنگھ نے مخالفت کی تھی۔ اور کہا تھا کہ اس طرح ہندوؤں کی ایکتا پر چوٹ پڑے گی اور مختلف علاقوں میں علاقائی زبانیں مضبوط اور مستحکم ہو جائیں گی اس طرح اس کمیشن کی مخلوط تعلیم کی سفارش پر بھی نکتہ چینی کی گئی تھی اور مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس کمیشن نے ہندو دھرم کی تعلیم کے بارے میں کوئی سفارش نہیں کی۔ اسی طرح اس جماعت نے لسانی صوبوں کے قیام کی بھی شدید مخالفت کی ہے۔ یہ صوبائی خودمختاری کی بھی شدید مخالف ہے۔ اور ایک آہنی اور مضبوط مرکز کی حامی و داعی ہے۔ یہ جماعت صرف ایک زبان ہندی کی حامی ہے اور اس کے کچھ ممبر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہندی بھی صرف عبوری دور کے لیے ہے۔ بالآخر بھارت کی زبان سنسکرت ہونی چاہیئے۔

اسی طرح راشٹریہ سیوک سنگھ شدید طور پر کمیونسٹ دشمن ہے۔ چنانچہ اس کا قائد بار بار کہتا رہا ہے کہ کمیونزم بھارتی مزاج کے خلاف ہے اس لیے اس کو خلاف قانون قرار دیا جائے۔ چنانچہ جب راشٹریہ سیوک سنگھ کو گاندھی جی کے قتل کے بعد خلاف قانون قرار دیا گیا۔ تو اس زمانے میں گوالکر نے بار بار اعلان کیا کہ راشٹریہ سیوک سنگھ پر سے پابندی ہٹائی جائے۔ کیونکہ یہی واحد جماعت ہے جو کمیونزم کی یلغار کو روک سکتی ہے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ اپنی نفرتوں اور غیض و غضب کو تین دشمنوں کے خلاف مرکوز کرتی رہی ہے۔ اولاً پاکستان، دوئم ہندی مسلمان، سوئم کمیونسٹ پارٹی" اور لطف یہ ہے کہ راشٹریہ سیوک سنگھ ان تینوں میں گہرا تعلق تصور کرتی ہے اور برملا کہتی ہے کہ بھارتی کمیونسٹ پارٹی کو پاکستان ... مالی امداد دیتا ہے۔

اپنی مسلم اور کمیونسٹ دشمنی کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ طلبا پر خاصی توجہ دیتی ہے۔ چنانچہ اس نے طلبا کی الگ تنظیم قائم کی ہے۔ جس کا نام "اکھیل بھارتیہ ودیارتھی پریشاد" ہے۔ سرکاری طور پر یہ تنظیم اپنے آپکو راشٹریہ سیوک سنگھ سے ملحق تسلیم نہیں کرتی لیکن عملاً طلبا کی یہ تنظیم سنگھ کا ہی ایک حصّہ ہے اور اس کی پالیسی کے تابع ہے۔

راشٹریہ سیوک سنگھ کے شروع کے اثر و رسُوخ کا جو دائرہ رہا ہے اس میں وہی علاقے زیادہ نمایاں رہے ہیں۔ جہاں مسلم دشمنی تیز تھی، بالخصوص پنجاب، دہلی اور شمالی ہند کے علاقے جہاں شرنارتھی بھی زیادہ آباد تھے اور اکثر شرنارتھی اپنے ساتھ بہت پہلے ہی مسلم دشمنی لائے تھے جو نئے حالات میں زیادہ مستحکم ہوگئی اور سنگھ نے اس دشمنی کو خوب اچھالا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے لیے جو مقبولیت مشرقی پنجاب اور شمالی ہند کے علاقوں میں ہوئی وہ دوسرے علاقوں میں اسے نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہ گوشوارہ جو خود راشٹریہ سیوک سنگھ کے حلقوں کی طرف سے اس زمانے میں شائع کیا گیا وہ اس عمل کی نشاندہی کرتا ہے:

صوبے	رکنیت کی تعداد
اترپردیش	۲ لاکھ
مدھیہ پردیش	ایک لاکھ ۲۵ ہزار
مشرقی پنجاب اور اس کے ساتھ کی ریاستیں اور دہلی کا صوبہ	ایک لاکھ ۲۵ ہزار
بمبئی	۶۰ ہزار
بہار	۵۰ ہزار
مغربی بنگال	۱۰ ہزار
آسام	۳ ہزار
اڑیسہ	۳ ہزار
آندھرا	۸ ہزار
تامل ناد	۲ ہزار

مالا بار	۵ ہزار
کرناٹک، حیدر آباد اور میسور	۱۵ ہزار
ودھیا پردیش اور بھوپال	۲۰ ہزار
سوراشٹر	۳ ہزار
جموں کشمیر (مقبوضہ)	ایک ہزار

یہ تھی طاقت راشٹریہ سیوک سنگھ کی جب ۱۹۴۸ء میں اس پر گاندھی جی کے قتل کے الزام میں پابندی عائد کر دی گئی اور پھر اسی خلاف قانون جماعت کی کوکھ سے جن سنگھ نے جنم لیا۔

خلافت سے احرار تک

مجلس احرار

مجلس احرار اسلام کا قیام بظاہر ایک جماعت کے طور پر تو ۱۹۲۹ء میں عمل میں آیا۔ لیکن مجلس احرار اسلام کے بانی اور رہنما اس وادیٔ خارزار میں نئے نہیں تھے، وہ سیاست کی وادی میں ایک دہائی گذار چکے تھے، ان کے تلوے اس راہ کی خاک سے آلودہ تھے، ان کے دامن اس راہ کے کانٹوں سے تار تار تھے، جیل ان دس سالوں میں ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے حوصلے بلند اور ولولے جوان تھے، جب انہوں نے مجلس احرار بنائی تو اس وقت وہ پنجاب کے شہروں اور پڑھے لکھے لوگوں میں معتوب تھے۔ ان کا شمار نہرو رپورٹ کے حامیوں میں ہوتا تھا، اور پنجاب کے برسر اقتدار مسلمان سیاستدان اور ملازمتوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پڑھا لکھا مسلمان اس نہرو رپورٹ کا مخالف تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ مجلس احرار اسلام کے بانی اور رہنمایان کرام کا خمیر کس طبقے کی مٹی سے ابھرا تھا کہ ان میں، سر فضل حسین، سر فیروز خان نون، سر شہاب الدین اور ان کے حامیوں کی فوج ظفر موج کے سیاسی موقف کی مخالفت کا یارا تھا در اصل یہی طبقاتی فرق ہی مجلس احرار اسلام کو متنازعہ فیہ جماعت بناتا ہے اور اسی طبقاتی بعد نے عالموں، مورخوں اور تجزیہ نگاروں کو اس جماعت اور اس کے رہنماؤں کے متعلق کبھی کچھ لکھنے کی

توفیق نہیں دی: کیونکہ جس طرح سے افراد اپنے طبقے کی بنیاد پر عزت و تکریم کے حقدار ٹھہرتے ہیں بالکل اسی طرح جماعتیں بھی طبقات کی بنیاد پر ہی جانچی جاتی ہیں' اور جب طبقات کی بنیاد پر چھان پھٹک ہونے لگتی ہے تو مذہب ایک اضافی صفت رہ جاتا ہے'۔ بنیادی بات نہیں ہوتا۔ اگر نہ کیا وجہ ہے کہ مسلم لیگ جس کے قائدین نظریاتی طور پر مسلمان ہوں تو ہوں لیکن عملاً ان کی زندگی مذہب کے احکام اور ان کی پابندیوں سے بہت دُور تھی۔ لیکن ان کے مقابلے میں مجلس احرار اسلام کے رہنما عالمانِ دین اور زاہدان شب بیدار تھے و صوم و صلوٰۃ کے پابند وضع قطع سے شرع محمدیؐ کے مکمل نمونہ، لیکن مقبولیت عامۃ المسلمین کا جب سوال آیا تو یہ زاہد شب بیدار اور صوم و صلوٰۃ کے پابند علماء دین معتوب ٹھہرے اور مسلم عوام کے حضور داڑھی منڈے صوم و صلوٰۃ سے بے نیاز مسلم لیگی رہنما کامیاب و کامران ٹھہرے آخر کیوں۔؟

اگر مذہب اور اسلام مسائل کی بنیاد بنتا تو پھر مسلم عوام ان علمائے دین کی آواز پر لبیک کہتے اور جب مجلس احرار نے مسلم لیگ کی یلغار کو روکنے کے لیے حکومت الٰہیہ کی قرارداد پاس کی تھی (اگر اسلام کا نعرہ ہی اہم ہوتا) تو وہ اس یلغار کو روکنے میں یقیناً کامیاب ہو جاتی۔ اس لیے کہ اس قرارداد میں کہا گیا تھا۔ کہ:

> مجلس احرار اسلام واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ جغرافیائی یا نسلی یا لسانی وغیرہ حدود کو قائم کرنا یا برقرار رکھنا مسلمان کا مذہبی یا حقیقی اور قطعی فریضہ ہے بلکہ ہر حالت میں خدا اور رسول کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنا دنیا میں نیکی سے رہنا، نیکی سے تعاون کرنا، نیکی کی حکومت قائم کرنا اور نیکی کو رواج دینا ہی خلقت انسانی کی خداوندی حکمت و مصلحت ہے اور مجلس احرار اسلام، دنیا کے جس حصے میں بھی ممکن ہو۔ حکومت الٰہیہ کے قیام کی خواہاں ہے تاکہ دنیا کو دکھایا جا سکے کہ اسلام کے زرّیں اصولوں پر کاربند ہو کر کس طرح دنیا کے مصائب کا علاج کیا جا سکتا ہے اور دنیا و آخرت میں فلاح کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے؟

اس ضمن میں مجلس احرار اسلام یہ واضح کر دینا بھی مناسب سمجھتی ہے کہ

کسی علاقہ میں محض مسلمانوں کی اکثریت یا افراد کے ہاتھوں میں حکومت کا آجانا حکومت الٰہیہ کا مترادف نہیں بلکہ ایسی شخصی یا جماعتی حکومتوں نے جو اسلام کے نام پر اپنی اغراض کی تکمیل کے درپے ہیں، اسلام کے روئے روشن پر دھبہ لگایا اور دنیا کو اسلام سے متنفر ہونے کی گنجائش دی۔ مجلس کسی ایسے تجربہ کو دہرانے کے لیے مسلمانوں کی دین سے بے بہرہ کسی جماعت یا گروہ کے ہاتھ حکومت دے کر مطمئن نہیں ہوسکتی اور وہ مسلمانوں سے پر زور درخواست کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی ذمہ داری کا فوری اور کلی احساس کریں اور اپنی نگاہ سے حکومت الٰہیہ کو اوجھل کرکے اسلام کے نام پر الحاد و زندقہ کے فروغ کا موقعہ نہ دیں۔ بلکہ سب مسلمانوں کو اطاعت خدا اور رسول پر کمربستہ ہونے کی تلقین و تاکید کریں۔" (تاریخ احرار، افضل حق صفحہ ۔۴۶)

اب اس حکومت الٰہیہ کے نعرے اور اسلام کی حکمرانی کے مژدہ جانفزا کے مقابلے میں مسلم لیگ کی وہ قرارداد ملاحظہ فرمائیے جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں منظور کی گئی اور جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی، اس میں فقط یہ کہا گیا:

"کل ہند مسلم لیگ کا پہلا اجلاس دستوری معاملات کی نسبت لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کی کارروائی کی جو ان کی تجویز مورخہ ۲۷ اگست کو ۱۷، ۱۸ ستمبر ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء سے ظاہر ہے۔ توثیق کرتے ہوئے پوری شدت کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ وفاق جس کی دستور ہند بابت ۱۹۳۵ء پر تشریح کی گئی ہے اس ملک کے حالات کے اعتبار سے قطعاً ناموزوں اور ناقابل عمل ہے اور مسلم ہندوستان کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں قرار پایا کہ کل ہند مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ رائے ہے کہ کوئی دستوری خاکہ اس ملک میں قابل عمل یا مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔

جب تک مندرجہ ذیل بنیادی اصول کے تحت مرتب نہ کیا گیا ہو:
جغرافیائی حیثیت سے متصل ارضی وحدتوں کے مابین حدود قائم کرکے

ان کو جداگانہ علاقوں پر منقسم کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ضروری معلوم ہوتا ہے ان رقبہ جات میں جہاں بلحاظِ تعداد مسلمان اکثریت میں ہیں مثلاً شمال مغربی ہندوستان کے مشرقی علاقوں کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے اسی طرح متحد کرنا چاہیئے کہ ان میں سے ہر ایک وحدت خود مختار ہو۔

ان آزاد علاقوں اور خود مختار وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کے لیے ان ہی کے مشورہ سے معین اور مؤثر تحفظات مہیا کرنا چاہئیں۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں دستور میں ان کے لیے معین اور مؤثر تحفظات شامل کیے جائیں تاکہ ان کے مذہبی، ثقافتی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی خود ان کی مشورت کے ذریعے حفاظت ہو سکے۔ یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ مذکورہ بالا بنیادی اصول کی روشنی میں دستور کا خاکہ ترتیب دے تاکہ ہر وحدت آخر کار تمام اختیارات جن کا تعلق دفاع، خارجہ امور، مواصلات، کسٹم اور دوسرے ضروری امور سے ہو خود سنبھال سکے۔"

یہاں کہیں حکومت الٰہیہ کا ذکر نہیں ہے کہیں اس میں الحاد و زندقہ کے روکنے کا نعرہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ قرارداد برصغیر کے مسلمانوں کو بالعموم مجتمع کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ بنیادی سوال تو یہ ہے کہ آخر کیوں ایسا ہوا۔ آخر کیوں احرار کی تمام جانفشانیاں، شعلہ بیانیاں قید و بند کی صعوبتیں، مذہبی جذبات کی بنیاد پر لوگوں کو مجتمع کرنے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں؟

اس بنیادی مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہمیں مجلس احرار کی تاریخ کو پنجاب کی تاریخ کے پس منظر میں سمجھنا ہو گا۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر مجلس احرار پنجاب کے مسلمانوں ہی کی تحریک تھی۔ یہ درست ہے کہ اس کا اثر و رسوخ متحدہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں تک بھی پہنچا۔ لیکن اس اثر و رسوخ کے باوجود اس کی سیاست اور اس کے بنیادی تقاضوں پہ چھاپ پنجابی مسلمانوں کے ایک طبقے کی ضرورتوں ہی کی رہی۔ یہ طبقہ کون سا تھا جس سے

یہ ان طور رہنما تو پیدا کر دیئے لیکن وہ مسلمانوں کو مجموعی طور پر قیادت نہ بخش سکا۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے احرار کے قیام کے پس منظر اور اس کی طبقاتی حیثیت کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی خود نوشت سوانح "میری زندگی" میں لکھا ہے:

"کراچی کانگریس کی آخری کارروائیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ اس نے آئندہ سال کے لیے ورکنگ کمیٹی منتخب کی، اس کمیٹی کا انتخاب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کرتی ہے۔ مگر کچھ عرصے سے یہ طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ جو شخص کانگریس کا صدر ہوتا ہے۔ وہ (گاندھی جی اور کبھی کبھی بعض اور رفیقوں کے مشورے سے) ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے نام تجویز کرتا ہے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس تجویز کو منظور کر لیتی ہے۔ کراچی میں جو ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا۔ اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا۔ جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بعض ممبروں کو انتخاب پر (خصوصاً ایک مسلمان کے نام پر) اعتراض تھا۔ شاید انہیں یہ شکایت بھی تھی کہ ان کے حلقے میں سے کوئی بھی نہیں لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ پندرہ آدمیوں کی آل انڈیا کمیٹی میں ہر گروہ کی نمائندگی ناممکن تھی اور اصل نزاع جس کا ہمیں کچھ علم نہ تھا۔ محض ذاتی اور مقامی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعتراض کرنے والا گروہ رفتہ رفتہ کانگریس سے علیحدہ ہو گیا۔ اور اس نے مجلس احرار کے نام سے اپنی ایک انجمن بنالی پنجاب کے بعض نہایت سرگرم اور ہر دل عزیز مسلمان کانگریسی کارکن اس انجمن میں شریک ہو گئے اور انہوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ لوگ زیادہ تر نچلے اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا عام مسلمانوں پر بڑا اثر تھا۔ یہ ایک زبردست انجمن بن گئی، جو اونچے طبقے کے فرقہ پرست مسلمانوں کی فرسودہ جماعت سے کہیں زیادہ قوت رکھتی تھی۔ اس لیے کہ اس جماعت کی کارروائیاں محض ہوائی تھیں، یا یوں کہنا چاہیئے کہ محض دیوان خانوں اور کمیٹی کے کمروں تک محدود تھیں لازمی طور پر احرار کی انجمن رفتہ رفتہ فرقہ پرستی کی طرف مائل ہو گئی، مگر چونکہ ان کا تعلق

عام مسلمانوں سے تھا۔ اس لیے وہ ایک زندہ جماعت تھی اور بعض مبہم معاشی خیالات بھی رکھتی تھی۔ آگے چل کر دیسی ریاستوں خصوصاً کشمیر کے مسلمانوں کی شورشوں پر جہاں بدقسمتی سے معاشی شکایتیں فرقہ پرستی میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ احرار نے بہت اہم حصہ لیا۔ احرار پارٹی کے بعض لیڈروں کے کانگریس سے الگ ہو جانے سے پنجاب کی کانگریس کو بہت نقصان پہنچا۔ مگر کراچی میں ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے الگ ہو جانے کی وجہ صرف وہ ناراضی ہی نہیں تھی، جو ورکنگ کمیٹی کے انتخاب سے پیدا ہوئی۔ یہ تو محض علامت تھی۔ جس سے صورت حال کا اظہار ہو گیا۔ اصل اسباب کچھ اور تھے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے بجا کہا کہ یہ بہانہ بن گیا۔ اسباب کچھ اور تھے، اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ پنڈت جی اس بہانے کی بھی صحیح نشاندہی نہ کر پاتے ہوں لیکن جہاں تک ان کا احرار کے طبقاتی حیثیت کے تجزیہ کا تعلق ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ گو چودھری افضل حق نے پنڈت جی کے اس تجزیہ کو اپنی تضحیک سمجھا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں یہی طبقہ بالخصوص مسلمانوں کا یہ طبقہ ایک زبردست انقلابی رول ادا کر سکتا تھا اور یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ یہی طبقہ تھا جو مسلمانوں کی سیاست میں ایک اہم رول ادا کرتا رہا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو پنجاب کی ہی نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ شمالی ہند کی مسلم سیاست دراصل اس نچلے درمیانے طبقے اور اوپری طبقے کی متحارب سیاست، ان کی متضاد آرزوؤں، خواہشوں اور ان متضاد خواہشوں اور آرزوؤں سے مرتب ہونے والی سیاسی پالیسیوں اور ان پالیسیوں کو بروئے کار لانے کے لیے مختلف طریق کار کے دست و گریبان ہونے کی کہانی ہے۔ بدقسمتی سے اس خطے میں ابھرنے والی ان تحریکوں کو اس پس منظر میں دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ حالانکہ مسلمانوں کی سیاسی نشوونما میں اس طبقے کی تحریکوں کا ایک بہت ہی اہم رول رہا ہے۔ ان سیاسی جماعتوں پر تحقیق و تفحص نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ نچلے درمیانے طبقے کی نمائندگی کرتی تھیں۔ اور یہ طبقہ اپنی تمام جانفشانیوں اور قربانیوں کے باوجود مسلمانوں کو وہ قیادت نہیں بخش سکا جو اس دور کے ابھرتے ہوئے نیم سرمایہ دار و جاگیردار کو اقتدار تک پہنچا دیتی۔ مسلم سیاست میں یہ تضاد

کوئی مجلس احرار سے ہی شروع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کے ڈانڈے دراصل ہماری سیاست میں بہت ہی گہرے پیوست ہیں، کبھی یہ علی گڑھ اور دیوبند کی صورت میں ظاہر ہوتے تو کبھی مولانا شبلی کو اپنے انہی غیر واضح اور مبہم جذبات کا اظہار اپنی نظم میں کرنا پڑا۔ مولانا شبلی کی نظم کا عنوان ہے "مسلم لیگ" اور نظم یہ ہے:۔

لیگ کے عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے شور ہے کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظر لطف رئیسان، خوش انجام بھی ہے
کون ہے جو نہیں اس حلقہ قومی کا اسیر
اس میں زہاد بھی ہیں، رند مے آشام بھی ہے
فیض ہے اس کا باندازہ طالب، یعنی
بادۂ صاف بھی ہے، درد تہہ جام بھی ہے
کعبہ قوم جو کہتے ہیں، بجا کہتے ہیں
مرجع خاص ہے یہ قبلہ کہ عام بھی ہے
پختہ کاروں کے لیے آلۂ تسخیر ہے یہ
نوجوانوں کو صلائے طمع خام بھی ہے
مبتدیان نو آموز کا ہے مکتب درس
زینۂ فخر و نمائش گری عام بھی ہے
جن مہمات میں درکار ہے ایثار نفوس
ان میں طرز عمل پورہ و پیغام بھی ہے
صدمۂ مشہد و تبریز سے آنکھیں ہیں پرآب
دل میں غمخواری ترکان نکو نام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں

محسن قوم بھی ہے خادم حکام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی

جس طرح "صرف" میں ایک قاعدہ ادغام بھی ہے
اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا سامان ہے درست

ورق سادہ بھی ہے، کلک خوش اندام بھی ہے
ہیں قرینے سے سجائی ہوئی چیزیں ہر سو

جا بجا دفتر پارینۂ احکام بھی ہے
چند بی اے ہیں سند یافتۂ علم و عمل

کچھ اسسٹنٹ ہیں اک حلقۂ خدام بھی ہے
ہو جو تعطیل میں تفریح و سیاحت مقصود

سفر درجۂ اول کے لیے دام بھی ہے
یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک گذارش ہے حضور!

گرچہ یہ سوءِ ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے
مجھ سے آہستہ میرے کان میں ارشاد ہو یہ

سال بھر حضرت والا کو کوئی کام بھی ہے

اور پھر ایک وقت میں اس برصغیر کے بسنے والے مسلمانوں کو احتجاج کے اظہار کے لیے خلافت کمیٹی قائم کرنا پڑی۔ مسلم لیگ اس کام کے اہل نہ ہو سکی یہ دراصل اہلیت اور قیادت، تحریک کے طبقاتی پہلو کی نشاندہی کر رہی تھی اور مجلس احرار اور اس کی قیادت میں چلنے والی تحریکوں کو دراصل اس وقت تک سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ جب تک کہ پنجاب ہی کیا ہندوستان میں خلافت تحریک اور اس کے اثرات کو ذرا تفصیل سے نہ جانچا جائے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ مسلمانوں میں کون سے طبقے کو اس زمانے کے ناموافق حالات نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ جس نے اپنے احتجاج کے لیے خلافت کی تحریک کو اپنایا اور اس تحریک کو اپنے دکھوں کا مداوا تصور کیا۔ کیونکہ مجلس احرار کا بنیادی خمیر اسی

تحریک خلافت سے ابھرا تھا۔ اور انہوں نے آخر دم تک تحریک خلافت نے جو طریق کار
وضع کیا تھا اسے ہی نبھانے کی کوشش کی اور یہی طریق کار ایک طرف ان کی مقبولیت
کا باعث بنا اور دوسری طرف ان کی شکست بھی اسی طریق کار کی وجہ سے ہوئی۔ کیوں کہ یہ
طریق کار نئے حالات میں نہ تو کارگر تھا۔ اور نہ سُودمند، اور یہی نہیں بلکہ جو طبقات نئے حالات
میں آگے آرہے تھے، ان طبقات کو مجلس احرار کے طریقے اور منزل دونوں ہی متاثر نہیں کرتے
تھے۔ چنانچہ احرار کے سب سے اہم مفکر چوہدری افضل حق تحریک خلافت کے بارے میں
لکھتے ہیں:

"غیرت نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا واحسرتا یہ ہوا مسلمانوں
کا انجام، پھر اس نے نظریں نیچی کر لیں اور کہا کیا کلمہ گویوں میں کوئی رجل رشید
نہیں رہا۔ جو بربادیٔ اسلام پر آنسو ہی بہائے اور خدا سے پریم کھیلنے کے لیے
جان کا جُوا لگا دے اور مسلمانوں کی بگڑی بنانے کے لیے ہندوستان میں اُٹھے
اور اندوہ گیں ملت اسلامیہ کا سر اونچا کرے؟ بہتوں نے دل کے کانوں سے
اس آواز کو سنا، تھوڑے حوصلے کر کے گھروں سے نکلے۔ اُمراء بدستور دادِ عیش
دیتے رہے۔ صوفیا، روحانیت کے گوشوں میں ڈرے سہمے بیٹھے رہے۔
درمیانے طبقے کے کچھ اور نچلے طبقے کے زیادہ تعداد پر مشتمل لوگوں نے۔ خلافت
کمیٹی۔ کی بنیاد رکھی۔ اور چاہا کہ روٹھی ہوئی قسمت کو زاری اور زور سے منائیں
راستے کی مشکل اور منزل کی دُوری نے سب کو دل گرفتہ کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کی
بہت سی تحریکیں نامرادی کی نیند سو چکی تھیں اب بھی انگریزی سطوت کی
علم بردار ہندوستانی پولیس ہر طرف مستعد نظر آتی تھی، جس فوج نے ہزاروں
میل دُور جا کر اسلامی ممالک کو تاراج کیا تھا۔ انہیں یہاں کلمہ گویوں کا سر قلم
کرنے میں دریغ کیا تھا۔ عوام کے ہاتھ میں محض کلرکی کا قلم رہ گیا تھا۔ جہاد
کے ابتدائی سامان سے محروم قوم خم ٹھوک کر میدان میں کیا نکلتی؟ احتیاج
نے شیروں کو روباہ مزاج بنا دیا اور احتیاط کا تقاضا یہ ہوا کہ ممیا کر بھیڑ تیے

سے رحم کی درخواست کی جائے۔ روح جہاد کو ترک کر کے زیادہ سے زیادہ مسکین بننے کا مسلک اختیار کیا جائے۔ جو مخالف کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ مار اور مار کہہ کر مارنے والے کو زچ کرتا ہے اور دیکھنے سننے والے کے رحم کو مدد کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ مہاتما گاندھی اس اصول سیاست کا ماہر مانا جاتا تھا۔ اس بنیے کو یہ بزرگی سونپ دی گئی کہ پہلے تم ہی اپنے مزاج کے مطابق مار کھا کر دوسرے کو مہربان کرنے کے دعوے کی دلیل پیدا کرو۔ گاندھی فطری طور پر آندھی ہے۔ شوکت علی اور محمد علی کا مسلمانوں میں اسے سہارا ملا تو اس نے ملک میں طوفان کھڑا کر دیا۔ طول و عرض میں انگریزوں کے لیے فتنے بیدار ہو گئے۔ ایک دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ تخت سلطنت ہل گیا ہے۔ مردہ دل ہندوستانیوں میں آثار زندگی پیدا ہو گئے۔ گویا خزاں دیدہ ہندوستان میں بہار آ گئی۔ ناگاہ چورا چوری کے واقعہ ہائلہ نے گاندھی جی کے مزاج میں اعتدال پیدا کر دیا۔ سول نافرمانی کے سرپٹ گھوڑے کو یکدم روک دیا گیا۔ سب سیاسی کارکن محسوس کرنے لگے کہ وہ اونچی جگہ سے پتھریلی زمین پر گرے ہیں۔ اور انہیں دن کو بھی چوٹ سے تارے نظر آنے لگے ہیں۔ قوموں کا بگڑ کر بننا اور تحریکوں کا رک کر چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میدان جنگ میں ایک چال چوک جانے سے بھاگڑ مچ جاتی ہے۔ کانگرس اور خلافت کی صفوں میں انتشار سا پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کے بے عمل اعلیٰ طبقے کو یہ موقعہ خدا دے۔ انہوں نے کہا بنیئے بقال کو قوم کا سردار بنانے والے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ گویا وہ خود تلوار ٹیک کر جہادِ زندگی کو نکلے ہیں اور جو کام گاندھی، شوکت علی، محمد علی انجام نہ دے سکیں یہ آرام طلب اُمراء آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ جب تک خلافت کی تحریک زوروں پر تھی، بلوری گلاسوں میں گھونٹ گھونٹ شربت پینے والے ناز پروردہ اُونچے گھرانے والوں نے دم نہ مارا۔ اب ترک سول نافرمانی کے بعد یہ کھل کھیلے، کہا کہ خلافت لفنگوں کی جماعت ہے۔ یہ پبلک کے چندوں پر پرورش

پانے والے لوگ قوم کی خدمت کیا کریں گے"۔

نچلے درمیانے طبقے کی زبوں حالی

ہندوستان میں مسلمانوں کا یہ نچلا درمیانہ طبقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے ہی بے چینی اور محرومی کا شکار چلا آرہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے، ہمارے ہاں ایک طرف اگر کسان نے بنگال میں مزاحمتی تحریک کی بنا ڈالی تو دوسری طرف گھریلو دستکاری کی تباہی نے اس چھوٹے دستکار کو بے روزگار کر کے تباہی کے غار میں دھکیل دیا۔ اور ہندوستان میں مسلم سوسائٹی کے انہی عناصر نے نچلے درمیانے طبقے کی تشکیل کی۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ چھوٹی صنعتوں میں زیادہ تر مسلم آبادی ہی مصروف تھی، ان میں جولاہے ہوں یا لوہار، ترکھان ہوں یا دیہات میں چھوٹا موٹا کام کرنے والے پیشہ ور، یہ سب مسلمان ہی ہوا کرتے تھے۔ برطانوی حکومت نے ابتدا سے ہی کس طرح ہندوستان کی صنعت کو تباہ و برباد کیا۔ اس پر خود برطانوی مؤرخوں نے صفحات کے صفحات سیاہ کیے ہیں۔ اس لیے میں یہاں صرف ایک دو حوالوں پر اکتفا کروں گا لیکن انگریز نے جو صنعت تباہ کی اس نے پورے ایک طبقے کو متاثر کیا کیونکہ اس وقت ہمارے ہاں مشین نہیں تھی۔ بلکہ دستی صنعت کاری ہی تھی۔ اور جب یہ صنعت تباہ ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا دستکار جو دیہات اور شہر میں اپنے کام کاج میں مصروف تھا وہ تہس نہس ہو گیا۔ اب اندازہ لگائیے کہ ۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۲ء کے درمیان ۱۷ سال میں ہندوستان کی سوتی مال کی برآمد ۱۳ لاکھ پاؤنڈ سے گر کر ایک لاکھ پاؤنڈ رہ گئی۔ یعنی ۱۳ گنا کمی ہو گئی اس کے مقابلے میں ہندوستان میں درآمد ۲۶ ہزار پاؤنڈ کی مالیت کے مال سے بڑھ کر ۴ لاکھ پاؤنڈ کی مالیت تک پہنچ گئی۔ یعنی تقریباً ۱۶ گنا اضافہ ہوا۔ ہندوستان، جہاں سے ایک زمانے میں ساری دنیا کے لیے کپڑا جاتا تھا۔ اب برطانیہ کی ساری برآمد کا ایک چوتھائی درآمد کرنے لگا۔ صرف یہی نہیں کہ مشین کے بُنے ہوئے برطانوی کپڑے نے ہندوستان کے کپڑا بُننے والے جولاہوں کو تباہ کر دیا۔ بلکہ مشین کے بُنے دھاگے نے دھاگہ بٹنے والوں کو بھی فنا کر دیا۔ چنانچہ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۳۶ء کے درمیان سوتی دھاگے کی ہندوستان میں درآمد میں ۵۲ ہزار گنا اضافہ ہوا۔ نتیجہ

کیا ہوا کہ کپڑا بننے والا جولاہا، سوت کاتنے والی آبادی کپڑے کی تجارت کرنے والے تمام افراد اس تباہی سے متاثر ہوئے۔ اس لیے یہ کوئی حیرانی کی بات تو نہیں کہ مومن کانفرنس ہو یا مجلس احرار، جمعیۃ علمائے ہند ہو یا خلافت' ان سب تحریکوں نے ابتداءً اسی نچلے درمیانے طبقے کو متاثر کیا۔ صرف متاثر ہی نہیں کیا۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے اصلاً برطانوی مصنوعات کے بائیکاٹ کا خیر مقدم ہی نہیں کیا بلکہ دل و جان سے قبول کیا۔ اس لیے کہ یہ وہ طبقے تھے جن کو برطانوی مصنوعات نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس لیے وہ برطانوی شہنشاہیت کے ہاتھوں پٹ کر اس کے خلاف لڑ مرنے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ یہ بھی کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ آج بھی جمعیت علماء والے ہوں یا پرانے احراری وہ کھدر کو پسند کرتے ہیں۔ مولانا داؤد غزنوی ہوں یا مولانا احمد علی یا امیر شریعت یہ لوگ آخر دم تک کھدر پہنتے رہے، اس کی وجہ ان کا اس نچلے درمیانے طبقے سے گہرا ناطہ تھا اور یہی ناطہ ان کو آخر دم تک انگریز اور انگریزی زبان دشمنی کی راہ سے نہ ہٹا سکا اور مفتی محمود' مولانا غلام غوث ہزاروی جو آج بھی سامراج دشمنی کے مورچے پر ڈٹے ہوئے ہیں ان کی بنیادی وجہ یہی ان کا وہ پرانے اجڑے ہوئے دستکار اور محروم کسان سے قربت ہے جو ان کو اس مورچے پر ڈٹے رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ تاہم آج کی صورت بہت حد تک مختلف ہے۔ لیکن پہلی جنگ عظیم سے پہلے حالات بہت پریشان کن تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے کمشنر نے جو اپنی رپورٹ مرتب کی تھی' اس میں اس صورت کا نقشہ کھینچا تھا اور لکھا تھا:

"ہندوستان میں ولایت کے بنے ہوئے کپڑے اور برتن بڑی مقدار میں درآمد کیے جا رہے ہیں اور خود ہندوستان میں مغربی نمونے کی بڑی بڑی کمپنیاں قائم کی گئی ہیں، جنہوں نے بہت سی دیہاتی صنعتوں کو کم و بیش تباہ کر دیا۔ زرعی پیداوار کی قیمتیں بڑھ گئیں، جس کی وجہ سے دیہاتوں کے بہت سے دستکاروں نے اپنا خاندانی پیشہ ترک کر دیا اور زراعت کی طرف رخ کرنے لگے۔ دیہات کا پرانا نظام ملک کے مختلف حصوں میں جس رفتار سے ٹوٹ رہا ہے اس میں ہر جگہ فرق ہے جو صوبے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہاں

تبدیلی بھی بہت نمایاں ہے۔

اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں گھریلو صنعتوں کا زوال کس تیزی سے رونما ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء کے درمیان صنعتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد میں ۲۰ لاکھ کی کمی آ گئی حالانکہ آبادی میں ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ چنانچہ ایک طرف گھریلو صنعتوں کی تباہی نے ایک فوج ظفر موج کو بے کاری کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا۔ اس یاس و ناامیدی کی فضا میں ان کے پاس ایک ہی چارہ تھا کہ زراعت میں اپنی قسمت آزمائی کریں۔ لیکن زراعت میں پہلے ہی بوجھ زیادہ تھا۔ یہ صورت حال تھی، جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا اعلان ہوا۔

فوجی بھرتی

اس اعلان جنگ کا مطلب کیا تھا کہ ہندوستان برطانیہ کی پوری مدد کرے۔ اس امداد کی سب سے پہلی صورت یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ نوجوان فوج میں بھرتی ہو کر محاذ جنگ پہ جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے پنجاب کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ کیوں کہ اس برصغیر میں پنجاب فوج کی بھرتی کا سب سے اہم مرکز تصور ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ تھا بھی، چنانچہ پہلی جنگ عظیم کا اعلان جیسے ہی ہوا اس کے فوراً بعد ہندوستان میں فوجی بھرتی کا کام شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کے آخری چار مہینوں میں فوج میں بھرتی ہونے والوں کی پوری کھیپ ۲۸ ہزار نوجوانوں پر مشتمل تھی، یہ تعداد پورے ہندوستان سے بھرتی کی گئی تھی لیکن ان ۲۸ ہزار میں نصف یعنی ۱۴ ہزار صرف پنجابی نوجوان تھے۔ اسی طرح ۱۹۱۵ء کے پورے سال میں ۹۳ ہزار رنگروٹ پورے ہندوستان سے بھرتی ہوئے ان میں سے پھر نصف یعنی ۴۶ ہزار پنجابی تھے، ۱۹۱۶ء کے آخر تک پورے ملک سے دو لاکھ پچیس ہزار نوجوان فوج میں بھرتی کیے جا چکے تھے، ان میں سے پنجابی نوجوانوں کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار تھی۔ مئی ۱۹۱۷ء میں بین الاقوامی حالات خاصے مخدوش ہو گئے۔ اور برطانیہ کو مختلف محاذوں پر سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ برطانیہ کو مزید فوجوں کی اشد ضرورت پڑی اس مقصد کے لیے اس

نے فوجی بھرتی کا ایک مرکزی بورڈ قائم کیا۔ اس بورڈ نے اعلان کیا کہ پورے ہندوستان سے مزید چار لاکھ آسی ہزار جوان بھرتی کیے جائیں گے۔ اس کے بعد دسمبر ۱۹۱۷ء تک ہندوستان بھر سے ایک لاکھ ۸۶ ہزار جوان بھرتی ہوئے ان میں سے ۹۵ ہزار پنجابی تھے۔ اور ۱۹۱۸ء میں پورے ہندوستان سے تین لاکھ سترہ ہزار جوان بھرتی کیے گئے ان میں سے ایک لاکھ ۴۴ ہزار پنجابی تھے، لیکن اس فوجی بھرتی کے لیے پنجاب کے بسنے والوں کو جن مظالم کو برداشت کرنا پڑا وہ ایک المناک داستان ہے اور در اصل کانگرس اور خلافت کی عدم تعاون کی تحریک کے شعلوں کی تہ میں انہی مظالم کی چنگاریاں ہی تھیں، جنہوں نے پنجاب کے دیہاتی اور گھریلو دستکار کو خلافت کے نام پر انگریز کی غلامی کا جُوا اتار پھینکنے پر مجبور کیا۔ ان مظالم کے ضمن میں بے شمار شہادتیں اور دستاویزات موجود ہیں اور تو اور خود انگریز مصنفوں نے بھی اس سلسلے میں اس وقت کے گورنر اوڈوائر کی زیادتیوں اور جبرہ دستیوں کو تسلیم کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ خود اوڈوائر نے اپنی خود نوشت سوانح میں اپنی افتادِ طبع پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ فوجی بھرتی کے سلسلے میں اس کا حکم ایک آمر کا حکم تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد صوبے کی پوری نوکر شاہی حرکت میں آ جاتی تھی۔ اس پر کہ ڈاکٹر عاشق بٹالوی نے اپنی اہم ترین کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں اس دور کی جبرہ دستیوں پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ضلع کا ڈپٹی کمشنر افسر مال کے سر پر، افسر مال تحصیلدار کے سر پر، اور تحصیلدار نمبردار کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ جوانوں کی مطلوبہ تعداد جہاں سے بن پڑے اور جس طرح ممکن ہو، مہیا کی جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پورے گاؤں کو سرکاری اہل کار نرغے میں لے لیتے تھے اور ساری آبادی کو گھروں سے نکال کر قطار میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ جس جوان کی طرف سرکار کی انگلی اُٹھ جاتی تھی، اسے پابجولاں ضلع کے صدر مقام میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اور وہ رضاکارانہ طور پر بھرتی کیا ہوا رنگروٹ تصور ہوتا تھا۔"

حکومت کے جابرانہ طرزِ عمل سے پنجاب میں بے شمار فساد ہوئے دیہات

کے باشندوں نے مشتعل ہو کر بھرتی کرنے والے افسروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے بلوے ہونا شروع ہو گئے اور بعض جگہ گاؤں کی پوری آبادی کو گرفتار کر کے عدالتوں میں پیش کر دینا پڑا۔

ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں جب بھرتی کے افسروں نے لوگوں پر بہت زیادہ تشدد کیا۔ تو مشتعل ہجوم نے نائب تحصیلدار اور اس کے عملہ پر حملہ کر دیا۔ بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ جن میں باون ملزموں پر زیر دفعہ ۱۴۷ تعزیرات ہند مقدمہ چلا۔ ابتدائی عدالت نے ان کو سزا دے دی۔ لیکن سیشن جج مسٹر کولڈ سٹریم نے (جو چند سال بعد لاہور ہائیکورٹ کے جج بن گئے تھے) سب کو بری کر دیا۔ مسٹر کولڈ سٹریم نے جو فیصلہ لکھا اس کے چند فقرے درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

"لوگوں کو سرکار کے خلاف سچی اور حقیقی شکایتیں ہیں اور وہ اپنی تکلیفوں کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ ضلع مظفر گڑھ کے ماتحت افسروں نے رنگروٹوں کی بھرتی اور جنگی فنڈ کے سرمائے کی فراہمی کے سلسلے میں نمبرداروں اور ذیلداروں پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا ہے۔ چنانچہ ان نمبرداروں اور ذیلداروں کو مجبوراً ایسے قابل اعتراض طریقے اختیار کرنا پڑے جن سے ضلع کے اکثر مقامات پر فسادات رونما ہوئے یہ بہر صورت تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ قابل اعتراض طریقے جو حد درجہ تشدد آمیز بھی تھے۔ حکومت کے ایما اور منشا کے خلاف تھے، تاہم ضلع کے دُور دراز مقامات پر یہ تشدد ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔"

ضلع شاہ پور میں جب فساد برپا ہوا اور گاؤں کی آبادی نے بھرتی کے خلاف افسروں پر قاتلانہ حملے شروع کیے تو بے شمار لوگوں پر مقدمات چلائے گئے۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں عجیب و غریب باتوں کا انکشاف ہوا۔ مثلاً یہ کہ جب عوام بخوشی بھرتی ہونے سے انکار کرتے تھے، تو گاؤں کے تمام باشندوں کو گھروں سے باہر کھڑا کر کے مردوں کو عورتوں

کے سامنے برہنہ کر دیا جاتا تھا۔ جس کنبے میں تین یا چار بھائی تھے ان میں سے زبردستی دو بھائیوں کو بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ بیویوں کو خاوندوں سے جدا کر کے دور کسی اور مقام پر بھیج دیا جاتا تھا۔ اور جب تک ان کے خاوند خود بھرتی ہونے یا اپنے عزیزوں کو بھرتی کرانے پر رضامند نہیں ہو جاتے تھے۔ عورتوں کو واپس گھر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

کرنال کے ایک گاؤں میں جب زبردستی بھرتی شروع ہوئی۔ تو ایک شخص نے مجسٹریٹ کی منتیں کیں کہ اس کا اکلوتا بچہ ہے رحم کیجئے اور بھرتی نہ کیجئے۔ لیکن مجسٹریٹ نہ مانا نتیجہ یہ نکلا کہ گاؤں میں سخت فساد ہوا اور بے شمار آدمیوں کی گرفتاری عمل میں آئی جن میں سے پانچ کو عدالت نے سزا دی۔ اپیل میں وہ بری ہو گئے۔ عدالت اپیل نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ :

"ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے وقتاً فوقتاً جو احکام صادر کیے ان میں سے یہ بات قطعی ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر یہ اپیل کنندگان اپنے قریبی رشتہ داروں کو فوج میں بھرتی کرا دیتے یا خود بھرتی ہو جاتے تو ان سے آسانی درگزر کی جاتی۔"

اسی طرح پنجاب کے مختلف اضلاع میں دیہاتیوں کی بے چینی بڑھنے لگی اور جبر و تشدد سے تنگ آئے ہوئے لوگ فساد پر آمادہ ہو گئے جونہی خبر اڑتی کہ بھرتی کا افسر آ رہا ہے گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے گھروں اور کھیتوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے، کئی مرتبہ سرکاری افسر گھروں کو لوٹ لیتے اور فصلوں کو تباہ کر دیتے تھے۔

اس سلسلے میں سر مائیکل اوڈوائر کی ایک تقریر کا حوالہ دینے پر مجبور ہوں۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ بھرتی کے بارے میں اس کا اپنا رویہ کیا تھا۔ ۴ مئی ۱۹۱۶ء کو اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا :

"پنجاب سے دو لاکھ رنگروٹ درکار ہیں، اگر لوگ خوشی سے بھرتی نہیں ہوں گے تو ہم جبری بھرتی کریں گے۔ بعض علاقوں میں لوگ بھرتی ہونے سے جی چراتے ہیں، ہم اس صورت حال کا اچھی طرح مقابلہ کرنے کو تیار ہیں ہم پنجاب سے رنگروٹوں کی ایک مقررہ تعداد مہیا کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں"

لہٰذا اس وعدے کا ایفا ضروری ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب کم ازکم پنجاب میں اکثر لوگ جبری بھرتی کے حامی بنتے جارہے ہیں، مثلاً اگر ہر دس پندرہ یا بیس جوان آدمیوں میں سے ایک آدمی بھرتی کر لیا جائے تو یہ شرح بری نہیں ہوگی۔ مرکزی حکومت نے ہندوستان کے ہر صوبے کے ذمے رنگروٹوں کی ایک خاص تعداد مقرر کردی ہے۔ میری رائے ہے کہ اگر یہ تعداد رضاکارانہ بھرتی سے مہیا نہ ہوئی تو پھر اور قسم کے ذرائع اختیار کرنا پڑیں گے۔"

یہ اور قسم کے ذرائع کیا تھے؟ ان میں سے کچھ تو سطور بالا میں بیان کیے جاچکے ہیں دو ایک مزید واقعات بیان کردیئے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ داستان طویل ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس شخص کے اعمال کا تجزیہ بے حد ضروری ہے جو اپنے آپ کو دیہاتیوں کا ہمدرد اور خیرخواہ کہتے ہوئے تھکتا نہیں تھا۔ اور جس نے اپنی مذموم کوششوں سے پنجاب کی مسلمان آبادی کو اس طرح دو مخالف حصوں میں تقسیم کردیا تھا کہ اس کے اثرات نے ربع صدی تک ہمیں مبتلائے رنج و محن کئے رکھا۔

گوجرانوالہ کے ایک معزز مسلمان زمیندار نے تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ:-

"بیساکھی کے مہینے میں تحصیلدار ہمارے گاؤں میں آیا اور رات ہی رات ڈھنڈورا پٹوادیا کہ صبح تمام لوگ ڈیرے پر حاضر ہوں ایک تو فصلوں کی کٹائی کے دن تھے، دوسرا یوں بھی لوگ ڈرتے تھے کہ انہیں زبردستی بھرتی کرلیا جائے گا۔ صبح ہوئی تو بہت کم آدمی ڈیرے پر حاضر ہوئے۔ چنانچہ تحصیلدار سخت ناراض ہوا اور اس نے ساٹھ ستر آدمیوں کو جرمانہ کردیا جس کی مجموعی رقم سولہ سو روپے تھی۔ پھر تحصیلدار نے حکم دیا کہ گاؤں کے لوگ ضلع کے صدر مقام گوجرانوالہ میں حاضر ہوں جو ہمارے گاؤں سے اٹھارہ میل دور ہے۔ جب مقررہ تاریخ کو لوگ وہاں گئے تو سب کو قطار میں کھڑا کر کے سات جوانوں

کو فوجی بھرتی کیلئے چن لیا اور باقی آدمیوں کو مارا اور گالیاں دیں اور کہا کہ بھرتی کے لیے اور جوان لے کر آؤ۔

اگر ہم پنجاب کے مختلف اضلاع میں فوجی بھرتی کے مدوجزر کے نقشے کا بغور مطالعہ کریں تو ایک عجیب بات ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً کسی ضلع میں آج بھرتی معمول کے مطابق ہے تو چند مہینوں کے اندر وہاں بھرتی ایک دم اس قدر تیز ہو جاتی کہ معلوم ہوتا ہے گویا لوگ دیوانہ وار فوج کی طرف لپک لپک کر جا رہے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی سبب تھا اور وہ یہ کہ اگر ضلع کا حاکم ناجائز ذرائع استعمال کرنے اور جبر و تشدد کو روا رکھنے کا حامی نہ ہوتا تھا تو اوڈوائر اس کو فوراً تبدیل کر کے وہاں کسی ایسے آدمی کو متعین کر دیتا تھا جو اس کے ایما کے مطابق بھرتی میں برے بھلے طریقوں میں امتیاز کرنے کا قائل نہ تھا۔

چنانچہ دسمبر ۱۹۱۷ء کے آخر میں ضلع ملتان کے رنگروٹوں کی تعداد ۷۵۹ تھی۔ گویا ضلع کی آبادی کے ہر ۵۰۶ مردوں میں سے ایک رنگروٹ بھرتی ہوا۔ لیکن سال بھر کے اندر یعنی نومبر ۱۹۱۸ء میں رنگروٹوں کی کل تعداد ۴۶۳۹ ہو گئی۔ گویا ہر ۹۲ مردوں میں سے ایک رنگروٹ لیا گیا۔ اسی طرح اوڈوائر نے دیکھا کہ گوجرانوالہ کے لوگ رضاکارانہ طور پر بھرتی ہونے میں تامل کرتے ہیں، تو اس نے اپنے خاص آدمی کرنل اوبرائن کو وہاں ڈپٹی کمشنر مقرر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۷ء تک تو گوجرانوالہ کے رنگروٹوں کی تعداد ۳۴۸۰ تھی، لیکن اگست ۱۹۱۸ء میں یہ تعداد یکایک ۱۱۷۶۵ تک پہنچ گئی۔ گویا ایک ہی سال میں ساڑھے آٹھ ہزار رنگروٹ بھرتی ہو گئے۔

دیہات کے معززین کی جان عذاب میں آئی ہوئی تھی، نمبرداروں اور ذیلداروں پر آئے دن سرکار کا تازیانہ برستا تھا۔ کہ اور رنگروٹ لاؤ، جن نمبرداروں سے کسی قسم کی معذوری کا اظہار ہوا۔ ان کی نمبرداریاں ضبط کر لی گئیں۔ پولیس حفظ امن میں ان لوگوں کا بے دریغ چالان کر دیتی تھی۔ اور مجسٹریٹ ضمانت لینے کی بجائے انہیں فوراً حوالات میں بند کر دیتے تھے اور جب تک وہ بدبخت رنگروٹوں کی بھرتی کا وعدہ نہ کرتے انہیں رہا نہیں کیا جاتا تھا

اوڈوائر نے شہری اور دیہاتی آبادی کے درمیان ایک آہنی پردہ ڈال دینے کی کوشش

کی تھی، تاکہ دیہات میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی ہوا شہروں میں نہ پہنچنے پائے۔ لیکن جب دیہاتیوں پر پیہم سختیاں ہونا شروع ہوئیں اور جگہ جگہ فساد پھوٹ پڑے تو صوبے میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہلوسے کے ایک ایک مقدمہ میں پولیس نے بیک وقت سوسو، دو دو سو آدمیوں کا چالان کر دیا تھا۔ جب یہ مقدمات ابتدائی عدالتوں سے ہوتے ہوئے صوبے کی عدالت عالیہ تک پہنچے اور صفائی کی طرف سے قابل وکلا پیش ہوئے تو راز ہائے درون پردہ کھلنا شروع ہوئے۔

سر فضل حسین نے جو دو مقدموں میں ملزموں کی طرف سے پیش ہوئے تھے۔ ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا۔

سوال: "جن مقدمات میں آپ پیش ہوئے تھے، ان کی ابتدا کیونکر ہوئی تھی۔؟"

جواب: "یہ دونوں مقدمات ضلع شاہ پور سے آئے تھے، ایک مقدمے میں ملزموں کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی جن کے خلاف یہ الزام تھا کہ انہوں نے جبری بھرتی کی مخالفت کی ہے۔"

سوال: "کیا ہلوسے کے ایک مقدمے میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا چالان کر دیا گیا تھا!؟"

جواب: "جی ہاں۔"

سوال: "واقعات کیا تھے۔؟"

جواب: "مجھے اس وقت گاؤں کا نام یاد نہیں۔ یہ گاؤں ضلع شاہ پور میں ہے اور غالباً سرگودھا سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ ان ڈیڑھ سو ملزموں میں سے ایک بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اور جب سے پنجاب میں انگریزی حکومت قائم ہوئی ہے اس گاؤں کا صرف ایک آدمی سرکاری ملازمت میں گیا ہے۔ ملزموں پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا گیا تھا۔ لیکن وہ بھرتی پر آمادہ نہ ہوئے۔"

سوال: "کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ خود ان ڈیڑھ سو ملزموں کو بھرتی ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔؟"

جواب: "جی نہیں، گاؤں کے تمام باشندوں پر جن کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔"

دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔"

سوال: "کیا رنگروٹوں کی کوئی خاص تعداد طلب کی جا رہی تھی۔؟"

جواب: "جی نہیں! کوئی خاص تعداد مقرر نہیں تھی۔ چونکہ اس گاؤں سے کوئی آدمی بھرتی نہیں ہوا تھا۔ اور حکومت زبردستی بھرتی کرنے پر تلی ہوئی تھی اور لوگ بھرتی سے بار بار انکار کرتے تھے، اس لیے حکومت نے یہ خیال کیا کہ گاؤں کے لوگوں نے سازش کر لی ہے۔ چنانچہ حکومت نے قانون تحفظ ہند کے تحت یہ قدم اٹھایا۔"

سوال: "تو کیا حکومت نے یہ قدم گاؤں کی پوری آبادی کے خلاف اٹھایا تھا۔؟"

جواب: "جی نہیں! گاؤں کے چند آدمیوں کے خلاف۔"

سوال: "کیا حکومت نے یہ اقدام اس بنا پر کیا تھا کہ یہ چند آدمی بھرتی کی مخالفت کر رہے ہیں؟"

جواب: "جی ہاں ان چند آدمیوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے لیکن گاؤں والوں نے انہیں پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر فوج بھیجی گئی اور جب فوج نے گاؤں میں جاکر ادھم مچایا تو بلوہ ہو گیا۔"

سوال: "تو کیا اس بلوے میں ان ڈیڑھ سو آدمیوں کا چالان ہوا تھا۔"

جواب: "جی ہاں۔"

سوال: "پھر کیا ہوا؟"

جواب: "اپیل میں اکثر بری ہو گئے اور چند ایک کو سزا مل گئی۔"

اقتصادی اثرات

پنجاب کی معیشت پر اس فوجی بھرتی کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ بہت ہی مہلک تھے۔ ایک طرف دیہات اور شہر کا چھوٹا صنعت کار پہلے ہی برطانوی مصنوعات اور مشینوں کے ہاتھوں پٹ چکا تھا دوسری طرف فوجی بھرتی نے پنجاب کو غذائی بحران سے بھی دوچار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جس زرعی صوبے کی زراعت پیشہ آبادی کا تمام نوجوان طبقہ کھیتوں سے

انگریز فوجی بھرتی کے مرکزوں پر لے جایا جائے۔ اور وہاں سے ان کو جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا جاتے۔ وہاں کی زراعت کا تباہ ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۱۸ء ۱۹۲۲ء کے سالوں میں غذائی قلت کا شدید سامنا کرنا پڑا تھا۔ ۱۹۱۷ اور ۱۹۱۸ء کے سال میں گندم کی پیداوار نوے لاکھ ۹۰ ہزار ٹن تھی اور چاول کی پیداوار ۳ کروڑ پچاس لاکھ ۹۰ ہزار ٹن تھی۔ لیکن اس سے اگلے سال یعنی ۱۹-۱۹۱۸ میں گندم کی پیداوار نوے لاکھ ۹۰ ہزار ٹن سے گھٹ کر ۷۵ لاکھ ٹن رہ گئی۔ اسی طرح چاول کی پیداوار میں بھی تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ ٹن کی کمی واقع ہوئی۔ لیکن اس کمی کے باوجود غذائی اجناس کی برآمدات میں کوئی کمی نہیں ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں قحط کے اثرات مرتب ہونے لگے اور اس میں پنجاب پیش پیش تھا۔ اور ساتھ ہی انفلوئنزا کی وبا پھوٹ پڑی۔ چنانچہ پنجاب میں اس وبا سے متاثر ہونے والوں کے بارے میں جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ ان کے مطابق اس وبا سے متاثر ہونے والوں میں ۵ فیصد یورپی باشندے تھے، ۲ فیصد پنجابی امراء تھے۔ اور دیہاتی آبادی میں ۵ فیصد سے زائد باشندے اس وبا سے متاثر ہوئے۔ پورے ہندوستان میں قحط اور وبا کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کی تعداد سوا کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اور ان اموات کے بعد غذائی اجناس کی پیداوار میں اور بھی کمی ہو گئی۔ اور اس کمی نے غذائی اجناس کی قیمتوں میں بلا کا اضافہ کر دیا۔ چنانچہ گندم کی قیمتوں کے رجحان کا گوشوارہ شدید معاشی بحران کی نشاندہی کرتا ہے۔

سال	گندم کی فی من قیمت (روپے — آنے)
۱۹۱۳ء	۳ — ۱۳
۱۹۱۴ء	۴ — ۵
۱۹۱۸ء	۵ — ۱۵
۱۹۱۹ء	۷ — ۵
۱۹۲۰ء	۷ — ۱۰
۱۹۲۱ء	۷ — ۱۲

ان قیمتوں میں اضافے کی پشت پر قلت کے ساتھ ساتھ ذخیرہ اندوزی، سٹہ بازی اور برآمد پوری طرح کارفرما تھیں۔ نتیجہ اس وقت بھی یہی تھا۔ جو آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کاشتکار کو توفوری طور پر اپنی ضروریات کے لیے فصل کو بازار میں لانا پڑتا تھا اور آڑھتی اونے پونے اس سے خرید لیتا تھا اور پھر اس کو اپنے گذر بسر کے لیے مہنگے داموں خریدنا پڑتا تھا۔ گندم جو پنجاب کے بسنے والوں کی غذا ہے کی مہنگائی نے دیہاتی اور شہر کی غریب آبادی کو شدید طور پر متاثر کیا۔ چنانچہ چھوٹے زمیندار اس معاشی بحران سے تنگ آکر اپنی اراضی کو بڑے اور متمول زمینداروں کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ پنجاب میں ایسے زمیندار جو مزارعوں کی کمائی پر گذر کرتے تھے ان کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ جنگ سے پہلے ایسے زمینداروں کی تعداد ۶ لاکھ ۲۶ ہزار تھی، مگر جنگ کے بعد ۱۹۲۱ء میں یہ تعداد ۱۰ لاکھ ۸ ہزار تک پہنچ گئی۔

اس زمانے میں ہندوستان بھر میں دیہی زندگی کی بربادی کا نقشہ بہت ہی اندوہناک ہے۔ لیکن مجھے اس وقت صرف پنجاب میں معاشی بحران کا ذکر کرنا ہے۔ اب اس دور میں جب ایک افتاد دوسری افتاد کو جنم دے رہی تھی اور اسی سلسلہ ہائے افتاد کی ایک کڑی ساہوکاروں کی دھاندلی تھی۔ اور مالک کسانوں کی مالی پریشانیاں، جن کے بل پر یہ ساہوکار کاشتکار اور مالک کسان سے زمین ہتھیا لیتا ہے۔ ان تمام مصائب اور معاشی محرومیوں کا ذکر تو تفصیل سے کرنا اور ضروری ہے کہ ہمارے ہاں تحریکوں کے ظاہری نعروں اور اوپر کی خوبیوں کو دیکھ کر ہی تحریکوں کے متعلق تجزیہ کر لیا جاتا ہے اور کوئی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ پنجاب اور دیگر طبقے کے مسلمانوں، دیہات کے کسانوں، گھریلو دستکاری کے پیشے سے متعلق لوگوں نے ہزاروں میل دور کی خلافت عثمانیہ کی بقا کے لیے جو جیل جانا منظور کیا تھا۔ تو وہ صرف خلافت عثمانیہ کے لیے نہ تھا۔ بلکہ وہ تو انگریز اور اس کی چیرہ دستیوں کے خلاف احتجاج تھا۔ جو کبھی خلافت عثمانیہ کی حفاظت کے روپ میں ظاہر ہوا تو کبھی غازی امان اللہ خاں کی امداد کی صورت میں اور کبھی ہجرت کی شکل میں، دراصل یہ تمام تحریکیں اپنی ظاہری شکل و صورت کے باوجود انسانوں کی مسلسل معاشی پریشانیوں کا مظہر تھیں۔

اس لیے تحریکوں کے ظاہری نعروں اور دعووں کے پیچھے کام کرنے والے مختلف عوامل کو
سمجھنا لازمی اور لابدی ہے۔

اس پس منظر میں پنجاب میں فوجی بھرتی، گھریلو دست کاری کی تباہی زرعی بحران
ور اس پر ساہوکاروں کی اندھیر گردی، سب نے مل کر خلافت اور کانگرس کی عدم تعاون
تحریک کا قوام تیار کیا۔

"ساہوکارا اور قرض ہندوستان کے سماج کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں لیکن
سرمایہ داری اور خاص طور سے سامراجی لوٹ کے دوران ساہوکار کی حیثیت بہت بدل
ئی ہے اور اس کی لوٹ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے پہلے کسان کو قرضہ صرف اپنی شخصی ضمانت
ملتا تھا اور اس لیے ساہوکاری کا کاروبار نہایت غیر محفوظ اور خطرناک تھا۔ وہ جو کچھ لین دین
تا تھا اس پر گاؤں کی پنچایت کی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ پرانے قانون کے مطابق قرض
اہ اپنے قرض دار کی زمین پر قبضہ نہیں کرسکتا تھا۔ برطانوی حکومت میں یہ سب قاعدے
ل گئے اس نے جو قانون جاری کیا اس میں قرض خواہ کو قرقی کا حق دار اور زمین منتقل کروا
نے کا اختیار دے دیا اور اس کی وجہ سے ساہوکار کے لیے لوٹ کا میدان کھل گیا حکومت
ے اس کی پشت پناہی کے لیے قانون اور پولیس کا ڈنڈا بھی مہیا کر دیا اور اس طرح اسے
ی سرمایہ داری لوٹ کھسوٹ میں ایک لازمی اور مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس
ے کہ ساہوکار نہ صرف مال گذاری کی وصولی میں ایک ضمیمہ وسیلہ بنتا ہے بلکہ وہ ساہوکاری
ساتھ غلے کی تجارت بھی کرتا ہے۔ وہ فصل کٹنے کے بعد سارا غلہ خرید لیتا ہے اس کو پوری
رت کا اجارہ حاصل رہتا ہے وہ اکثر بیج اور آلات کے لیے کچھ پیشگی رقم بھی دیتا ہے
ن اپنی جہالت کی وجہ سے بھی اس کے حساب کتاب کا پتہ نہیں چلا سکتے اور اس طرح
دل بھر کے لوٹتا ہے اور یہ اس کے چنگل میں پھنستے چلے جاتے ہیں وہ گاؤں کا حاکم مطلق
جاتا ہے اور اس قرضہ میں زمینیں ساہوکار کے پاس منتقل ہو جاتی ہیں تو پھر یہ لوٹ کا
وبار ایک منزل اور آگے بڑھتا ہے۔ کسان کھیت مزدور بن جاتے ہیں۔ یا بٹائی پر اسی
ن پر کاشت کرتے ہیں۔ اور پیداوار کا بڑا حصہ لگان اور سود کی مدوں میں نذر کر دیتے

ہیں۔ اور وہ ہندوستانی دیہاتوں کی معاشی زندگی میں چھوٹے سرمایہ دار کی حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے اور کسان اس کے مزدور بنتے جاتے ہیں۔ شروع شروع میں کسانوں کا غصہ ساہوکاروں پر اترتا ہے اس لیے کہ بظاہر وہی ان کی اصل تباہی کی جڑ معلوم ہوتا ہے اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ بعض اوقات ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ اور صدیوں سے مصیبت اٹھانے والے کسان تنگ آکر ان ساہوکاروں کو قتل کر دیتے ہیں۔ لیکن انہیں جلد یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ ساہوکار کی پشت پر پورا انگریزی راج ہے ساہوکار مالیاتی سرمایہ کی لوٹ کی مشین میں ایک اہم نچلا پرزہ ہے۔

جب ساہوکار کی لوٹ اپنی حد سے بڑھ جاتی ہے تو حکومت اس کی روک تھام پر ہوجاتی ہے کہ کہیں سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ہی نہ مر جائے اور خود اس کی لوٹ خطرہ میں آجائے۔ سود کی شرح گھٹانے اور زمین کو منتقل ہونے سے روکنے کے لیے بے قوانین بنائے گئے ہیں لیکن حکومت کو ماننا پڑا کہ یہ قانون سب ناکام ثابت ہوئے زرعی کمشن کی رپورٹ میں "قانون کی ناکامی" صفحہ ۳۷-۴۳۶ اس میں بتایا گیا ہے کہ کو بڑھنے سے روکنے کے لیے کیا قانون بنائے گئے اور وہ کس طرح ناکام ہوئے) او کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ قرض کی مقدار بڑھنے سے رکی ہی نہیں بلکہ اس میں اور کہیں زیادہ تیز رفتاری سے ہو رہا ہے۔

برطانوی حکومت کے زمانہ میں ہندوستان کے کسانوں کی قرض داری میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کی تفصیلی تحقیقاتی رپورٹ ایم ایل ڈارلنگ کی کتاب "پنجاب کے کسان اور اس کی خوشحالی اور قرض داری" ملتی ہے یہ کتاب ۱۹۲۵ء میں چھپی تھی اس کی دو انگریزی کتابوں "رسٹی کس لاکوئٹر" ۱۹۳۰ء اور "وسڈم اینڈ ویسٹ ان پنجاب" ۱۹۳۴ء میں اور زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ مصنف کا رجحان اگرچہ یہ ہے کہ سامراج کی ... کرے لیکن واقعات خود اصل حقیقت پیش کر دیتے ہیں اپنی پہلی کتاب میں نے بتایا ہے کہ انگریزوں کے آنے کے بعد سے پنجاب میں قرضداری کس طرح بڑھی زمین رہن رکھوانے کا طریقہ جو سکھوں کے زمانے میں شاذ ہی نظر

آتا تھا۔ اب ہر گاؤں میں عام ہوگیا ہے۔ ۱۸۷۸ء تک سارے صوبہ کا ۷ فیصدی رقبہ رہن ہو چکا تھا۔ ۱۸۸۰ء میں زمین کے مالک کسان اور ساہوکار کی غیر مساوی لڑائی کا فیصلہ ہوگیا اور ساہوکار کو زبردست کامیابی ہوئی ....
تیس سال تک ساہوکار اپنے انتہائی عروج پر رہا۔ اس نے اپنی دولت میں بے حد اضافہ کیا اور بہت مالدار اور خوش حال بن گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنکوں اور ساہوکاروں کی تعداد (ان کے لواحقین کو شامل کر کے) ۱۸۶۸ء میں ۵۳۲۶۳ اور ۱۹۱۱ء تک بڑھ کر ۱۹۳۸۷۰ ہوگئی۔"

(پنجاب کا کسان اس کی خوشحالی اور قرضداری : از : ڈارلنگ)

مسٹر ڈارلنگ کا یہ خیال تھا کہ ساہوکار ۱۹۱۱ء تک اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ اور ۱۹ء میں زرعی کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے انہوں نے یہ امید ظاہر کی۔ پنجاب میں باقی ساہوکار سوائے دو ضلعوں کے ہر جگہ اپنا کاروبار آہستہ آہستہ کم کر رہا ہے اور اس کی اصل وجہ ہے کہ امداد باہمی کی تحریک نے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی ہے کسان قرض دار قانونی حفاظت کی گئی ہے اور ساہوکار پر قانونی پابندیاں لگائی گئی ہیں) (رپورٹ صفحہ ۴۴۲)
ان چند ہی سال بعد جب انہوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنی کتاب رسٹی کس لاکو میٹڑ شائع کی تو وقت تک اگرچہ اس کا لہجہ پُرامید رہا ہے۔ لیکن پھر بھی اسے خطرہ کی گھنٹی بجانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ:

انتقال زمین کے قانون کے باوجود اس کا خطرہ موجود ہے کہ کسانوں کے ہاتھ سے پھر بڑے پیمانے پر زمینیں نکلنے لگیں، مغربی پنجاب میں ابھی سے اس کی علامتیں ہیں اور یہاں بڑے جاگیردار اس قانون سے فائدہ اٹھا کر اس کوشش میں ہیں کہ کسانوں کی زمینیں اپنے قبضے میں کر لیں۔

۱۹۳۵ء میں پنجاب کے مال افسر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

"دیہاتی علاقوں میں کسان ساہوکار طاقت حاصل کر رہے ہیں"۔

(پنجاب کے محکمہ مال کی انتظامی رپورٹ ۱۹۳۵ صفحہ ۶)

پنجاب میں مسٹر ڈارلنگ نے ۱۹۱۹ء میں جو تحقیقات کی تھی اس میں انہیں پتہ چلا تھا کہ صرف ۱۷ فیصدی زمین کے مالک ایسے تھے جو قرضہ سے بری تھے اور اوسطاً قرضہ ۴۶۳ روپیہ تھا۔ یعنی مالگزاری کا بارہ گنا۔

یہ صورت حال تھی جس نے دیہات کے کسان دستکار، شہر کے چھوٹے دکان دار چھوٹے ملازم پیشہ اور بیروزگار نوجوانوں کو بغاوت کا پرچم بلند کرنے کے لیے اکسایا۔ چنانچہ یہی وہ لوگ تھے جو تحریک خلافت کے روح رواں بنے اور اسی نے پنجاب کے مسلمانوں کے نچلے درمیانے طبقے اور اوپری طبقے کے جذبات و احساسات اور ان کے اظہار کے طریقے میں مختلف راہیں کھولدیں۔ نچلے درمیانے طبقے کے مختلف عناصر نے کھلم کھلا انگریز کے خلاف محاذ قائم کیا۔ کبھی اسنے ڈنڈا فوج بنائی اور کبھی اسنے ریل کی پٹڑی اکھاڑی اور کبھی انگریز کے بنک لوٹنے سے بھی گریز نہ کیا۔ اس کے مقابلے میں بڑے زمیندار، بڑے بیرسٹر اور شہری معززین نے انگریز سے صلح اور آشتی کی راہ اختیار کی۔ یہ دراصل دو متحارب طبقوں کی متحارب پالیسیاں تھیں۔ چنانچہ پنجاب میں فضل حسین جیسا کانگرسی ہو یا سر شفیع جیسا مسلم لیگی، سبھی نے کھلی بغاوت کی راہ اختیار کرنے سے گریز کیا۔ ان کے اندرونی جذبات کچھ ہوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس وقت ہی قوم پرست مسلمان اور مسلم لیگی مسلمان کی بنیاد پڑی۔ یہ دراصل کوئی سیاسی تفریق نہ تھی، بلکہ ایک طرح سے طبقاتی تفریق تھی، یہ نچلا درمیانہ طبقہ جو خلافت کا روح رواں تھا۔ اس کے لیے انگریز دشمن نمبر ایک ٹھہرا اس لیے وہ سب سے پہلے اس سے ٹکرانا اور اس سے گلو خلاصی چاہتا تھا اس لیے بھی کہ ان لوگوں نے اپنے تجربے سے سیکھا تھا کہ ان کی معاشی محرومی کا براہ راست ذمہ دار انگریز ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں بڑا زمیندار اور شہری معززیہ محسوس کرتا تھا کہ انگریز کے سائے میں ہی وہ ہندو کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کو اور اس کے بھائی بیٹوں کو انگریز کی ملازمت میں مسابقت انگریز سے نہیں بلکہ ہندو سے پڑتی تھی۔ لہٰذا اس کے لیے دشمن نمبر ایک ہندو ٹھہرا اور دشمن نمبر ۲ انگریز قرار پایا۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو وہ انگریز کو اس وقت تک قائم دائم دیکھنا چاہتا تھا جب تک کہ وہ ہندو کے برابر نہ ہو جائے۔ چنانچہ پنجاب کا پڑھا لکھا مسلمان جس کا مقدر سول سیکرٹریٹ کی ملازمت تھی۔ وہ اس زمانے میں ایک طرف

اگر علامہ اقبال کے شعروں سے جذبہ اور توانائی حاصل کرتا تھا تو دوسری طرف سر فضل حسین کی زندگی کے لیے دعائیں مانگتا تھا۔ کیونکہ وہ ملازمتوں میں مسلمانوں کے تحفظ کی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اسی طبقاتی بُعد نے دونوں کو مختلف فلسفے اور مختلف طریق کار اپنانے پر مائل کیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خلافت کمیٹی کے اندر بھی یہ احرار کا گروہ بحیثیت نچلے درمیانے طبقے کے نمایندوں کے مصروف جہد رہا۔ اور پہلے دن سے ہی اس گروہ کو اپنی غریبی پر ایک ناز رہا۔ خلافت کمیٹی کے اندر کی جدوجہد کا ذکر خود چودھری افضل حق، کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"پنجاب خلافت کمیٹی جو مجلس مرکزیہ کے جسم کے لیے روح کا حکم رکھتی تھی، غیر ارادی و غیر شعوری طور سے اس کے اپنے اندر دو گروہ موجود تھے۔ خلافت پنجاب کا طبقہ اعلےٰ یعنی حاکم گروہ اور تھا اور طبقہ اُدنےٰ یعنی حکم بردار گروہ اور۔۔۔ حاکم گروہ رنڈی کے پوت اور سوداگر کے گھوڑے کی طرح کام چور اور آرام طلب تھا۔

طول و عرض ہند میں بھاگ دوڑ کا کام طبقہ اُدنےٰ کا کام تھا۔ طبقہ اعلیٰ کو اپنے گروہ کے موجود ہونے کا علم تھا۔ لیکن طبقہ اُدنےٰ کو الگ احساس خودی نہ تھا۔ اس کا ہر فرد اپنے آپ کو کل کا جزو سمجھ کر مطمئن کام سرانجام دے رہا تھا۔ تاہم حکم بردار گروہ سے حاکم گروہ اندر ہی اندر خائف سا تھا۔ اور کچھ الگ الگ کھچا کھچا سا رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو امیر طبقے سے متعلق اور عقل کا سرمایہ دار سمجھتا تھا۔ اور گروہ ادنےٰ کو علم و سرمائے سے محروم قیاس کر کے چھوٹی موٹی خدمات سرانجام دینے کا اہل خیال کرتا تھا۔ جب مجلس خلافت پنجاب کا الحاق مرکز سے ٹوٹ گیا۔ تو اس اعلیٰ گروہ کے کام کرنے کی طاقتوں نے بالکل جواب دے دیا۔ وہ کلی طور پر کانگرس کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ ان کا قیاس تھا کہ مسلمان خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہے۔ طبقہ ادنےٰ اپنی قوت عمل پر ساری قوم کا قیاس کر کے ہندوستانی مسلمان کو فوری انقلاب میں کامیاب نکلنے کا اہل سمجھتا تھا۔ لیکن یہ دونوں فریقوں کو بربنائے تجربہ احساس تھا کہ ہندو اور مسلمان میں کوئی یگانگت موجود نہیں، ہندو کی چھوت چھات نے دو قوموں کے درمیان دیوار چن رکھی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں دونوں گروہ مل کر چھوت چھات سے

کے خلاف آواز بلند کر چکے تھے۔ اور جانتے تھے کہ ہندوؤں کی "مجھے نہ چھوڑو" کی پالیسی سے مسلمان ناقابل بیان حد تک بیزار ہے۔ کانگریس میں بعض پاکیزہ خیال اور نیک طبیعت لوگ تو ہیں۔ لیکن اکثر وہ ہیں جو پالٹیکس میں بھی مجلسی تنگ نظری سے کام لے رہے ہیں اور اس لیے مجلسِ خلافت پنجاب کے اعلیٰ طبقے نے مسلم نیشنلسٹ پارٹی بنائی اور ادنےٰ طبقے نے مجلس احرار بنانے کا اعلان کیا۔ ان حالات میں بھی دونوں گروہوں کی تقسیم پوری واضح نہ ہوئی تھی، بظاہر کوئی جھگڑا نہ تھا۔ غالب قیاس یہ تھا کہ نیشنلسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا۔ ڈاکٹر محمد عالم ہیں، زیادہ دیر تک یہ گروہ قائم نہ رہے گا۔ چند میں یہ برائے نام جھگڑا مٹ جائے گا اور ایک نام کے ساتھ کام ہونے لگے گا"۔ (تاریخ احرار ص۲۴)

اس مسلسل جدوجہد اور غریبی پر ناز نے ان کو ایک طرف رومانوی اشتراکی بنا دیا۔ دوسری طرف مذہب کے لیے بے پناہ محبت کا جذبہ بیدار کیا۔ اور ان دونوں جذبوں میں انہوں نے کبھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا یہی مذہبی یگانگت و جنون اور رومانوی اشتراکیت دوستی تھی، جس نے ان کو ایک طرف سامراج دشمن صفوں میں مستقلاً کھڑا رکھا۔ تو دوسری طرف ہر اس جماعت سے دور رکھا۔ جس پر اُمرا کا تسلط ہو، لیکن امرا کے تسلط سے نجات پانے کے لیے یہ ٹھوس اقتصادی لائحہ عمل نہ اپنا سکے چنانچہ اس گروہ میں یہ تضاد مجلسِ احرار کے قیام کے بعد اور پہلے دونوں صورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ واقع ہے کہ مجلس احرار شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی پہلی اور آخری جماعت تھی، جس میں انقلابی رجحانات کی شدید آمیزش تھی، چنانچہ خود احرار کے زعماء جگہ جگہ اپنی انقلاب پسندی اور سرمایہ داری نظام کی مخالفت کا ذکر کرتے ہیں، چودھری افضل حق تاریخ احرار کے ابتدائیہ میں بھی لکھتے ہیں:

"فرشتہ خصلت غریب پر قیامت گزر جائے کوئی نہیں پوچھتا شیطان سیرت امیر کے سر درد کی خبر پاکر لوگ پیٹ پکڑے آتے ہیں اور گھر بیٹھے بھی پیر شہید مناتے ہیں، یہی حال سرمایہ دار اور غریب جماعتوں کا ہے۔ مجلس احرار قربانی کے کارناموں کی زندہ تاریخ ہے مگر مفلس کا ایثار سرمایہ دار دنیا میں بے توقیر ہے۔ سردیوں کی چاندنی رات اور جنگل کے شگفتہ پھول کی طرح اس پر نگاہ

ڈالنے کی کسی کو فرصت کہاں ؟ لیکن جنگل کا پھول اور سردیوں کی چاندنی رات ذوقِ نظارہ کے لیے کم دعوت نہیں۔ مجلس احرار کو دنیا ہزار نظر انداز کرے۔ مگر اس کی جاذبِ تاریخ کو پڑھ کر ہر شخص مرحبا کہنے پر مجبور ہوگا۔ میں ایسی پریشان حالی میں اس کو لکھنے بیٹھا ہوں کہ مضمون کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکا۔ مصلحت وقت کے پیشِ نظر بعض حصّے تشنۂ تکمیل ہیں۔ قانون کی تلوار گردن کے بہت قریب لٹک رہی ہے ایسے حال میں اسی تحفے کو دوست کی طرح قبول فرمائیں بعض ضروری افراد اور احباب کا ذکر رہ گیا ہے۔ اور بعض واقعات نظر انداز ہو گئے ہیں۔ ذرا حالات پرسکون ہوں تو شاید جماعت کا کوئی اور دوست یا خود میں ہی فرصت پاؤں تو کبھی تکمیل کی کوشش ہو جائے۔ جماعتی ریزولیشن بطور ضمیمہ شامل کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر کاغذ سونے کے تول بکنے لگا ہے۔ حجم بڑھ گیا تو اشاعت اور ہدیہ دونوں مہنگے سودے ہوں گے۔“

تاریخ احرار صفحہ ۵۳

لیکن اس غریب نواز جماعت کے قیام کا دور بھی بہت اہمیت رکھتا ہے اور یہی وہ دور ہے جس میں ہندوستان میں جگہ جگہ انقلابی تحریکیں پروان چڑھنا شروع ہوئی تھیں، اور خود کانگرس کے اندر ایک نمایاں بایاں بازو ایک طرف ابھر رہا تھا تو دوسری طرف بائیں بازو کا ایک حصہ تشدد کی راہ اختیار کر رہا تھا اور یہی وہ زمانہ تھا جب کمیونزم کا بھوت برطانوی شہنشاہیت کو پریشان کر رہا تھا اور وہ ہندوستان میں اس کمیونزم کی روک تھام کے لیے لیس ہو رہی تھی۔ لیکن پیشتر اس کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔ ہماری تحریکوں کے انگریز دشمنی کے مذہبی پہلو پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔

اس انگریز دشمنی کی پشت پر ایک تاریخی جذبہ بھی کارفرما رہا ہے وہ جذبہ ہے اسلام اور عیسائیت کی کشمکش، دونوں ایک ہی خطے سے اٹھنے والے مذاہب ہیں۔ اور جب اسلام پھیلا تو اس وقت عیسائیت کا چاروں طرف تسلط تھا۔ چنانچہ اسلام کو اور اس کے نام لیواؤں کو سب سے پہلا مقابلہ جو کرنا پڑا وہ عیسائیوں سے ہی تھا۔ اور مسلسل کئی صدیوں تک سلطنتوں کی توسیع

کے لیے ایک طرف عیسائی بادشاہ ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، دوسری طرف مسلمان خلفا اور بادشاہ تھے۔ اس کشمکش نے مذہبی جنگوں کا روپ اختیار کیا۔ یہ تو تھی تاریخی کشمکش، لیکن ہندوستان میں بھی جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری شروع ہوئی تو جہاں انہوں نے اقتصادی لوٹ کھسوٹ شروع کی اور ہمارے ہاں کی معیشت کو تباہ کیا وہاں انہوں نے عیسائیت کی تبلیغ کو بھی اپنی سلطنت اور عملداری کی وسعت کے لیے ذریعہ بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں انگریز سے نفرت عیسائیت کی بنیاد پر بھی ہونے لگی اور اس لوٹ کھسوٹ کی پشت پر اقتصادی اور سیاسی عوامل مذہبی نفرت میں گڈمڈ ہو گئے اور انگریز کی ہر چیز قابل نفرت ٹھہری۔ خواہ وہ زبان ہو لباس یا علم، نفرت کے یہ سوتے اسی نچلے درمیانے طبقے کو سیراب کرتے رہے اور اوپر کے طبقے نے اس کے بالکل الٹ انگریزی تعلیم کو اپنایا، انگریزی لباس پہنا اور انگریزی علم اور سائنس کو مفید جانا۔ چنانچہ اسی اوپری طبقے کی اولاد نے انگریزی تعلیم، اور انگریزی تہذیب سے استفادہ کر کے ملازمتیں حاصل کیں، چنانچہ ظاہر ہے کہ جب انگریزی شہنشاہیت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک ابھرے گی تو یہ اوپری طبقہ کے لوگ جن کے مفادات انگریزی حکومت سے وابستہ ہو گئے ہیں، وہ اس عدم تعاون کو کسی صورت میں برداشت نہیں کریں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کے اس نچلے درمیانے طبقے اور اوپر کے طبقوں میں ہر ہر قدم پہ تفاوت اور بُعد کا ایک سمندر حائل رہا۔ اس بُعد اور تفرقے میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں رونما ہونیوالے سوویت روس کے انقلاب نے بھی زبردست اضافہ کیا۔

عام طور پر سوویت روس کے انقلاب کی چھاپ جو ہماری تحریک پر پڑی اس کا پوری طرح تجزیہ نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس انقلاب نے دنیا بھر کی آزادی کی تحریکوں کو جوانی بخشی، ان کو تندرستی مہیا کی۔ اور خود اعتمادی کی شمعیں روشن کیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی اور برطانوی سامراج کے خلاف تحریک میں سوویت روس کے انقلاب کا زبردست حصہ ہے اور جب پہلی جنگ عظیم کے بارے میں لینن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا تو بہت سے دانشوروں کے ماتھوں پر شکنیں پڑ گئیں، انہوں نے اس جنگ کو مختصر اور جامع الفاظ میں مال غنیمت کی تقسیم کے لیے "لٹیروں کی جنگ" کا نام دیا تھا۔ یہ واقعہ ہے

کہ یہ جنگ دو سامراجی گروہوں کی شدید رقابت کا نتیجہ تھی۔ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ نوآبادیوں، حلقہ اثر اور عارضی مقبوضات وغیرہ کا نئے سرے سے بٹوارہ ہو۔ جو طاقتوں کے توازن کی تبدیلی سے مطابقت رکھتا ہو۔ چنانچہ ہندوستان کے اندر اور باہر پہلی جنگ عظیم کے خلاف جو مزاحمتی تحریکیں ابھریں ان کے ڈانڈے بالآخر کسی نہ کسی طرح سے سوویت روس کے انقلاب سے جا کر ملے۔ خواہ یہ امریکہ میں قائم ہونے والی غدر پارٹی ہو یا شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی رہنمائی میں کام کرنے والی عارضی حکومت ہو، جو کابل میں قائم ہوئی ان سب نے سوویت روس کے انقلاب سے ولولہ ہی حاصل نہیں کیا، بلکہ سوویت روس کے انقلابیوں سے گہرے رشتے بھی استوار کئے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ سوویت روس انقلاب نے ہماری تحریکوں کو ایک معتدبہ حصہ متاثر کیا۔ ۱۹۱۷ء میں سوویت انقلاب نے زارشاہی کو جب شکست دی تو اس سے تمام سامراجی طاقتیں بوکھلا گئیں اور اس انقلاب کے پانچ ماہ بعد ہی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کر دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت ابھی تحریک نے شدت اختیار نہیں کی تھی۔ ان اصلاحات کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہندوستان کے اوپری طبقوں کو ان اصلاحات کے فریب میں الجھا کر تحریک کو ابھرنے نہ دیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود جو عمل سوویت روس کی سرزمین پر جاری وساری ہوا اس نے ایک عالم کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسی کے متعلق لینن نے کہا تھا:

> "یہ بات روس کے حصے میں آئی ہے کہ وہ تاریخ کے انتہائی پیچیدہ موڑوں کا ایسے وقت میں صاف صاف مشاہدہ کرے اور انتہائی گہرائی اور مشقت سے ان کا تجربہ حاصل کرے جبکہ تاریخ سامراج سے کمیونسٹ انقلاب کی طرف مڑ رہی ہے۔ ہم نے چند دنوں کے اندر ایک قدیم ترین، انتہائی طاقتور، وحشی اور ظالم بادشاہت کو تباہ کر دیا۔ چند مہینوں کے اندر ہم بورژوازی کے ساتھ سمجھوتے کی متعدد منزلیں اور پیٹی بورژوا داعیوں کو دور کرنے کی ایسی منزلوں سے گذر گئے جن کے لیے دوسرے ملکوں کو دسیوں برسوں کی ضرورت ہوتی۔ چند ہفتوں میں، بورژوازی کا تختہ الٹنے کے بعد ہم نے خانہ جنگی میں اس کی کھلی مزاحمت کو کچل دیا۔ ہم وسیع ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بالشیوزم کی فاتحانہ شاندار

پیش قدمی کے ساتھ گزرے۔ ہم نے زار شاہی اور بورژوازی کے جبر و تشدد کے شکار محنت کش عوام کے سب سے نیچے والے پرتوں کو نجات اور آزادی کی زندگی تک بلند کر دیا۔ ہم نے ایک نئی قسم کی ریاست سوویت ری پبلک قائم کی اور اس کو مضبوط بنایا جو بہترین بورژوا پارلیمانی ریپبلکوں سے بے حد برتر اور زیادہ جمہوری ہے۔ ہم نے پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ قائم کی جس کی حمایت غریب ترین کسان کر رہے تھے اور سوشلسٹ اصلاح کا وسیع پیمانے پر مرتب کیا ہوا نظام شروع کیا ہم نے تمام ملکوں کے لاکھوں کروڑوں مزدوروں میں اپنی طاقت پر اعتماد کا جذبہ بیدار کیا۔ اور ولولے کی آگ بھڑکا دی ہر جگہ ہم نے عالمی مزدوروں کے انقلاب کی اپیل جاری کی۔ ہم نے تمام ملکوں کے سامراجی لٹیروں کو للکارا۔"

(لینن' اکتوبر انقلاب کی سالگرہوں کے
موقع پر مضامین اور تقریریں صفحہ ۶")

نہ صرف یہی نہیں بلکہ ۲۰ مئی ۱۹۲۰ء میں جب ہندوستان میں عوامی تحریک نئی بلندیوں اور رفعتوں کو چھو رہی تھی۔ اس وقت ہندوستان کے انقلابیوں کے نام سوویت انقلاب کے قائد لینن نے پیغام بھیجا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا:

"مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ مظلوم و مجبور قوموں کی دیسی اور بدیسی سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال سے آزادی اور خود اختیاری کے اصولوں نے جن کا مزدوروں اور کسانوں کی ری پبلک نے اعلان کیا تھا، ترقی پسند ہندوستانیوں کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔ جو خود آزادی کے لیے اس قدر جانفروشی سے لڑ رہے ہیں۔ روس کے محنت کش عوام ہندوستان کے مزدور اور کسان کی بیداری اور جاگرتی کو برابر انتہائی غور اور توجہ سے دیکھتے ہیں۔ محنت کشوں کی تنظیم' ان کا ڈسپلن اور ضبط و استقلال اور تمام دنیا کے محنت کشوں کے ساتھ ان کی ہمدردی اور یگانگت۔ یہ سب چیزیں ایک اہم جیت کی ضمانت ہیں، ہم مسلم اور غیر مسلم عناصر کے پکے اتحاد کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم خلوص دل سے

اس بات کے خواہش مند ہیں کہ یہ اتحاد بڑھ کر مشرق کے تمام محنت کشوں کو
اپنی آغوش میں لے لے۔ کیونکہ جب ہندوستانی، چینی، کوریائی، جاپانی، ایرانی،
اور ترکی مزدور اور کسان ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر آزادی کے
مشترکہ آدرش کی راہ پر گامزن ہوں گے۔ صرف اسی وقت استحصال کرنے
والوں کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح یقینی ہو سکتی ہے۔ آزاد ایشیا زندہ باد!"

(اقوام مشرق کی تحریک آزادی صفحہ ۳۶۷)

سوویت انقلاب نے مسلم عوام کو ایک اور طرح سے بھی متاثر کیا۔ کیونکہ سوویت روس نے ایران اور ترکی کے خلاف زار روس کے تمام خفیہ معاہدوں، جن کی رو سے ان دونوں ممالک کے علاقوں کو ہتھیا لیا گیا تھا، کالعدم قرار دے دیئے تھے۔ پھر افغانستان میں غازی امان اللہ خاں کی نئی حکومت کے ساتھ سوویت روس نے گہرے تعلقات قائم کیے۔ چنانچہ لینن نے انقلاب کی کامیابی کے فوراً بعد غازی امان اللہ کو ایک مکتوب ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا۔

"افغانستان نے ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے جو پیغام اعلیٰ بھیجا ہے۔ جس میں روسی قوم کو پیام تہنیت بھیجا گیا ہے اور عالیجاہ کی تخت نشینی کی اطلاع دی گئی ہے اس کے جواب میں ہم فوراً مزدوروں اور کسانوں کی حکومت اور پوری روسی قوم کی طرف سے آزاد اور خود مختار افغانی قوم کی خدمت میں پیام تہنیت بھیجتے ہیں، جو اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے غیر ملکی ظلم و زبردستی کے خلاف اس قدر بے جگری سے لڑ رہی ہے۔ عالی جاہ ہم آپ کی تخت نشینی پر آپ کو مبارک باد پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جو ۲۱ فروری ۱۹۱۹ء کو عمل میں آئی۔

مزدوروں اور کسانوں کی حکومت نے روسی ریپبلک کی تمام قومیتوں کو سچی آزادی اور مساوات عطا کر دی ہے اور اپنے اعلانات سے مطابقت اور ہم آہنگی رکھتے ہوئے لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے خلاف تمام محنت کشوں کی ایکتا کے بین الاقوامی اصول پر مضبوطی سے کاربند ہو گئی ہے۔

ہماری دعا ہے کہ افغانی قوم کی روس کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش

افغانی ریاست کی مضبوطی اور خود مختاری کی بہترین ضمانت ثابت ہو۔

ہم عالی جاہ کے روسی قوم کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنے کے ارادہ کا سواگت کرتے ہیں، اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ماسکو میں اپنے ایک سرکاری نمائندہ کا تقرر کر دیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم مزدوروں اور کسانوں کی حکومت کے ایک نمائندہ کا کابل میں تقرر کرنے کو تیار ہیں۔ اور درخواست کرتے ہیں کہ عالی جاہ متعلقہ افسران کو حکم دے دیں کہ وہ ہمارے نمائندے کے سفر میں سہولت پیدا کریں۔ ہماری دو عظیم قوموں کے درمیان مستقل سفارتی تعلقات کا قیام اس بات کے بھرپور امکانات پیدا کریگا۔ کہ ہمارے ملکوں کی آزادی پر کسی لٹیری اور سفاک بدیسی قوت کی دست درازی کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کی جا سکے۔

میں افغانی قوم کے نام یہ پہلا پیام تہنیت بھیجتے ہوئے دلی مسرت محسوس کرتا ہوں۔ اور عالی جاہ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی قوم کے دوستوں کا سلام محبت قبول کریں۔"

ماسکو ۲۷ رمئی ۱۹۱۹ء لینن

(اقوام مشرق کی تحریک آزادی صفحہ ۳۲۹)

پھر لینن نے ایک امریکی اخبار نویس کے سوالوں کے جواب میں کہا تھا۔

"ہماری سوویت ری پبلک ہندوستان، افغانستان اور روس سے باہر کے دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی وہی کچھ کرتی ہے جو وہ خود روس میں رہنے والے بے شمار مسلمانوں اور دوسری غیر روسی قومیتوں کے ساتھ کرتی ہے مثال کے طور پر ہم نے بشکیریا کے عوام کو روس کے اندر اپنی ایک خود مختار ری پبلک قائم کرنے کے قابل بنا دیا۔ ہم ہر قومیت کی خود مختاری اور آزادانہ ارتقا میں اور مختلف دیسی زبانوں میں ادب کے پھلنے پھولنے پڑھنے اور پھیلنے میں ممکن طریقے سے مدد کر رہے ہیں۔ ہم اپنے سوویت دستور ...

ترجمہ کر رہے ہیں، اور اسے مقبول عام بنا رہے ہیں اور یہ وہ دستور اساسی ہے
جو بدقسمتی سے نوآبادیات کے اور ساری دست نگر، مظلوم و مجبور اور غیر مساوی
قوموں کے ایک کھرب لوگوں کے لیے بورژوا "جمہوری" ملکوں کے "مغربی یورپی"
یا امریکی قسم کے دستور ہائے اساسی سے زیادہ کشش اور جاذبیت رکھتا ہے
کیونکہ اس قسم کے دستور ہائے اساسی تو اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ زمین اور سرمائے
کی شخصی ملکیت کو استوار اور مستحکم کریں۔ یعنی خود اپنے ملکوں کے مزدوروں کو
دبانے اور کچلنے کو اور افریقہ، ایشیا وغیرہ کی نوآبادیوں کے کروڑوں باسیوں
کو دبانے اور ستانے میں اور زیادہ شدت اور تیزی پیدا کرنے میں مٹھی بھر
مہذب" سرمایہ داروں کی مدد کریں۔"

(اقوام مشرق کی تحریک آزادی صفہ ۲۳۱)

ان تمام واقعات نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اسی زمانے سے برطانوی شہنشاہیت نے اپنے زیر اثر مذہبی رہنماؤں کے ذریعے سوویت روس کے خلاف زبردست مہم کا اجرا کیا تھا اور کمیونزم کو الحاد اور کفر کہہ کر عام مسلمانوں کو ڈرانے اور بہکانے کی کوشش کی جاتی رہی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں تمام پروپیگنڈے کے باوجود عوام کوئی زیادہ متاثر نہیں ہوتے تھے؛ امرار کا طبقہ یقینی طور پر متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ اس زمانے میں سوویت انقلاب کی حمایت میں خیالات اور رجحانات کا اظہار دیکھنے میں آتا تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے تو کھلم کھلا اپنے کو مسلم کمیونسٹ کہلایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" میں کمیونسٹ مینی فیسٹو کا ترجمہ شائع ہوا۔ اور ترجمان القرآن میں "سوشلزم کو بہرحال تجربے کا موقع ملنا چاہیئے" کا کھلے بندوں اظہار ہوا۔ خود احرار کے گروہ نے جگہ جگہ مزدوروں اور کسانوں کی بھلائی کا اعلان کیا۔ چنانچہ مجلس احرار کے باقاعدہ قیام کے موقع پر ۱۹۳۱ء میں مولانا مظہر علی اظہر کا خطبۂ استقبالیہ اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا خطبۂ صدارت احرار کے عزائم کی نشاندہی کرتے ہیں، ۱۹۳۱ء میں مولانا مظہر علی اظہر نے کہا تھا؛

"ہندوستان کے مدعیان قوم پرستی کو ابھی تک یہ سبق پڑھانے جانے
کی ضرورت ہے کہ ' دنیا امیروں کی جولانگاہ نہیں ' اس میں غریبوں کا بھی حصہ ہے
بلکہ اگر حق رائے دہی اور نظام حکومت کی ضرورت ہے تو غریبوں کو ' امیر تو خود اپنی
حفاظت کر سکتے ہیں۔ اپنے لیے حفظان صحت کا انتظام کر سکتے ہیں۔ جائداد کی حفاظت کے
لیے پہرہ دار مقرر کر سکتے ہیں۔ اپنی اولاد کو تعلیم دے سکتے ہیں۔ لیکن غریب ہی ہیں جنہیں نہ
آج تک تعلیم دی گئی نہ ان کے لیے حفظان صحت کا بندوبست کیا گیا نہ ان کی روزمرہ زندگی
ہی انسانوں کی زندگی کہلا سکتی ہے بلکہ امیروں کے اکثر کتے لاکھوں اور کروڑوں غریب انسانوں
سے بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اگر اسی نظام حکومت کو قائم رکھنا ہے جو سرمایہ داری کی تسان اپنے اندر رکھتا ہے اور
غریب کو کچل کچل کر امیر کو مالا مال کرنے میں منہمک ہے تو برطانوی کارتوس اور بم کچھ عرصہ تک
یقیناً ابھی غریبوں کو خاموش رکھ سکیں گے اور ہندو اور سکھ سرمایہ پرستی اسی امید پر ادھار
کھائے بیٹھی ہے مگر نوع انسانی کے غریب لیکن محنت کش افراد ہمیشہ کے لیے قعر مذلت
میں نہیں رہ سکتے۔ اگر پنجاب میں غریب طبقہ میں مسلمانوں کی نمائندگی زیادہ ہے تو باقی صوبوں
میں غریب ہندوؤں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ قوم کے بہترین افراد کو جو شب و روز
محنت کرتے ہیں اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے بھی اکثر محروم رکھے جاتے ہیں۔ جنہیں نہ
گرمی میں شملہ ' ڈلہوزی اور مری کی ٹھنڈی ہوائیں نصیب ہوتی ہیں نہ سردی میں دہکتی ہوئی
انگیٹھیوں کے آگے بیٹھنا مل سکتا ہے۔ نہ بادوباراں کے موسم میں ہی کہیں سر چھپا کر بیٹھنے کی
ہی توفیق ہوتی ہے۔ انہیں ہمیشہ اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنا انہیں شرف انسانیت
سے محروم رکھنا ' احسن تقویم میں خلق کی ہوئی دنیا کو اسفل سافلین میں رہنے پر مجبور کرنا بالآخر
آجکل کے سرمایہ دار اور فوقیت یافتہ طبقہ کے لیے ہی نہ صرف خطرناک بلکہ مہلک ثابت ہوگا۔
آج وقت ہے کہ قوم کے ہر طبقہ کو فراخ حوصلگی سے مواقع ترقی دیئے جائیں۔ غریبوں کمزوروں
جاہلوں بلکہ گنہ گاروں کی خبر گیری کی جائے تاکہ وہ آسانی سے خواص انسانی حاصل کر کے ملک
وطن کے لیے زینت اور فخر کا باعث ہوں۔ لیکن اگر حکومت کی مشینری اس لیے چلائی جاتی

ہے کہ غریب محنت کرے اور سرمایہ دار عیش اڑائے، مقروض کمائے اور قارض سب کچھ سود میں اڑائے جائے۔ عوام الناس بیکاریوں، اور جرم و گناہ کی زندگی بسر کریں اور امرار رؤسا انہیں سزا دینا ہی اپنا فرض سمجھیں، ان کی مشکلات کو حل کرنے کی دردسری اپنے ذمّہ نہ لیں تو طبقاتی جنگ کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا۔

ہم اب بھی آزادیٔ وطن کے لیے تہ دل سے کوشش کریں گے۔ لیکن ہماری کوششیں غریبوں، مفلسوں، محنت کشوں، مظلوموں اور ستم رسیدوں کی آزادی و خوشحالی اور فارغ البالی کے لیے ہوں گی ہم نئی بادشاہتیں، نئے راج، نئی نوابیاں اور نئے ساہوکارے دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتے ہم خود دولت اور امیری کے دلدادہ نہیں، نہ آئندہ امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنا ہمارا مقصد ہے اس لیے جہاں ہم نے آج تک برطانوی ملوکیت اور سرمایہ داری کا ساتھ دینا ضعفِ ایمانی سمجھا ہے اسی طرح ہندوستانی سرمایہ داری کے ہاتھ میں کھیلنا بھی ہمارے نزدیک جائز نہیں۔ اگر ہمارے سرمایہ دار بھائی ہمیں اپنے پھندے میں نہ پھنستا دیکھ کر جوشِ غضب میں آئیں تو ہم مردانہ وار مسکرا کر اپنی راہ چلتے جائیں گے۔"

اسی موقع پر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں اعلان کیا تھا

> "میرے نزدیک ہندوستان کی تمام مشکلات کا حل صرف ایک ہے کہ ہندوستان کے تمام سمجھ دار قوم پرست، کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم کریں اور ہندوستان میں بجائے ایک سرمایہ دار حکومت کے غربار کی حکومت قائم کریں، میں اگرچہ کانگرسی ہوں اور میں نے ہمیشہ کانگرس کے جھنڈے تلے کام کیا ہے۔ مگر مجھے اس کے کہنے میں پس و پیش نہیں ہے کہ کانگریس کی محنت اور قربانی کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی حکومت انگریزی سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔ بلکہ ڈومینین سٹیٹس کی شکل میں تو جو حکومت ہندوستان پر قائم ہو گی اس میں ہندوستانی اور انگریز سرمایہ دار مل کر یہاں کے غربا کو کچلنے کی کوشش کریں گے۔" (تاریخ احرار صفحہ ۵۵، ۵۶)

احرار زعماء کی تقریروں اور خطبوں میں مزدور کسان دوستی کے جذبات اکثر و بیشتر خون گرماتے ہیں، ان کی شعلہ بیانیاں کاخِ امرا کو خس و خاشاک کرنے کے لیے ہر لمحہ بے تاب نظر آتی ہیں، یہ تقریریں، یہ خطبے، یہ غربت پر فخر، یہ غریبوں کی حمایت کی زبانی ایک طرف جہاں ان کے اپنے طبقے کی محرومیوں اور ان کی تلخیوں کا اظہار ہیں وہاں یہ شعلہ بیانیاں ارد گرد کے حالات، معاشی بحران، اور عوامی اضطراب کا بھی اظہار ہیں، اس لیے کہ جب مجلس احرار قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں عوامی اضطراب ایک نئی منزل میں داخل ہو رہا تھا۔ اور کانگریس و خلافت کی تحریک کی ناکامی کے بعد سات آٹھ برس تک مایوسی کے جو بادل چھائے رہے تھے وہ قدرے چھٹنے شروع ہو گئے تھے، اور گاندھی جی کی گو مگو اور سودے بازی کی پالیسی کے خلاف ایک نیا پُرجوش انقلابی نوجوانوں کا گروہ ابھرنے لگا تھا۔ اور ساتھ ہی ہندوستان کے اندر اور باہر کے معاشی بحران میں مزدوروں کو اپنے کو منظم کرنے اور ہڑتالیں کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور پھر سے حالات اسی نہج پر پہنچنے والے تھے، جہاں ۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء میں پہنچے تھے، اور جہاں عوامی جوش و خروش کا گاندھی جی نے گلا گھونٹ دیا تھا۔

یہ ہمارے ہاں کی تحریکوں کا ایک خاص پہلو رہا ہے کہ جب تحریکیں عوامی بننے لگتی ہیں اور ان میں مزدوروں، کسانوں اور پسے ہوئے کچلے ہوئے طبقوں کی محرومیوں اور تلخیوں کا ٹھوس طریقے سے ازالہ کی راہیں نکلنی شروع ہونے لگتی ہیں۔ جب ان مقہور و مجبور طبقات کی خواہشوں، آرزوؤں اور تمناؤں کو صحیح طریقے سے متشکل کیا جانے لگتا ہے تو قیادت جو اوپری طبقے کی یا ان کے مفاد کی حامی و مددگار ہوتی ہے، وہ جھٹ سے تحریک کا گلا گھونٹ دیتی ہے کبھی یہ کام گاندھی جی چورا چوری کے نام پر کرتے رہے ہیں، کبھی گول میز کانفرنس میں شرکت کے نام پر تحریک ختم کر دی جاتی ہے۔ اور عوام کے اضطراب کو اس طرح سے انقلاب کی راہ پر آگے بڑھنے سے روک دیا جاتا ہے۔ چنانچہ احرار کے گروہ کو کانگریس سے ہمیشہ اس کی سمجھوتے بازی پر اعتراض رہا ہے۔ گاندھی جی کی سمجھوتہ بازی اور تحریک کو دبانے کا ذرا واضح نقشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ ان طریقوں کے جاننے سے عبرت ہوتی ہے کہ کس طرح یہ اوپری طبقہ عوام کو فریب دیتا ہے، چنانچہ پام دت اپنی معرکۃ الآرا کتاب "نیا ہندوستان" میں لکھتے ہیں

"ایسے زمانہ میں جبکہ سارے ملک میں اتنا جوش و خروش تھا لوگوں کو اپنی کامیابی کی اتنی امید اور اس پر اتنا یقین تھا، کانگریس کے اندر ایک آدمی بہت رنجیدہ اور وہ حالات کے رخ سے پریشان تھا۔ یہ شخص گاندھی تھا۔ یہ تحریک جس کا خاکہ اس نے بنایا تھا۔ اس راہ پر بالکل نہیں جا رہی تھی۔ جس پر وہ اسے لے جانا چاہتا تھا۔ کہیں کچھ گڑبڑ تھی، یہ ویسی آئیڈیل فلسفیانہ "عدم تشدد" کی تحریک نہیں تھی، جس کی تصویر اس کے ذہن میں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے تباہی کے دیو کو بے لگام کر دیا ہے۔ نابکار لوگ اس میں داخل ہو رہے تھے، بعض شوریدہ سر خاص طور پر بعض مسلمان ساتھی اس حد تک مطالبہ کرنے لگے تھے کہ "عدم تشدد" کی دفعہ ہی اڑادی جائے۔ ۱۹۲۱ء کے ان آخری ہفتوں میں جبکہ ہزاروں مجاہد "گاندھی جی کی جے" کے نعروں کے ساتھ جیل جا رہے تھے۔ گاندھی جی کی پریشانی اور بیزاری روز بروز بڑھ رہی تھی، جس کا بہت کچھ اندازہ ان کے اس مشہور فقرہ سے ہو جاتا ہے کہ "مجھے سوراج سے بو آنے لگی ہے"۔

یوں تو احمد آباد سے ہی قدم پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے لیکن ابھی تک کھلے بندوں نہیں، اس لیے کہ آنے والے معرکہ کی توقع سے فضا میں بڑا ہیجان تھا اور ہزاروں آدمیوں کی آرزوئیں اس کے ساتھ تھیں، لیکن اس پس قدمی کے چھوٹے چھوٹے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ احمد آباد کانگریس خود ایک اس کا بہترین تاریخی موقعہ تھا کہ یہاں سے سارے ملک کو آواز دی جاتی کہ آؤ اور اجتماعی جدوجہد میں شریک ہو۔ نوخیز کمیونسٹ پارٹی نے احمد آباد کانگریس کے وقت جو مینی فسٹو شائع کیا تھا اس میں کہا گیا تھا:

> "انقلاب سے ہندوستان کی بنیادیں ہل رہی ہیں، اور اگر کانگرس اس کی رہنمائی کرنا چاہتی ہے تو اسے صرف مظاہروں اور عارضی جوش وخروش پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے اسے چاہیئے کہ مزدور سبھاؤں کے مطالبات کو فوراً اپنے مطالبات بنالے۔ اسے چاہیئے کہ کسان سبھاؤں کا جو پروگرام ہے اسے اپنا پروگرام بنالے اور بہت جلد اس کا وقت آجائے گا۔ کہ کوئی بھی رکاوٹ کانگرس کا راستہ نہیں روک سکے گی اس کے ساتھ ان عوام کی ناقابلِ مزاحمت قوت ہوگی جو پوری بیداری

کے ساتھ اپنے مادی مفاد کے لیے لڑ رہے ہوں گے۔"

(کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو جو ۱۹۲۱ء کی احمد آباد کی نیشنل کانگرس کے نام جاری کیا گیا تھا۔)

لیکن احمد آباد میں جدوجہد شروع کرنے کی اپیل نہیں کی گئی بلکہ اس کے برعکس ان لوگوں نے جو قریب سے مطالعہ کر رہے تھے، یہ محسوس کیا کہ پچھلی قراردادوں میں عدم ادائی ٹیکس کا جو ذکر آتا تھا، احمد آباد کی قرارداد سے وہ بھی غائب تھا۔ اجتماعی سول نافرمانی کا جہاں ذکر کیا بھی گیا تھا۔ وہاں بہت سے اگر مگر لگا دیئے گئے تھے، مثلاً "کافی احتیاطی تدبیریں اختیار کرنے کے بعد"، "ان ہدایتوں کے مطابق جو بعد میں دی جائیں گی"، "جب لوگوں کی بڑی اکثریت کو عدم تشدد کے طریقے کی کافی تعلیم دی جا چکے گی" وغیرہ، اس کے بعد اسی کانگرس میں جمہوریت پسند مسلمان لیڈر مولانا حسرت موہانی والا واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک قرارداد پیش کرنا چاہتے تھے۔ جس میں وہ سوراج کی تعریف "مکمل آزادی اور ہر قسم کے بیرونی اقتدار کا خاتمہ" کرنا چاہتے تھے گاندھی جی نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا "مجھے اس کا بڑا دکھ ہے اس لیے کہ اس سے بڑی غیر ذمہ داری کا اظہار ہوتا ہے"۔ اور انہوں نے اپنی کوشش سے اسے رد کروا دیا۔

حکومت ہند بڑی پریشانی کے ساتھ احمد آباد کانگریس اجلاس کا مطالعہ کر رہی تھی اور جب اسے پیچھے ہٹنے کے یہ ابتدائی آثار نظر آئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وائسرائے نے وزیر ہند کو تار کے ذریعہ اطلاع بھیجی:۔

"کرسمس کے زمانہ میں کانگریس نے اپنا سالانہ اجلاس احمد آباد میں منعقد کیا۔ بمبئی کے فساد کا گاندھی پر بڑا گہرا اثر ہوا جیسا کہ ان کے اس وقت کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ اس فساد نے ان پر روشن کر دیا کہ اجتماعی سول نافرمانی میں کتنے خطرات پوشیدہ ہیں۔ کانگریس کی قراردادوں سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے اس لیے کہ وہاں نہ صرف مخالف پارٹی کے انتہا پسندوں کی یہ تجویز رد کر دی گئی کہ عدم تشدد کی پالیسی ترک کر دی جائے۔ بلکہ یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ سول نافرمانی کی تحریک اسی وقت شروع کی جائے جبکہ وہ شرائط پوری

ہوں۔ جو دہلی کے اجلاس میں عائد کی گئیں تھیں۔ ساتھ ہی ان قراردادوں میں سے عدم ادائی ٹیکس کا ذکر بھی اڑا دیا گیا۔

ہندوستان کے بارے میں خط و کتابت
سی۔ایم۔ڈی ۱۵۸۶ سنہ ۱۹۲۲ء

اب سوال یہ تھا کہ گاندھی جی کریں گے کیا؟ احمد آباد کانگریس تو بغیر کوئی منصوبہ بنائے ختم ہو چکی تھی، ہر چیز گاندھی جی کے ہاتھ میں چھوڑ دی گئی تھی، ہندوستانی عوام کے سر پر سامراجی تشدد کا ہتھوڑا چل رہا تھا اور وہ گاندھی جی کی طرف آنکھ لگائے بیٹھے تھے کہ وہ اس سے نکلنے کا کوئی منصوبہ پیش کریں گے۔ گاندھی جی کا طرزِ عمل عجیب و غریب تھا۔ وہ ایک مہینہ تک انتظار کرتے رہے اس عرصہ میں مختلف ضلعوں کے کانگرسی ان کے پاس آتے رہے اور ان سے درخواست کرتے رہے کہ عدم ادائی ٹیکس کی تحریک شروع کریں۔ مدراس کے ایک ضلع گنٹور نے ان کی منظوری کے بغیر ہی تحریک شروع کر دی۔ گاندھی جی نے کانگرسی عہدیداروں کو فوراً یہ پیام بھیجا کہ مقررہ تاریخ پر سارے ٹیکس ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک بہت چھوٹے سے ضلع میں یہ تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا جہاں انہوں نے اس کا خاص طور پر بندوبست کر لیا کہ کسی قسم کا کوئی تشدد نہ ہونے پائے۔ یہ ضلع بردولی تھا جو گجرات میں واقع ہے اس کی آبادی ۸۷ ہزار تھی۔ یعنی ہندوستان کی کل آبادی کا چار ہزارواں حصہ، لیکن ہندوستان کے سب لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے کہ ان کے لیڈر کوئی عملی قدم اٹھائیں۔ پہلی فروری کو انہوں نے وائسرائے کو الٹی میٹم دیا، جس میں کہا کہ اگر تمام قیدی چھوڑ نہ دیئے گئے اور ظلم و تشدد بند نہ ہوا تو صرف بردولی میں "اجتماعی سول نافرمانی" شروع کر دی جائے گی۔ ابھی یہ ہوا ہی تھا کہ چند ہی دن کے اندر یو پی کے ایک چھوٹے سے دیہات چوراچوری سے یہ خبر آئی کہ وہاں کے کسانوں نے غصہ میں آکر دیہات کے پولیس تھانہ پر دھاوا بول دیا۔ اسے جلا دیا اور اس میں ۲۱ پولیس کے سپاہی مارے گئے۔ جب گاندھی جی کو یہ خبر ملی کہ کسانوں میں بے چینی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے تو انہوں نے طے کر لیا کہ وقت بالکل ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ ۱۲ فروری کو

بردولی میں جلد ہی ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ کیا گیا اور وہاں "چوراچوری میں مجمع کے غیر انسانی برتاؤ" کی وجہ سے یہ طے کیا گیا کہ نہ صرف اجتماعی سول نافرمانی کی تحریک روک دی جائے بلکہ والنٹیروں کے جلوسوں اور مخالفت کے باوجود جلسے کر کے سول نافرمانی کے لیے جو پرچار کیا جاتا تھا وہ بھی بند کر دیا جائے اور اس کی بجائے سوت کاتنے، نشہ بندی کرنے اور تعلیمی سرگرمیوں کا تعمیری پروگرام منظور کیا گیا گویا یہ جنگ ختم ہو گئی ساری تحریک کا خاتمہ کر دیا گیا۔

(نیا ہندوستان صفحہ ۵۱۴)

گاندھی جی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے انہوں نے تحریک کو دبا دیا عوام کے انقلابی جذبے کو سرد کر دیا لیکن ساتھ ہی پورے ملک کو مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا۔ جو انقلابی جذبے ہندو مسلم ایکتا اور اتحاد کے نعرے لگا کر برطانوی شہنشاہیت پر یلغار کر رہے تھے، وہ ہندو مسلم فسادات کے شعلوں کی نذر ہونے لگے، چاروں طرف مایوسی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا پڑنے لگا اور اس اندھیری کی پرچھائیاں خود گاندھی جی پر پڑنے لگیں اور وہ چیخ اٹھے چنانچہ انہوں نے ۱۹۲۴ء میں خود اعتراف کیا کہ کہاں تو کانگریس کی رکنیت کو دس لاکھ تک پہنچانے کے منصوبے تھے، اور کہاں اب ۲ لاکھ بھی مشکل سے ہوں گے۔ "ہم سے ایسا ڈال حکومت کی مخالفت کے علاوہ عوام کی نمائندگی نہیں کرتے"۔ اس سال گاندھی جی نے کانگریس کی ممبری کی شرط یہ رکھوائی کہ ہر ممبر ماہانہ کم از کم ۲ ہزار گز سوت کاتے، نتیجہ کیا ہوا کہ ۱۹۲۵ء میں ممبروں کی تعداد گھٹ کر دس ہزار رہ گئی۔ اس کے بعد یہ شرط اڑا دی گئی۔

یہ سب کیوں ہوا؟ اس لیے کہ ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ عوامی تحریک کو صرف ایک حد تک لے جانا چاہتا تھا۔ یہ حد تھی، یہاں تک وہ برطانوی شہنشاہیت کو مراعات دینے پر مجبور نہ کر دے۔ اس سے آگے اس کو تحریک سے خود بھی خوف آتا تھا۔ کیونکہ پھر یہ تحریک خود اس نظام کو الٹنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے جس نظام نے اس بنئے کو صنعتکار بنایا ہے، تاجر بنایا ہے، زمیندار بنایا ہے، کوٹھیوں اور آسائشوں کا اجارہ دار ٹھہرایا ہے۔ لیکن سرمایہ دار یہ فراموش کر دیتا ہے کہ سامراج وقتی طور پر مراعات دے دیتا ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد وہ ان سے زیادہ وصول کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتا ہے۔

یہی ہندوستانی سرمایہ دار جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے نمائندہ ہندو مت کا ہیرو تھا ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۰ء میں پریشان ہونے لگا تھا۔ چنانچہ پچھلے چند سالوں میں ہندوستانی سرمایہ داروں کو جو بعض معاشی رعایتیں دی گئی تھیں وہ چھین لی گئیں اور اپنا معاشی اقتدار پھر سے قائم کرنے کے لیے بھرپور وار کیا گیا۔ ۱۹۲۷ء میں کرنسی بل ہندوستانیوں کی سخت مخالفت کے باوجود پاس کر دیا گیا۔ اور روپیہ کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس کر دی گئی۔ فولاد کی صنعت کا حفاظتی بل پاس کیا گیا جس کی رو سے برطانوی فولاد کی صنعت کو رعایتیں دی گئیں اور ۱۹۱۴ء میں ہندوستانی صنعت کی حفاظت کے لیے جو قانون بنے تھے وہ کالعدم کر دیئے گئے۔ ۱۹۲۷ء کے آخر میں ہندوستان کے دستور کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے سائمن کمیشن کا اعلان کیا گیا۔ جس میں کوئی ہندوستانی نہیں لیا گیا۔

اس طرح ہندوستانی بورژوا طبقہ کو مجبوراً تعاون اور دوستی کی تمام امیدیں ترک کر دینی پڑیں اور اس پر مجبور ہونا پڑا کہ عوام کی طرف رخ کریں اور اپنی تائید میں ان کی قوت کو اکٹھا کریں تاکہ اس طرح سامراج سے کامیابی کے ساتھ سودا بازی ہو سکے۔ لیکن اس وقت حالات دس سال پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ تھے اسلیے کہ اس عرصہ میں عوامی قوتوں میں ایک نئی زندگی کا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ ان میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونے کا جذبہ بیدار ہو رہا تھا۔ ان کا اپنا سیاسی نقطۂ نظر پیدا ہو رہا تھا اور وہ نہ صرف سامراج کے خلاف بلکہ اپنے ہندوستانی لوٹنے کھسوٹنے والوں کے خلاف جدوجہد پر آمادہ ہو رہے تھے اب یہ چیز زیادہ صاف طور پر نظر آ رہی تھی کہ یہ کشمکش تین قوتوں میں تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اصلی کشمکش سامراج اور ہندوستانی عوام میں تھی اور ہندوستانی بورژوا طبقہ جھجکتا ہوا کبھی ایک سے تعاون کرتا اور کبھی دوسرے کے ساتھ جدوجہد میں شریک ہو جاتا۔ ان ہی حالات کی وجہ سے اب جو جدوجہد شروع ہوئی تو اس کی ایک عجیب و غریب نوعیت تھی۔ اس کے آثار ۱۹۱ء ہی میں شروع ہو گئے تھے۔ اور اس نے پورا زور ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۴ء کے درمیان پکڑا۔ ایک طرف تو اس جدوجہد کے اثر کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ یہ جدوجہد بہت شدید تھی اور ساتھ ہی کافی طویل عرصہ تک جاری رہی۔ لیکن اس کی کچھ اور عجیب خصوصیات بھی تھیں۔ یہ یکایک بھڑک اٹھتی

کبھی بہت تیز ہوجاتی اور کبھی مدھم پڑجاتی اس کے مقاصد بھی برابر بدلتے رہے۔ کبھی سمجھوتے کی طرف رجحان بڑھتا اور کبھی لڑائی کی طرف اس کے ساتھ بار بار حکومت سے گفت و شنید بھی ہوتی، اور بغیر کسی سمجھوتے کے عارضی صلح بھی ہوجاتی۔ حتیٰ کہ آخر پوری تحریک بیٹھ گئی۔
۲۵-۱۹۲۴ء کے زمانے میں جو پہلی مرتبہ نیا عنصر داخل ہوا جس نے جدوجہد میں ایک نئی جان پیدا کردی اگرچہ اس کی رہنمائی اس کے ہاتھ میں نہ آسکی۔ وہ صنعتی مزدور طبقہ ہے جو ایک آزاد قوت کی حیثیت سے ہندوستانی سیاسی زندگی میں داخل ہوا۔ جس نے غیر معمولی محنت بہادری، جوانمردی کے ساتھ اپنی لڑائیاں لڑیں۔ جو آپ اپنے لیڈر پیدا کرنے لگا۔ اس کے قدم بڑھے تو مزدور طبقہ کے اپنے سیاسی نظریہ یا سوشلزم کو ترقی ہونے لگی۔ اور پہلی مرتبہ ہندوستان میں اس کی سیاسی اہمیت پیدا ہونے لگی۔ اس نظریہ کا اثر نوجوانوں اور قومی تحریک کے بائیں بازو میں سرایت کرنے لگا۔ جس نے اس تحریک میں نئی زندگی اور نئی قوت پیدا کردی اور اس کی نظروں کو وسیع کردیا۔ ۱۹۲۴ء میں کانپور سازش کا جو مقدمہ چلا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سامراج انقلابی مزدور سیاست سے کتنا چوکنا رہتا ہے اور جیسے ہی اس کے آثار پیدا ہوئے اسے مٹانے میں سرگرم ہوگیا۔ مزدور کسان پارٹی نے ترقی کرنی شروع کی اور ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے زمانے میں سامنے آنے لگی۔ اور اس کے بعد جگہ جگہ مزدور یونینیں بننے لگیں ۱۹۲۸ء میں سارے ملک میں ہڑتالوں کی نہایت زبردست لہر چلی، جس میں کل ۳ کروڑ ۱۶ لاکھ سے زیادہ دن ضائع ہوئے اتنے پچھلے پانچ سال میں ملاکر بھی نہیں ہوئے تھے۔ بمبئی کے سوتی کارخانوں کے مزدوروں کی سبھا گرنی کامگار یونین نے زبردست ترقی کی اور سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس کے ممبروں کی تعداد ایک سال میں ۶۵ ہزار ہوگئی۔ مزدور سبھاؤں کے ممبروں کی تعداد میں ۷۰ فیصدی اضافہ ہوا۔ اس سال سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ میں مزدور طبقہ نے غیر معمولی حصہ لیا۔ جس کی بہت بڑی سیاسی اہمیت تھی۔ مزدور سبھاؤں میں غیر معمولی بیداری پیدا ہوئی۔ اور جدوجہد کا رجحان ترقی پانے لگا۔ اور ۱۹۲۹ء میں ٹریڈ یونین کانگرس کے اجلاس میں انقلاب پسندوں کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی یہ تھے وہ واقعات جو ہندوستانی عوام کی ایک نئی عوامی جدوجہد کا پیش خیمہ تھے یہ بھی وہ قوت جو اس جدوجہد کو چلا رہی تھی۔

آئینی محاذ پر

ان تبدیلیوں کا مسلم سیاست پر بھی خاصا اثر ہوا۔ لیکن اس دور میں ایک طرف عوامی اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اور وہ براہ راست برطانوی شہنشاہیت سے گلو خلاصی کے لیے جدوجہد کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف برطانوی شہنشاہیت آئینی اصلاحات کے نام پر پھر اس اضطراب کو امید و بیم کی الجھی ہوئی راہوں میں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس صورت حال نے پنجاب کے مسلمانوں کو خاص طور پر متاثر کیا۔ اور دراصل یہ اثرات تھے جو بعد میں مجلس احرار کی تشکیل کا موجب بنے اور انہوں نے ایک نئی راہ متعین کرنے کی کوشش کی اس لیے اس پوری صورت حال کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس دور میں اسی محاذ پر جو کارگزاری عمل میں لائی گئی اس کا قدرے تفصیلی جائزہ لینا چاہیئے۔

برطانوی حکومت نے اپنی مصلحتوں کے پیش نظر ۱۹۲۶ء میں ایک آئینی کمیشن قائم کیا تاکہ وہ ہندوستان میں پہنچکر حالات کی تحقیق کرے اور اپنی سفارشات برطانوی حکومت کے سامنے رکھے۔ اس کمیشن میں سب کے سب انگریز ارکان نامزد کیے گئے۔ کسی ہندوستانی کو اس کمیشن کا ممبر بنانا رموز مملکت کے منافی سمجھا گیا۔

اس کمیشن کے خلاف ہندوستان میں ہر طرف سے احتجاج ہونے لگا۔ اعتدال پسند سیاست دان بھی جو حکومت کے ساتھ ہر طرح تعاون کرنے کو ہمیشہ تیار رہا کرتے تھے، اس وقت اپنے آپ کو اور دیگر ہندوستانیوں کو اس کمیشن کی رکنیت سے محروم پاکر واویلا کرنے لگے۔ ہندوستانیوں کو اس کمیشن کی رکنیت سے محروم کرنے کو نسلی تعصب کا نتیجہ قرار دیا گیا اور اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ ہونے لگا۔

سائمن کمیشن کے اس تازہ چابک نے سیاست دانوں کو اور چمکایا اور وہ ہندوستان کے معاملے کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ مخلوط انتخاب اور ہندو مسلم مسئلہ کے حل کا شور ہونے لگا۔ کانگرس نے بھی اس مسئلہ میں خاص دلچسپی لینی شروع کی۔

گوہاٹی کانگرس کا ریزولیوشن

۱۹۲۶ء کے آخری ایام میں کانگرس کا اکتالیسواں اجلاس آسام کے شہر گوہاٹی میں ہوا۔

اس اجلاس میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی :-

"یہ کانگرس مجلس عاملہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ہندو مسلم رہنماؤں سے مشورہ کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں کے موجودہ قابل افسوس اختلافات کو مٹانے کے لیے تجاویز مرتب کرنے کی خاطر فوری قدم اٹھائے اور اپنی رپورٹ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء تک پیش کرے"

"اور یہ کانگرس آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو اختیار دیتی ہے کہ وہ اس بارے میں ملک بھر کے سب کانگرسیوں کو ہدایات دے اور مذکورہ بالا رپورٹ پر غور کرنے کے بعد جو اقدام مناسب سمجھے کرے"۔

مجلس عاملہ نے یکم جنوری کو کلکتہ میں اجلاس کر کے صدر کانگرس مسٹر سری نواس آئینگر کو اختیار دیا کہ وہ مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے ہندو اور مسلم ارکان کی ایک کانفرنس بلائیں تاکہ ہندو اور مسلم اتحاد کا کام جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ مسٹر سری نواس نے سب ممبروں کو یکجا بلانے سے پہلے ان کے ساتھ علیحدہ علیحدہ گفتگو شروع کر دی۔ اسمبلی کے اجلاس کے اختتام پر انہوں نے ایک اپیل بھی شائع کی، جس میں باہمی اتحاد پر بے حد زور دیا گیا اور اختلافات کو دور کرنے کی تاکید کی گئی۔

فرقہ وارانہ انتخاب کے سلسلے میں ترمیم

۱۷ مارچ ۱۹۲۷ء کو نئی دلی میں کانگرس کے ہندو ممبروں کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں اس مسئلہ پر تبادلہ خیالات کیا گیا کہ فرقہ وارانہ انتخاب کے موجودہ سلسلہ میں کیا کیا ترمیم کی جانی چاہیے۔ کچھ مسلم رہنما اسی روز ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان پر جمع ہوئے اور انہوں نے بھی حالات کا جائزہ لیا۔ باقی ہندو رہنماؤں نے بھی ان دنوں اس مسئلہ پر غور و خوض کیا۔

مشہور دلی تجاویز

۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو تقریباً ۳۰ مسلم رہنما ویسٹرن ہوٹل میں جمع ہوئے اور انہوں نے موجودہ

فرقہ وارانہ انتخاب کے سلسلے میں تبدیلیوں یا ترمیموں کے متعلق چھ گھنٹے تک سوچ بچار کی ان رہنماؤں میں مسٹر جناح، مہاراجہ محمود آباد، سر محمد شفیع، سر ذوالفقار علی خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، سر عبدالقیوم، سر عبدالقادر، سر محمد یعقوب بھی شامل تھے۔ مسٹر جناح اس جلسہ کے صدر تھے انہوں نے حاضرین کو صورت حال سے آگاہ کیا اور صدر کانگرس نے جو مختلف متبادل تجاویز بھیجی تھیں۔ انہیں پڑھ کر سنایا یہ تجاویز زیادہ مخلوط انتخاب کی بنیاد پر تھیں۔

طویل بحث وتمحیص کے بعد اس جلسہ نے خاص شرائط کے ساتھ مخلوط انتخاب کو منظور کر لیا اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ "آئین اساسی کے کسی آئندہ خاکے میں مجالس آئین ساز میں نمائندگی کے متعلق مسلمانوں کو مذکورہ ذیل تجاویز کی بنیاد پر سمجھوتہ منظور کر لینا چاہیے"۔

(۱) سندھ کو بمبئی کے صوبے سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنایا جائے۔

(۲) شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں اصلاحات اسی نہج پر رائج ہونی چاہئیں جس نہج پر وہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں رائج ہوں۔ اس صورت میں مسلمان ان تمام صوبوں میں مشترکہ انتخاب قبول کرنے کو تیار ہیں۔ اور وہ اس بات پر بھی رضامند ہیں کہ وہ بنگال، پنجاب، سرحد اور دوسرے صوبوں میں ہندو اقلیتوں کو وہی مراعات دیں جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو دی جائیں۔

(۳) پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کے تناسب سے ہوگا۔

(۴) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو کم از کم ایک تہائی نمائندگی ملے گی۔ اور وہ بھی مخلوط انتخاب سے۔

"ان تجاویز کی تصدیق مسلم جماعتوں کی طرف سے ہوگی۔ لیکن حاضرین کو امید ہے کہ ہندو ان تجاویز کو قبول کر لیں گے۔ اور مسلمان جماعتیں ان پر مہر تصدیق ثبت کر دیں گی"۔

"ملازمتوں کے سوال اور دوسرے مسئلے جو ایسے قانونی مسودوں یا تحریکوں کے بارے میں تحفظات کے متعلق ہوں جو کسی فرقہ کے مذہب یا رواج ورسم پر اثر انداز ہوں یا جن کا مختلف فرقوں کے باہمی مفاد پر اثر پڑتا ہو۔ ان پر بھی جلسے میں بحث کی گئی۔ مگر اس کو ملتوی کر دیا گیا۔ اور ان پر دوبارہ اس وقت غور ہوگا۔ جب اس بڑی تجویز کو مقبولیت عام حاصل ہو جائیگی"۔

مخلوط انتخاب کے لیے مسلمانوں کا اقدام

ان تجاویز سے صاف ظاہر ہے کہ سب سے اوّل مسلمانوں نے ہی مخلوط انتخاب قبول کرنے کے لیے قدم اٹھایا۔ گو مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جداگانہ انتخاب کے حق میں تھا۔ پھر بھی مسلم رہنماؤں نے جن میں ہر خیال کے لوگ شامل تھے۔ مثلاً انتہا پسند مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری، قدامت پسند سر محمد شفیع، سر عبدالقیوم، سر ذوالفقار علی اور ان کے بین بین مسٹر جناح اور مولانا شفیع داؤدی نے اپنی قوم کو مخلوط انتخاب کا یہ فارمولا منظور کرنے کے لیے کہا۔ اس فارمولا سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہونا لازمی تھا۔ مگر انہوں نے اس اختلاف کو بھی گوارا کیا اور ہندو مسلم مفاہمت اور ہندوستان کی یگانگت اور مرکزیت کو قائم رکھنے کے لیے ہندوؤں کا ساتھ دینے اور اپنے مسلم بھائیوں سے تھوڑی یا بہت مخالفت مول لینے کا حوصلہ کیا۔ اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ ان تجاویز کا کیسا استقبال ہوا۔

کانگرس کی مجلس عاملہ کا محتاط اظہار خیال

ان تجاویز کے پیش ہونے کے اگلے روز ہی یعنی ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس نئی دہلی میں ہوا اور اس میں یہ تجویز منظور کی گئی:۔

مجلس عاملہ نے ہندوستان بھر کے مسلم نمائندوں کی غیر رسمی کانفرنس کی کارروائی پر غور و خوض کیا ہے اور ساتھ ہی کانگرس پارٹی کے ہندو ممبروں کے جلسہ کی روئداد پر بھی جو پچھلے ہفتہ ہوا تھا۔ مجلس عاملہ اس غیر رسمی کانفرنس کے اس فیصلہ پر دلی پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے کہ تمام ملک میں اقلیتوں کے باہمی تحفظ کے ساتھ سارے ملک میں مشترکہ انتخاب کے طریق کو قبول کر لیا جائے۔ مندرجہ ذیل سب کمیٹی بنائی جاتی ہے تاکہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے نمائندوں کے ساتھ تفصیلات پر بحث کرے۔ مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر سری نواس آئینگر اور مولانا محمد علی۔ مجلس عاملہ کو امید ہے کہ اس بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تسلی بخش سمجھوتہ جلد ہی عمل میں لایا جائے گا۔

اس طرح کانگرس کی مجلس عاملہ نے مخلوط انتخاب اور اقلیتوں کے متقابل حقوق پر خاص

زور دیا اور باقی مسائل کو تفصیلات قرار دے کر گفتگو نے مفاہمت کی طرح ڈالی۔

غیر کانگرسی ہندو ممبروں کا روّیہ

مرکزی مجالس قانون ساز کے غیر کانگرسی ہندو ممبروں نے پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں ۲۴ مارچ کو اس مسئلہ پر بحث وتمحیص کی اور انہوں نے مندرجہ ذیل اصولوں کو بنائے گفتگو قرار دیا۔

۱:- ملک کی تمام مجالس قانون ساز کے لیے انتخاب مخلوط ہو۔

۲- ملک کی تمام مجالس قانون ساز میں آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کی جائیں۔

۳- مذہبی اور نیم مذہبی حقوق کی حفاظت کے لیے آئین ملکی میں تحفظات مقرر کیے جائیں۔

۴- صوبوں کی زبان یا دیگر ضروری وجوہ کی بنا پر از سرِ نو تقسیم کا مسئلہ غور کے لیے کھلا چھوڑا جاتے۔ غیر کانگرسی ہندوؤں کے اس فیصلہ نے کانگرس کی محتاط روش سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اس نے صوبوں کی تقسیم کے مسئلہ کو کھٹائی میں ڈالنا چاہا۔ اور محض مخلوط انتخاب کو ہی اپنانا شروع کیا۔ ساتھ ہی اس نے مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دیئے جانے کی مخالفت کر دی۔

پنجاب کی ہندو سبھا

۲۴ مارچ کو پنجاب کی ہندو سبھا نے بھی ایک تجویز منظور کی۔ جس میں کہا گیا کہ انڈین نیشنل کانگرس کو مسلمان جماعتوں سے گفتگو کرتے وقت ہندوؤں کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں ہے، اس کا کوئی سمجھوتہ ہندوؤں کو پابند نہیں کرے گا۔ اور ہندو مہاسبھا ہی ایسے معاملات کو طے کر سکتی ہے۔

سکھوں کا نقطۂ نگاہ

۲۵ مارچ کو سردار منگل سنگھ نے جو ان دنوں سنٹرل سکھ لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے، انڈین

نیشنل کانگرس کے صدر کے نام ایک خط لکھا جس میں اور باتوں کے علاوہ کہا گیا کہ "سکھوں میں اس مسئلہ پر اتفاق رائے ہے کہ جداگانہ انتخاب قومیت کی ترقی کے راستے میں حائل ہے اس لیے وہ اس بڑے اصول کو کلیتہً ختم کرنے کے حق میں ہیں۔ بشرطیکہ مسلمان اس کو کلیتہً ترک کرنے کا فیصلہ کریں۔ بہتر ہوتا کہ وہ جرأت سے کام لیتے اور نشستوں کی تخصیص کے بغیر مخلوط انتخاب کو قبول کرتے۔ مگر موجودہ حالات میں مخلوط انتخاب کو نشستوں کی تخصیص کے ساتھ بھی خوش آمدید کہنا چاہیئے۔ مسلمان دوستوں نے بڑی فیاضی سے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ غیر مسلم اقلیتوں کو سندھ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں وہی رعائتیں دینے کو تیار ہیں جو مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں ملیں گے لیکن انھوں نے بڑی ہوشیاری سے پنجاب کے معاملے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سکھوں کا کیا بنے گا؟ میں پوچھتا ہوں کہ وہ بہار اور یوپی کے مسلمانوں کی طرح ایک اقلیت نہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ان سے نئے نظام میں کیا سلوک کیا جائیگا۔۔۔

جو بات میں آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پنجاب کے خاص حالات کو زیر غور لانا چاہیے اور سکھوں کے لیئے مناسب نمائندگی کا انتظام کیا جانا چاہیے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ سکھ ایک اہم اقلیت ہیں، جو بہت بڑی حیثیت رکھتی ہے۔"

نہرو رپورٹ

جب ان کوششوں میں ناکامی ہوئی تو ۱۹۲۷ء کے آخر میں مدراس کانگرس نے فیصلہ کیا کہ سوراج کا آئین مرتب کرنے کے لیے دہلی میں مارچ ۱۹۲۸ء سے قبل ایک خاص کنونشن بلائی جائے۔ اس اجتماع خاص میں ہندوستان کی بہت سی جماعتوں کو مدعو کیا گیا اور انھوں نے اس کارروائی میں حصہ لیا۔

نہرو کمیٹی

آئین کی ترتیب کے لیے ایک مختصر سی کمیٹی مقرر کی گئی جس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو بنائے گئے۔ اس کے ارکان حسب ذیل تھے۔

سر علی امام، مسٹر شعیب قریشی، مسٹر انیے، مسٹر جیکار، مسٹر پردھان، سردار منگل سنگھ، سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جوشی۔

مسٹر جیکار نے کہا کہ وہ کمیٹی میں کام کرنے کے ناقابل ہیں۔ اور مسٹر جوشی نے کہا کہ وہ فقط اس وقت حصہ لیں گے جب مزدوروں کے معاملات زیر غور ہوں۔ سر علی امام علالت کے سبب سوائے ایک کے اور کسی اجلاس میں حصہ نہ لے سکے۔

اس کمیٹی کی رپورٹ کو پنڈت نہرو کی صدارت کے باعث نہرو رپورٹ کا نام دیا گیا۔

فرقہ وارانہ فیصلے

نہرو رپورٹ کے فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق حسب ذیل امور قابل ذکر ہیں:

(۱) یہ فیصلہ کیا گیا کہ جداگانہ انتخاب کو ختم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ مخلوط انتخاب کو رائج کیا جائے۔ اس فیصلہ کی بنیاد یہ تخیل تھا کہ جداگانہ انتخاب سے متحدہ قومیت پیدا نہیں ہو سکتی اور مخلوط انتخاب اس کا عمدہ ذریعہ ہے۔

(۲) مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستوں کا تعین بھی غیر مفید قرار دیا گیا۔ مگر جب یہ سمجھا گیا کہ اس صورت میں مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی تقریباً نفی کے برابر رہ جائے گی تو فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں حاصل شدہ پاسنگ سے محروم کر دیا جائے اور اس کی بجائے ان کو آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ مگر ان کو یہ حق ہے کہ وہ مزید نشستوں کو جیتنے کی کوشش کر سکیں۔

(۳) پنجاب اور بنگال میں انتخابات کو کھلا رکھا گیا۔ اور کسی کے لیے کوئی نشست مخصوص نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(۴) مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دینے سے انکار کیا گیا اور ان کو اسی تناسب سے نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو صوبجاتی نشستوں کے فیصلے کی رو سے انہیں مرکز میں حاصل ہو سکیں۔

مسلمانوں پر اثر

ان فیصلوں کی رُو سے مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں موجودہ حصے سے کم تجویز کیا گیا۔ پنجاب اور بنگال میں ان کو قسمت آزمائی کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ اور مرکز میں انہیں ایک تہائی کا یقین دلانے سے بھی انکار کیا گیا۔

پنجاب کا جھگڑا

مرکز کا فیصلہ ابھی معلق تھا کہ صوبوں کے متعلق بحث و تمحیص ہونے لگی۔ جہاں تک مسلم اقلیت کے صوبوں کا تعلق ہے ان مسلم نمائندوں نے جو آزاد خیال جماعتوں کی طرف سے نمائندگی کر رہے تھے۔ ان تجاویز کو جو ان صوبوں سے متعلق تھیں۔ اس امید اور تمنا میں بلا احتجاج منظور کر لیا کہ پنجاب کے معاملے میں جھگڑا ہو جائے گا۔ پنجاب کے مسلم نمائندے نشستوں کی تخصیص کے بغیر نہرو رپورٹ کے فارمولے کو تسلیم نہیں کریں گے اور اس طرح ان کی قوم پرستی پر بھی دھبہ نہ لگے گا اور نہرو رپورٹ کی پابندیوں سے قدم آزاد بھی ہو جائیں گے۔

لیکن اور صوبوں کا فیصلہ ہوتے دیکھ کر محض پنجاب کا جھگڑا چکانا باقی رہ جاتا تھا۔ اس لیے سب بزرگوں نے پنجاب کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔

سکھوں کا رویہ

سکھ نمائندوں کا رویہ بھی اسی بنیاد پر مبنی تھا کہ پنجاب کے مسلم رہنما نہرو رپورٹ کے فارمولے کو تسلیم نہ کریں گے۔ اور اس طرح ان کا دامن بھی فرقہ پرستی کے داغ سے آلودہ نہ ہوگا۔ اس لیے وہ بھی سکھوں کے لیے خاص نمائندگی کے دعوے کرنے کے بعد خالص قوم پرستی کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بالآخر اس فارمولے پر اتفاق ہوا:

(۱) ہر بالغ کو حق رائے دہی عطا کیا جائے۔

(۲) حلقہ ہائے انتخاب مخلوط ہوں۔

(۳) کسی اکثریت یا اقلیت کے لیے نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

(۴) درجہ نوآبادیات کی حکومت قائم ہو۔

(۵) دس سال تک مذکورہ بالا شرائط پر عمل کرنے کے بعد اگر کوئی فرقہ ضروری سمجھے تو فرقہ وارانہ نیابت کا سوال از سر نو زیر غور لایا جائے۔

مسلمانوں کی کیفیت

جبتک پنجاب کے مسلم رہنماؤں نے اس فارمولے کو تسلیم نہ کیا سب ہندو اور سکھ انہیں تسلیم کرنے کی تاکید کر رہے تھے اور قوم پرستی کی کشتی کے ناخدا بننے کے لیے کہہ رہے تھے ادھر مسلم اقلیت کے صوبوں کے رہنما چپکے چپکے انہیں اس فارمولے کو مسترد کرنے کے لیے کہہ رہے تھے کہ وہ اپنی غلط روش کے خمیازہ سے بچ نکلیں۔ مگر پنجاب کے مسلم رہنماؤں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اس فارمولے کو منظور کر کے ایک مرتبہ پھر اپنی قوم پرستی کا ثبوت دے ہی دیں۔ ان کا اس فارمولا پر دستخط کرنا ہی تھا کہ سکھوں اور ان کے ساتھ ہندوؤں کے اوسان خطا ہونے لگے۔ دیں اس فارمولے سے بیزاری اور اختلاف کا کم و بیش مظاہرہ شروع ہونے لگا۔

مسلمانوں پر اس فیصلہ کا اثر

مسلمانوں کے ایک فریق نے جو جداگانہ انتخاب کا حامی تھا۔ اس فیصلہ پر دستخط کرنے والوں کو اسلامی حقوق کا قاتل کہہ کر پروپیگنڈہ شروع کیا مسلمانوں میں خوب لے دے ہوئی۔ جلسوں میں نوبت تو تو میں میں بلکہ ہاتھا پائی تک نوبت آئی۔ لیکن چند روز کے پروپیگنڈا کے بعد مسلمانوں کو سمجھ آنے لگی کہ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے مسلمان صوبجاتی معاملہ میں نہرو رپورٹ کے اس مشروط فیصلے سے کچھ ایسے خسارے میں نہیں رہتے۔ چنانچہ عام رجحان اس فیصلہ کے حق میں ہونے لگا۔

سکھوں اور ہندوؤں پر اس کا اثر

جہاں تک ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق ہے انہوں نے ان نتائج کے خلاف آواز اٹھا

شروع کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے نہرو رپورٹ کا ایک ضمیمہ شائع کیا تھا جس میں اعداد و شمار کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ بنگال اور پنجاب میں مسلم اور غیر مسلم آبادیاں اس طرح سے تقسیم ہوئی ہیں کہ مسلمان ان دونوں صوبوں میں نہ فقط آبادی کے لحاظ سے نشستیں لے جا سکیں گے بلکہ اغلب ہے کہ اس سے بھی زیادہ نشستیں حاصل کر سکیں۔ جو بات پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کو آمادہ کرنے کے لیے کی تھی، وہی ہندوؤں اور سکھوں کو پریشان کرنے کا باعث ہوئی۔ جوں جوں دن گزرنے لگے۔ انہیں مسلم اکثریت کا ہوا ڈرانے لگا۔ ہندوؤں نے سکھوں کو اپنی ڈھال بنایا اور انہیں اس فارمولے کے خلاف اکسایا۔

پنجاب کے ہندوؤں کے علاوہ پنڈت مدن موہن مالویہ اور خود گاندھی جی بھی سکھوں کے ہمنوا ہوتے اور انہوں نے سکھوں سے صاف صاف کہا کہ اس فیصلہ میں ان سے ظلم ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں میں اس فارمولے کی مخالفت زیادہ ہونے لگی حتیٰ کہ وہ لوگ جنہوں نے اس فارمولا پر لکھنؤ میں دستخط کیے تھے۔ اس اعلان پر مجبور ہوئے کہ چونکہ ہماری قوم اس فارمولا کو قبول نہیں کرتی۔ اس لیے ہم اپنی قوم کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور اس فارمولے کی موافقت سے دستبردار ہوتے ہیں۔

آئینی صورت حال کے یہ تقاضے تھے جنہوں نے پنجاب کے ان پرانے "خلافتیوں" کو نیا محاذ بنانے پر مجبور کیا۔ دراصل یہ ردعمل تھا نہرو رپورٹ کی حمایت اور مخالفت کا۔ چونکہ کانگرس دن بدن مسلمانوں کے مطالبات سے منہ موڑتی جا رہی تھی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ ملازمتوں میں اپنا تحفظ چاہتا تھا اور کیونکہ پچھلے دس سال کے اندر مسلمان امراء کے بیٹے بھانجے پڑھ لکھ کر ملازمتوں میں نمایاں حیثیت حاصل کرنے کے خواہش مند تھے اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ پنجاب میں ان کو پورے اختیارات کی حکومت میسر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کے زمیندار اور اوپری طبقہ کے سیاستدان ہمیشہ ہی یونینسٹ کے مخالف رہے ہیں۔ چنانچہ جب آئینی اصلاحات کا مسئلہ شروع ہونے لگا تو یہاں اسی زمانے میں ایک اور تحریک ابھری، جو چھپن فیصدی کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ چھپن فیصدی کی تحریک اپنے تمام عوامی کردار کے باوجود اوپری طبقے

کی بزرگوں کی نظر تھی، اور اس تحریک کے خدوخال جاننے کے لیے اس تحریک پر ذرا تفصیل سے بات کرنا ضروری ہو گی۔

چھپن فیصدی حقوق کی تحریک

سنہ ۱۹۲۹ء کا سال تھا اور نومبر کا مہینہ!.....

لاہور کے گلی کوچوں میں یہ اشتہارات لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے، یہ ایک نئی تحریک کے آغاز کا اعلان تھا۔ اس کے بعد اس تحریک کا چرچا روز بروز بڑھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے ہر گلی کوچے میں اس کے نعرے گونجنے لگے، جلسے ہونے لگے، رضاکاروں کی بھرتی کا اعلان ہونے لگا۔ چھپن فیصد رضاکاروں کی تنظیم وجود میں آئی۔ خاکی بند گلے کا کوٹ، خاکی پتلون، سر پر کھال کی سیاہ ٹوپی، جس پر چھپن فیصد کا نعرہ چھپا ہوا تھا۔ اس چھپن فیصد کور کے رضاکاروں کی وردی قرار پائی۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک پنجاب کے اکثر شہروں میں پھیلنے لگی۔ اور دو تین مہینے پنجاب کے مسلمانوں کی زندگی میں اس کا بہت ہی چرچا رہا۔ اس کے حامی و مخالف آپس میں گتھم گتھا بھی ہوئے۔ ایک دوسرے کے جلسوں کو درہم برہم کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ بیان بازیاں بھی ہوئیں۔ نہتوں پر حملے بھی ہوتے۔ یہ سبھی کچھ ہوا، یہ تحریک، خاموشی کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی ڈوب گئی، اور پھر کسی نے اس کا نام بھی نہ لیا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ایک ایسی آواز ضرور بلند کی۔ جو پنجاب کے مسلمانوں کے لیے بہت ہی اہم تھی، دراصل یہ وہ آواز تھی جس نے بعد میں ایک زبردست تحریک کا روپ اختیار کر لیا۔ اور سنہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۹ء میں پنجاب کے مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق اور آبادی کے مطابق مجالس قانون ساز میں نمائندگی حاصل کرنے کے لیے بھی جدوجہد کرنا پڑی تھی، لطف یہ ہے کہ اس مطالبے کی مخالفت ہندوؤں کے ساتھ ساتھ خود مسلمانوں کی طرف سے بھی ہوتی تھی، اس لحاظ سے بیسویں صدی کی یہ تیسری دہائی (۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۹ء) بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس برصغیر میں مختلف اقوام کے درمیان ایکتا کی سب سے کامیاب تحریک اسی دہائی میں چلی، اور ہندو مسلم فسادات بھی اسی دہائی میں سب سے زیادہ ہوئے

انگریزوں کے خلاف منظم تحریک بھی اسی دہائی میں چلی اور اس تحریک کی ناکامی اور اس کے مہلک نتائج بھی اسی دہائی کو برداشت کرنے پڑے۔

تحریک کا آغاز

چھپن فیصد حقوق کی تحریک کا آغاز ہی خاصا دلچسپ تھا۔ اس کے مقاصد دو دھاری تلوار کی طرح کے تھے۔ اس کی پشت پر جو اذہان کام کر رہے تھے وہ اپنی ذہانت کے لیے اپنے وقت میں خاصی شہرت کے مالک تھے۔ آج سالہا سال بعد ان تمام پہلوؤں پر کھل کر بات کرنا قدرے آسان ہے اگر آج کچھ حلقوں میں بعض شخصیتوں کے متعلق جذبات مرتعش ہو سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود وقت نے جذبات کو تاریخ کے سپرد کر دیا ہے کہ آج ان مختلف واقعات کے بارے میں تفصیل سے بات چیت کی جا سکتی ہے۔

چھپن فیصد کی یہ تحریک روزنامہ "انقلاب" کی پیدا کردہ تھی۔ روزنامہ مذکور پنجاب کے حاکم مسلمانوں کی آواز سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح کسی زمانے میں عربوں میں یہ ضرب المثل مشہور تھی کہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی جاننی ہو تو نوری السعید پاشا کی حرکات پر نگاہ رکھو، اسی طرح پنجاب میں روزنامہ انقلاب کی پالیسی حاکم مسلمانوں کی آواز سمجھی جاتی تھی، پنجاب کے حاکم مسلمانوں کی خواہشوں اور ارادوں کو جاننے کے لیے انقلاب کے صفحات اور سالک و مہر کے افتتاحیوں اور افکار و حوادث پر نگاہ رکھنی پڑتی تھی۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ انقلاب کا مسلک کسی بدنیتی پر مبنی تھا۔ اس سے اختلاف ہو سکتا ہے اور اپنے زمانے میں اکثر بزرگوں کو اس سے اختلاف رہا لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ پنجاب کے مسلمان حاکموں کے مسلک اور ان کے طریق کار کو سالک و مہر نے صدق دل سے قبول کیا تھا اور وہ ہمیشہ اس مسلک کے زبردست مؤید رہے۔ یہ مسلک وہی تھا جو سر فضل حسین نے اختیار کیا تھا اور جس کے حصول کے لیے انہوں نے یونی نسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ آج یونی نسٹ پارٹی کا نام آتے ہی ہمیں خضر حیات کا نام یاد آجاتا ہے۔ اس لیے ہم جذبات سے مغلوب ہو کر صحیح رائے قائم نہیں کر پاتے۔ لیکن یونی نسٹ پارٹی کے قیام کا موضوع اپنی جگہ پر الگ سے اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے متعلق تحقیق کرنے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر

روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ بہر حال پچپن فیصد تحریک کا عوامی آغاز بھی سر فضل حسین کی ذہانت ہی کا نتیجہ دکھائی دیتا ہے۔ اس آغاز کا تعلق اس زمانے سے ہے جب علم الدین شہید کی نعش کے حصول کی تحریک چلی تھی اور سر شفیع اور سر فضل حسین کی بدولت سے نعش مل گئی تھی۔ اس کامیابی کا سہرا علم الدین شہید کمیٹی کو حاصل ہوا تھا۔ اس کمیٹی کے کرتا دھرتا ملک لال دین قیصر، غلام مصطفےٰ حیرت، محمد دین تاثیر، فیروز الدین احمد وغیرہ تھے، چنانچہ جیسے ہی یہ تحریک ختم ہوئی "انقلاب" نے ۱۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو ایک اداریہ سپرد قلم کیا۔ اس اداریے کا عنوان تھا:

"ملک لال دین قیصر سے خطاب

شہید علم الدین کی میت سے ایک اہم سبق":

اس پورے اداریے میں ملک لال دین قیصر اور ان کے رفقاء کی بہادری اور جوانمردی کی تعریف تھی۔ اور ان سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اب مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوں چنانچہ اداریہ میں کہا گیا تھا:

> "آج ہم انتہائی دلسوزی کے ساتھ قیصر اور ان کے رفقاء سے عرض کرتے ہیں کہ وہ ملت اسلامیہ ہند کے زہرہ گداز مصائب پر بھی توجہ مبذول فرمائیں، مسلمان افتراق سے دوچار ہو چکے ہیں۔ فرقہ بندی میں اپنی حکومت کھو چکے ہیں، ان کی تعداد کم نہیں، ان میں ہمت و جرأت کا فقدان نہیں۔ ان میں قربانیوں کا جوش و خروش موجود ہے، مگر ان کی ساری قوتیں خانہ جنگی میں ضائع ہو رہی ہیں، وقت نازک ہے، حالات اضطراب انگیز ہیں، ہندو متحد ہیں اور قدم قدم پر فائدے اٹھا رہے ہیں۔ مسلمان متفرق و منتشر ہیں اور ہر جگہ نقصان و خسران سے تباہ ہو رہے ہیں۔ گاندھی جی جو خود حریت حقہ سے بے بہرہ ہیں۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ اس کی دعوے داری حریت مالویہ کی حکومت پرستی سے قطعاً شرمسار نہیں ہوتی، وہ مالویہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے ہیں، اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو،

سری نواس آئنگر اور تمام دوسرے ہندوؤں کی یہی حالت ہے۔ مگر مسلمانوں کا کوئی ابوالکلام کسی محمد علی سے ملنے کے لیے تیار نہیں۔ کوئی انصاری کسی اقبال یا شفیع سے بات کرنے کا روادار نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ابوالکلام اور انصاری بھی تباہ حال ہیں اور ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہیں۔ اور محمد علی، اقبال اور شفیع کی تمام مساعی بھی بے نتیجہ اور بے اثر ہیں۔ کیا کوئی اللہ کا بندہ ان درد انگیز حالات کی درستی کے لیے اٹھے گا۔"

۱۸ نومبر کے انقلاب میں ملک لال دین قیصر کے نام یہ اپیل کی گئی تھی، اب اس اپیل کے دوسرے دن ہی "انقلاب" کی ایک خبر جلی حروف میں شائع کی گئی تھی، ملاحظہ ہو اس خبر کی سرخیاں یہ تھیں۔

"کانگرس کو مسلمانوں کا آخری الٹی میٹم

لاہور میں حفاظت حقوق کی مہم شروع ہو گئی

مسلم الدین کمیٹی کے مجاہدوں کا نیا میدان عمل، چھپن فیصد کمیٹی اور کور کا قیام"

۱۹ نومبر کی شام کو عبدالمجید سالک کی صدارت میں درد دل رکھنے والے مسلمانوں کا ایک جلسہ دفتر انقلاب میں منعقد ہوا۔ اس میں موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ اور طویل بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ حفاظت حقوق کے لیے ایک جماعت بنائی جائے۔ اسی اجلاس میں ایک رضا کار کور بنانے کا فیصلہ بھی ہوا اور یہ بھی طے پایا کہ ہر رضا کار جو اس کور میں بھرتی ہو ایک حلف اٹھائے۔

حلف نامہ

"میں چھپن فیصد کور میں شامل ہوتا ہوں، اور خدائے واحد کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے جملہ حقوق کی حفاظت کے لیے قربانی پر آمادہ رہوں گا۔ اس سلسلے میں جماعت مجھے جو حکم دے گی، اس کی پوری پوری تعمیل کروں گا۔"

اس اجلاس میں اس جماعت کی ایک مجلس عامہ اور مجلس عاملہ بھی منتخب کی گئیں۔

مجلس عامہ

سید عبد القادر پروفیسر اسلامیہ کالج، ملک لال دین قیصر، شیخ غلام مصطفےٰ حیرت، ملک عبد المجید ایڈیٹر مسلم آؤٹ لک، اختر علی خاں مدیر زمیندار، سید عنایت شاہ، مالک سیاست، غلام رسول مہر، عبد المجید قرشی، محمد دین تاثیر پروفیسر اسلامیہ کالج شمس الدین حسن ایڈیٹر خاور، میر عزیز الرحمان، مسٹر امام علی نازش رضوی،

مجلس عاملہ

پروفیسر سید عبد القادر، ملک لال دین قیصر، شیخ غلام مصطفےٰ حیرت، پروفیسر محمد دین تاثیر، عبد المجید قرشی پر مشتمل تھی۔ عبد المجید قرشی کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اور طے کیا گیا کہ مجلس عاملہ اپنے اختیارات سے دو ممبروں کو نامزد کر سکتی ہے۔ اس جماعت کا دفتر غالباً کوچہ چابک سواراں میں قائم کیا گیا تھا۔ کیونکہ شیخ غلام مصطفےٰ حیرت کوچہ چابک سواراں میں رہتے تھے اور ملک لال دین قیصر بھی قریب ہی کوچہ گگے زئیاں میں رہائش پذیر تھے علم الدین کمیٹی کا دفتر بھی کوچہ چابک سواراں میں شیخ غلام مصطفےٰ حیرت کی بیٹھک پر ہی بنا تھا۔ چنانچہ اسی جگہ چھپن فیصد کمیٹی کا دفتر قائم کر دیا گیا۔ رضا کاروں کی کور کے مہتمم بھی شیخ غلام مصطفےٰ حیرت ہی مقرر ہوئے۔

شیخ غلام مصطفےٰ حیرت کی یہ بیٹھک اس زمانے میں شعر و سیاست سے دلچسپی رکھنے والے باغی قسم کے نوجوانوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ شیخ غلام مصطفےٰ حیرت مشن اسکول کے سامنے مسجد فضل الٰہی کے نیچے سٹیشنری کی دکان کیا کرتے تھے، چنانچہ دن کو ان کی یہ دکان ان نوجوانوں کا اڈہ ہوتی، اور شام کو اندرون کوچہ چابک سواراں میں ان کی بیٹھک میں یہ سب نوجوان جمع ہوتے۔ اسی بیٹھک سے اپنے وقت کا مشہور ادبی ماہنامہ "فردوس"

جاری ہوا۔ یہ فردوس حیرت اور بدرالدین بدر کی مشترکہ ادارت میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اور اس میں تاثیر، مجید ملک، صوفی تبسم، چراغ حسن حسرت، پطرس بھی لکھا کرتے تھے۔

ملک لال دین قیصر اور شیخ غلام مصطفےٰ حیرت دونوں جگری دوست تھے۔ ملک لال دین قیصر تو مولانا عبدالمجید سالک کے ہم زلف تھے۔ اور اس لیے سالک اور مہر کو ملک لال دین قیصر کا پاس بھی بہت ہوتا تھا۔ ویسے بھی ملک لال دین قیصر اپنے زمانے میں بہت جیالے جوان تھے، اور ان کے پنجابی شعروں میں انگارے ہوا کرتے تھے جلیانوالہ باغ کے حادثے کے بعد جب یہاں لاہور میں مارشل لار لگا، اس میں لال دین قیصر کو بھی سزائے موت ہوئی تھی، لیکن جب عام معافی ہوئی تو اس میں ان کی جان بخشی ہو گئی تھی۔

پنجاب خلافت کمیٹی

اب اس وقت چھپن فیصد تحریک کے لیے قریہ قریہ جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور انقلاب نے اس تحریک کو خوب اچھالا، اور پنجاب خلافت کمیٹی نے جس پر اسوقت مجلس احرار کے قائدین کا قبضہ تھا۔ اس تحریک کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ چنانچہ ۲۶ نومبر ۲۹ء کو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا ایک طویل بیان زمیندار میں شائع ہوا۔

"چھپن فیصدی حقوق کا مطالبہ کرنے والے مسلمانوں کو اپنے حقوق منوانے کے لیے یہی موقع نصیب ہوتا تھا۔ وہ کھل کر یہ بات کیوں نہیں کرتے کہ کانگرس مکمل آزادی کے لیے جو جدوجہد شروع کرنے والی ہے اس میں انتشار و اختلاف پیدا کرنے کے لیے یہی موقع ہے۔ اور اسی موقع پر مسلمانوں کے حقوق کا سوال اٹھایا جانا چاہیئے۔"

راست اقدام کے حامی

ان بانیان احرار کا ایک اور بنیادی تضاد بھی تھا۔ جس سے یہ تمام عمر چھٹکارا نہ پا سکے اور نہ اس تضاد کو حل کر سکے، حقیقت یہ ہے کہ یہ تضاد بھی ان کے اور ان کی جماعت کے

طبقاتی حیثیت کی پیداوار ہی تھا۔ لیکن نہ تو یہ جیالے لیڈر اپنے طبقے کی خصوصیات، حدود اور قیود کو بھانپ سکے اور نہ ان کو توڑ سکے تاہم بنیادی طور پر بانیان احرار کی اکثریت سامراج دشمن جذبے کی مظہر تھی۔ اور اس کے اظہار کے لیے وہ ایک ہی راہ پر یقین رکھتے تھے اور وہ راہ وہی تھی جو عدم تعاون کی تحریک نے متعین کی تھی کہ عوام کو متحرک کرو، ان کو اتنی تعداد میں جیلوں میں لے جاؤ، کہ حکومت کی مشینری معطل ہو جائے اور وہ عوامی تحریک کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ یہ ایک مبہم سا خاکہ تھا جس میں وہ تمام عمر الجھے رہے لیکن عملاً ہوا کیا کہ عدم تعاون تحریک کی ناکامی کے بعد سالہا سال تک عوامی تحریک کے راست اقدام کی راہ آنکھوں سے دور اور دور ہٹتی گئی اور چاروں طرف ہندو مسلم فسادات اور تلخیاں ابھرتی رہیں، جب وہ تھمیں تو آئینی موشگافیاں اٹھ کھڑی ہوئیں اور یہ دونوں میدان ایسے تھے جن میں یہ پرانے خلافتی کھلاڑی نہیں ہو سکتے تھے۔ نہ تو وہ فرقہ پرست مسلمان کے انداز میں سوچنے کی عادت ڈال سکتے تھے، اور نہ ہی وہ آئینی محاذ پر کارہائے نمایاں کرنے کے جوہر رکھتے تھے، کیونکہ اس نچلے درمیانہ طبقے کے پاس نہ تو ووٹ تھا اور نہ ان آئینی موشگافیوں سے دلچسپی تھی۔ اس کی پوری جدوجہد اصل میں معاشی تھی، اس لیے کہ اس طبقے کے پاس نہ تعلیم تھی، نہ وسائل تھے اور نہ ہی خواہش تھی کہ وہ سرکاری نوکری حاصل کرے۔ اور اس کے لیے اپنے حقوق کی ضمانت طلب کرے۔ یہ خواہش اور ضرورت ایک بالکل مختلف طبقے کی تھی، اور اس طبقے کے پاس بہت ذہین و فطین قائدین موجود تھے۔ اس کو حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا داؤد غزنوی، مولوی مظہر علی اظہر، چوہدری افضل حق، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان قسم کے قائدین کی نہ ضرورت تھی اور نہ ہی یہ قائدین اس طبقے کی خواہشوں کا مظہر بن سکتے تھے۔ اور نہ ان کے جذبات کو ان کی خواہش کے مطابق زبان عطا کر سکتے تھے، لیکن بدقسمتی کو کیا کہیے کہ احرار کے قائدین اپنی حدود اور قیود کو کبھی نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے بار بار راست اقدام کی طرف دوڑنے کی کوشش کی۔ جیلوں کو بھر دیا، لیکن یہ نہ وہ جان سکے کہ جیل جانا اور ووٹ لینا۔ دو مختلف محاذ ہیں، ہندوؤں کے ہاں کی طبقاتی ساخت مختلف تھی، وہاں جیل جانے والے ووٹ بھی لے

سکتے تھے، کیوں کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، وہ وڈیروں کی تشفی کر سکتا تھا۔ ان کے حقوق کی ہر محاذ پر حفاظت کر سکنے کی سکت رکھتا تھا۔ لیکن احرار یہ فریضہ ادا کرنے کی اہل نہیں تھی۔ تاآنکہ وہ صحیح معنوں میں ایک عوامی تحریک منظم نہ کرتی۔ جس میں مسلمانوں کے تمام پسے ہوئے طبقوں کو شعوری طور پر منظم کیا جاتا لیکن ان کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ احرار کے ان قائدین میں اس ضرورت کا گو بہت مبہم احساس ضرور رہا ہے، یہی احساس ان کو سامراج دشمن کیمپ میں قائم و دائم رکھتا رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ احرار مسلمانوں کی پہلی تنظیم ہے، جس نے سامراج کی بیرونی ریشہ دوانیوں کو اپنے طبقے کی محدود فکر کے باوجود سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ہر قدم پر برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب ہی نہیں کیا۔ بلکہ مسلمانوں کے جو قائدین کسی طرح ان ریشہ دوانیوں کا شکار بھی ہوئے تو انہوں نے ڈٹ کر ان کی مخالفت کی۔ چنانچہ جب افغانستان میں برطانوی ریشہ دوانیاں، امان اللہ خان کو راستے سے ہٹانے کے منصوبے باندھ رہی تھیں تو یہ پنجاب کے پرانے خلافتی اس محاذ پر ڈٹ گئے۔ اور دراصل مرکزی خلافت کمیٹی سے ان پنجابی خلافتیوں کی یہ آخری لڑائی تھی جس کے بعد مجلس احرار کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔

مسئلہ افغانستان اور بانیان احرار

جس وقت ۱۹۲۹ء میں افغانستان میں برطانوی سامراج کی شہ پر امان اللہ خان کی حکومت کے خلاف تحریک ابھرنے لگی۔ اور ہندوستان میں بھی امان اللہ خاں کے خلاف مسلم رائے عامہ کو متاثر کرنے کی کوشش کی جانے لگی تو پنجاب خلافت کمیٹی نے ان ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی اس رائے سے انہوں نے مرکزی خلافت کمیٹی کو بھی آگاہ کیا۔ اور ان سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ اس ضمن میں اقدام کریں۔ لیکن مرکزی خلافت کمیٹی کے سیکرٹری نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو جو اس وقت پنجاب خلافت کمیٹی کے سیکرٹری تھے جو خط لکھا وہ خاصا دلچسپ تھا۔ یہ خط و کتابت اب مولانا کے

صاحبزادے عزیز الرحمٰن نے اپنے والد ماجد کی سوانح میں شائع کر دی ہے۔ چنانچہ مولانا محمد عرفان اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"مکرم بندہ مولانا حبیب الرحمٰن دام مجدہم

مسئلہ افغانستان میں آپ کی روش اور طریقہ کار معقول نہیں، ہماری ذاتی اطلاعات یہ ہیں کہ افغانستان میں سوائے چند نوجوانوں کے ایک متنفس بھی نہیں جو شاہ امان اللہ خان کی حکمتِ عملی سے موافق ہو۔ یہ مسئلہ کسی ایک گروہ کی بغاوت کا نہیں ہے۔ بلکہ تمام عمال حکومت وزراء اور تقریباً ساری پبلک کی مخالفت کا ہے اور یہ سارا کھیل کم ازکم مجھے انقلاب افغانستان سے چار ماہ پہلے معلوم تھا۔ جب علی احمد خان بمبئی میں آئے تھے تب ان سے سارے حالات معلوم ہو گئے تھے؛ اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اب آئندہ افغانستان میں ضرور کوئی نہ کوئی تبدیلی ہو گئی۔ بہرکیف ہماری معلومات یہ تھی کہ سردار علی احمد خان، جنرل نادر خان اور دونوں بھائی سردار محمد ولی خان، شیر علی خان، والدہ امان اللہ خان اس پالیسی کے موافق نہیں تھیں خود انقلاب افغانستان نے بھی یہی بات ثابت کی ہے کہ فوج اور عمال حکومت منحرف تھے ورنہ قبیلہ خوست کی بغاوت چند ہفتوں میں ختم کر دی جاتی۔ لیکن ایک بچہ سقہ کی بغاوت جسے ڈاکو کہا جاتا ہے اتنی موثر اور عالمگیر ہو کہ اس کے سامنے ساری نظامی فوج ہتھیار ڈال دے اور اپنی بے چارگی کا اعلان کر دے۔ بہرحال ہماری اطلاعات افغانی سرکاری ذرائع سے یہ ہیں کہ بچہ سقہ برائے نام ہے اور اس کی پشت پر تقریباً سارا ملک ہے۔ ایسے حالات میں جو آپ کا رویہ ہے وہ بہت نامعقول ہے اور افغانستان کے لیے تباہ کن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ امان اللہ خان سے بہتر سرزمین افغانستان کے لیے دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان کو واپس لانے کی یہ بھی تدبیر نہیں کہ تمام علمائے افغانستان کو گالیاں دی جائیں۔ اور بچہ سقہ نام کا جو ایک شخص ہے اسے "کتا" اور کیا کیا کہا جائے۔ صورت یہی ہے کہ امان اللہ خان صاحب کو بھی سمجھایا جائے کہ ساری اصلاحات عورتوں کے ننگے بدن میں نہیں رکھی ہوئی ہیں ادھر علماء اور مشائخ اور قبائل کے سرداروں کو بھی سمجھایا جائے کہ یہ چیزیں اتنی اہم نہیں ہیں۔ کہ آپ ان کی وجہ سے ذہبنی اصلاحات کی وجہ سے ایک بہتر آدمی کو ضائع کر دیں۔ بدنصیبی

یہ ہے کہ مرکزی خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں ورنہ ایک جگہ بیٹھ کر اگر کوئی مشورہ ہوتا تو سب ایک ہی رائے پر جمع ہو جاتے۔"

محمد عرفان

مولانا محمد عرفان آفس سیکرٹری مرکزی خلافت کمیٹی کے اس خط کے بعد مولانا شوکت علی نے غازی امان اللہ خان کے خلاف اخبارات میں بیان دیا۔ مولانا شوکت علی کے بیان کے جواب میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے حسب ذیل بیان دیا:

"میں یہ دیکھ کر بے حد مسرور ہوں کہ پنجاب کے قومی کارکنوں نے افغانستان کے معاملے میں بروقت رہنمائی کی ہے۔ اور یہ بات میرے لیے بہت زیادہ مسرت کا باعث ہے کہ تمام ہندو پریس اور ہندو لیڈروں نے پوری جرأت اور دلیری کے ساتھ شاہ امان اللہ خان کی حمایت میں آواز بلند کی ہے۔ یہ یقین ہے کہ یہ حالات ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک مضبوط چٹان ثابت ہوں گے۔

مگر ان حالات کے ساتھ ساتھ مجھے مولانا شوکت علی کے بیان سے شدید صدمہ پہنچا۔ مولانا شوکت علی کا بیان مجمل بھی ہے اور گمراہ کن بھی، مجھے حیرت ہے کہ علی برادران کی گزشتہ پانچ سالہ زندگی صرف مسلمان حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کرنے میں گزر رہی ہے ان دونوں بھائیوں نے جس وقت سے ترکی نے لفظ خلافت سے انکار کیا ہے تو غازی مصطفےٰ کمال کی اتنی شدید مخالفت کی، جس کو ہر مسلمان نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ سلطان ابن سعود کے معاملے میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ اس کی حکومت کو تباہ کرنے میں دونوں بھائی ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کر رہے ہیں۔ اب جبکہ سلطنت افغانستان کی تباہی کا فیصلہ دشمنان اسلام نے کر لیا ہے۔ اور وہ بظاہر کسی حد تک اپنے ارادوں میں بذریعہ باغیوں کے کامیاب بھی ہیں، ٹھیک اس وقت مولانا شوکت علی نے ایک مفتی کے انداز میں فری پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا:

"باغی افغانستان میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسلامی احکام کی عزت اور مغربی تہذیب کے خلاف ایک شرعی جہاد ہے اور شاہ امان اللہ خان

غازی اپنی بددینی کی وجہ سے تخت سے علیحدہ کیا گیا۔

اس بیان میں مولانا شوکت علی نے یہ بھی کہا ہے کہ میں بچہ سقہ کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔ میرے خیال میں یہ الفاظ ان کی زبان سے ہندوستان کی رائے عامہ کے خوف سے نکلے ہیں، ورنہ ان کے بیان کا پہلا حصہ بچہ سقہ اور اس کے معاونین کی حرف بحرف تائید کرتا ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا شوکت علی کے بیان کا وہ حصہ جو غازی امان اللہ خان کے خلاف اور باغیوں کی حمایت میں ہے افغانستان میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر تقسیم ہو چکا ہوگا۔ اس لیے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ دشمنان اسلام کی تمام طاقتوں سے زیادہ مولانا شوکت علی کا بیان شاہ امان اللہ خان اور سلطنت افغانستان کے لیے نقصان رساں ثابت ہوگا۔ سلطان ابن سعود کی اس لیے مخالفت کی جاتی ہے کہ اس نے شریعت کا وقار سرزمین حجاز میں دوبارہ کیوں قائم کیا اور شاہ امان اللہ خان کی مخالفت یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ وہ شریعت کا مخالف ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی لیس و پیش نہیں کہ ہندو پریس کے بعد مسلم پریس میں سوائے اخبار زمیندار کے مسلمان اخباروں کی اکثریت شاہ امان اللہ خان کے بارے میں بزدلی سے کام لے رہی ہے اور بعض بدنیت اخبار شاہ امان اللہ خان کے خلاف مضامین لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان مسلم حقوق کی رٹ لگانے والے مسلم اخبارات سے سختی کے ساتھ یہ سوال کریں کہ افغانستان کے معاملے میں تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا ہے خدا مسلمان قوم کو اپنے دوست و دشمن کے سمجھنے کی توفیق دے۔"

حبیب الرحمٰن لدھیانوی

رئیس احرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مولانا شوکت علی کے بیان کے بعد حسب ذیل فتویٰ علمائے ہندوستان کے پاس بھیجا:

محترم المکرم! السلام علیکم

ذیل کے سوالات ارسال خدمت ہیں، حالات کا اقتضا ہے کہ ان کا جواب بلد از جلد ملک میں شائع کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد صاف مختصر و

مدلل جواب ارسال فرمائیں گے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت شاہ امان اللہ غازی پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے اور باغیوں کی شرعی حیثیت سے امداد کی جا رہی ہے جس سے دشمنانِ اسلام فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنت اسلام کو برباد کر رہے ہیں۔

سوالات

۱۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ شاہ امان اللہ غازی والئی افغانستان نے جو اصلاحات اپنے ملک میں جاری کی تھیں کیا وہ ان کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا؟

۲۔ (الف) کیا ان اصلاحات کا اجرا شاہ امان اللہ کے خلاف بغاوت کرنے کی شرعاً اجازت دیتا ہے؟

(ب) جو جماعت ان اصلاحات کی بنا پر بغاوت کرنا چاہتی ہے اس کی کسی قسم کی معاونت کرنا کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز ہے؟

۳۔ جو لوگ ان اصلاحات کے اجرا کی وجہ سے شاہ امان اللہ کو کافر کہتے ہیں، کیا وہ حق پر ہیں۔

۴۔ جبکہ دشمنان اسلام مختلف ذرائع سے سلطنت افغانستان کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں ان حالات میں شاہ امان اللہ کی امداد کرنا ہر مسلمان پر شرعاً فرض نہیں ہے؟

مسئلہ افغانستان کا سیاسی پس منظر

مرکزی خلافت کمیٹی اور علی برادران سے جو شدید اختلافات پیدا ہوئے اس پر مولانا عرفان صاحب کا غیر مطبوعہ خط اور مولانا شوکت علی صاحب کے بیان پر رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا بیان اپنی جگہ بہت سی تفصیلات رکھتا ہے مگر ان تفصیلات پر جنرل نادر خان کے خط مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۲۹ء اور جنرل نادر خان کے خط کے ساتھ شہزادہ فضل داد خان کا خط مولانا شوکت علی اور مرکزی خلافت کمیٹی

کے تباہ کن اثرات پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں:۔ ان خطوط کی آمد کے بعد مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اوران کے تمام ساتھی مرکزی خلافت کمیٹی سے مسئلہ افغانستان میں کسی طرح بھی متفق نہیں ہو سکتے تھے، شہزادہ فضل داد خان کے خط کا مضمون حسب ذیل ہے:

از ڈیرہ اسماعیل خان

عالیجناب مخدومی و محترمی حضرت فخر الاحرار صاحب مدظلہ العالیٰ،

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

مزاج اقدس! اندریں زماں جبکہ ہر طرف سے حوادثات انقلابی رونما ہو رہے ہیں ہندوستان وافغانستان من حیثیت سیاسیات دشوار عبور طرائق سے گزر رہے ہیں، ایک سلطنت کا دوسری ہمسایہ سلطنت پر اثر انداز ہونا ہر حیثیت سے ضروری ہے افغانستان و سلطنت محروسہ کے برخلاف چند گمراہ وکوتاہ اندیش اشخاص نے ضرورت حال و اقتضائے زمانہ سے ناآشنا ہو کر جو گمراہ کن پروپگنڈہ شروع کر رکھا ہے۔ جو نقصان امن و اصلاح ملک و سلطنت ہے اس سے جناب بھی باخبر و واقف ہوں گے۔ اکابر اسلام کی متفقہ آواز کو نہایت سرد مہری و کم دانشی سے پس پشت ڈال کر بے سروپا خود ساختہ افسانے گھڑ کر دولت عالیہ افغانستان کے خلاف بدظن کرنے کی جو ناپاک کوشش شروع کر رکھی ہے ان سب ہتھکنڈوں سے جناب والا مطلع ہوں گے۔ ان کے خلاف اعلان فرمائیں گے، جو افغانستان کے خلاف پروپگنڈہ کر رہے ہیں اور ہماری مدد فرمائیں گے۔" (بالکل پرائیویٹ)

نیازمند

شہزادہ فضل داد خان

کوچہ حافظ جمال ڈیرہ اسماعیل خان

اس خط کے ساتھ حسب ذیل خط جنرل نادر خان شہید کا موصول ہوا۔ جس کا مضمون درج ہے:

"در جرائد عالیہ ہند و جریدہ فریدہ افغانستان علاوہ از اظہار ہمدردی و

تالم معنوی وقلبی کہ برادران ہندی راجع باحوال تباہ قابل ترحم افغانستان دارند۔ میخواہند کہ باعانت مالی نیز برادران متالم ومتاثر خودرا امداد مجاہدین حریت افغانی راتقویہ نمایند، وضعیت موجودہ مجاہدین خیلے بامداد مالی برادران ہمدرد خویش احتیاج دارد، ویگانہ وسیلہ پیشرفت مجاہدین ونجات افغانستان ازین تہلکہ ذبربادی والستہ بہ امداد است الذمن ازین عقیدہ عالیہ وارادۂ حسنہ برادران ہندی خود اظہار ممنونیت وامتنان نمودہ امیدمیکنم کہ ارادہ ذہنی خودشان را فوری لباس عملی پوشانیدہ ملت دردرسیدۂ افغانستان را دراین حالت فلاکت وتباہی شان دستگیری نمایند۔

امید دارم کہ این حالت زار افغانستان ہمہ ہمدردان نوع لبشر را متاثر نمودہ باشد دوست معاونت خودشاں را این ملت مصیبت زدہ کوتاہ نخواہد فرمود، واین ملت را برابر ہمیشہ ممنون احسان خواہد نمود"۔

محمد نادر خان سپہ سالار ۲۸ اگست ۱۹۲۹ء

افغانستان میں برطانوی استبداد کی ریشہ دوانیوں کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا تھا کہ ہندوستان کے مشہور اخبار "مدینہ" کے مدیر مولوی نورالرحمن کو ۲۸ دسمبر ۱۹۲۸ء کو افغانستان میں برطانوی ریشہ دوانیوں کے تذکرے کی پاداش میں گرفتار کرلیا گیا۔ اور اسی موقع پر مولانا ظفرعلی نے اپنی نظم میں کہا تھا:

خدا کی شان اک سقے کا بچہ
مقابل ہے محمد زائیوں کے
نہیں دیکھے پٹے کے ہاتھ اس نے
امان اللہ کے شیدائیوں کے
اسے اسلامیوں سے کیا سروکار
جو ٹکڑوں پر پلے عیسائیوں کے

احرار کا یہ گروہ اندرون ملک بھی اس وقت کے بائیں بازو کے رجحانات رکھنے

والی جماعتوں کے ساتھ ہمدردیاں رکھتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جب لاہور میں کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا اور اس میں مکمل آزادی کی قرارداد پیش ہوئی تو اس موقعہ پر بھی مولانا حبیب الرحمٰن نے گاندھی جی کی پیش کردہ قرارداد میں ترمیم کی اس قرارداد اور ترمیم کا تذکرہ مولانا نے اپنی یادداشت میں کیا ہے:

"کانگرس کے اجلاس میں کامل آزادی کی تجویز جب زیر بحث آئی تو گاندھی جی کو یہ اصرار تھا کہ اس تجویز کے آخری حصے میں وائسرائے کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا جائے۔ اور بم مارنے والوں کی مذمت کی جائے۔ اس پر گاندھی جی سے شدید بحث ہوئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیال کی تائید کرنے میں میں پہلا آدمی تھا۔ جس نے کہا کہ آزادی کامل کی تجویز کے ساتھ وائسرائے سے ہمدردی کرنے کا پیراگراف شامل کرنا اپنی کمزوری اور غلامی کی نشانی ہے۔ میں نے صاف الفاظ میں کہا کہ وائسرائے سے ہمدردی کرنے کی بجائے بم مارنے والوں سے ہمدردی کرنی چاہیئے۔ میرے اس بیان کی پریس میں بڑی پبلسٹی ہوئی۔ انگریزی اخبارات میں مجھے تشدد پسند ونگ کے لیڈر کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس اجلاس کے زمانے سے پنڈت جواہر لال نہرو کے مجھ سے قریبی تعلقات پیدا ہو گئے۔ تجویز گاندھی جی کے منشاء کے مطابق پاس ہوئی مگر میری اور پنڈت نہرو جی کی تقریروں سے وائسرائے کی ہمدردی والا حصہ بے وزن ہو کر رہ گیا۔"

صرف یہی نہیں بلکہ کانگرس کے اس سالانہ اجلاس کے موقعہ پر انقلابی نوجوانوں کی جماعت "نوجوان بھارت سبھا" کا اجتماع بھی راوی کے کنارے اسی پنڈال میں ہوا۔ تو اس اجلاس میں بھی یہ احرار قائدین شریک ہوئے تھے۔

مذہب اور سیاست

آئینی موشگافیوں اور نہرو رپورٹ کی مسلمان امراء کی طرف سے شدید مخالفت

اور کانگرس کی غداری نے در اصل ان قائدین کو خاصا برگشتہ کر دیا اور یہ اپنی تمام سامراج دشمنی کے باوجود کانگرس سے الگ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ تاکہ وہ مسلمان عوام کو منظم کر کے کانگرس کے ساتھ برابری کی سطح پر سامراج دشمن محاذ قائم کر سکیں۔ اس انداز فکر میں خود مولانا ابوالکلام آزاد بھی شریک تھے۔ چنانچہ کئی ایک احرار زعماء کا کہنا ہے کہ مجلس احرار کے قیام میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مشیت اور تائید دونوں شامل تھے لیکن جب ایک بار مجلس احرار الگ سے قائم ہو گئی تو اس وقت مسلمان عوام کو منظم اور متحرک کرنے کی، تو بنیادی طور پر ایک صورت تھی، کہ مسلمان عوام کے مختلف طبقوں کے معاشی تقاضوں کو سمجھا جاتا اور ان بنیادوں پر ان کو منظم کر کے متحرک کیا جاتا۔ اور اس طرح سے دوسرے مذاہب کے پسے ہوئے طبقوں کے ساتھ ایک وسیع محاذ قائم ہو سکتا لیکن ان قائدین کا ماضی اور ان کا فکر ان کے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ اور وہ عوام کے معاشی تقاضوں کو سمجھنے کی بجائے مذہبی جذبات کو ہی حرکت اور تنظیم کی بنیاد بنانے پر مصر رہے۔

یہ درست ہے کہ وہ مذہب کے ان پہلوؤں پر زیادہ اصرار کرتے رہے جس میں غریبوں کی بھلائی اور معاشی انصاف کے اشارے ملتے ہیں۔ لیکن بنیاد مذہبی جذبات ہی رہے۔ چنانچہ انہی مذہبی جذبات پر انہوں نے اپنی مقبولیت کی بلند و بالا عمارت تعمیر کی۔ اور اس پر وہ سالہا سال تک اتراتے بھی رہے۔ کیونکہ ان کو بجا طور پر ناز تھا کہ مذہب کی بنیاد پر ہم متحرک کرتے ہیں تو ساتھ ہی ہم جیل بھی جاتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی ہمارے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا۔ کیونکہ اگر کوئی مقابلے میں مذہب کو استعمال کر بھی لے گا۔ مگر وہ بہادری اور قربانی کا جذبہ کہاں سے لائے گا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ مذہب کا نعرہ یک رخا ہوتا ہے وہ ایک دفعہ دل میں اتر جائے تو سماجی اور اقتصادی عوامل کی جانچ نہیں کرتا۔ خود چودھری افضل حق کو احرار کے اس پہلو کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ پہلے احرار مفکر تھے جنہوں نے اسلام کے معاشی پہلوؤں پر شدت سے اصرار کیا۔ لیکن سیاست میں مذہب کی آمیزش کے وہ ہر حال میں قائل رہے۔ چنانچہ اس آمیزش کی حمایت کرتے ہوئے وہ یوں لکھتے ہیں:

"لوگ بجا طور پر پوچھتے ہیں کہ احرار کو کیا ہو گیا کہ مذہب کی دلدل میں پھنس گئے۔ یہاں پھنس کر کون نکلا ہے جو یہ نکلیں گے؟ مگر یہ کون لوگ ہیں؟ وہی جن کا دل غریبوں کی مصیبتوں سے خون کے آنسو روتا ہے وہ مذہب اسلام سے بھی بیزار ہیں۔ اس لیے کہ اس کی کہانی شہنشاہیت اور جاگیرداری کی دردناک کہانی ہے۔ کسی کو کیا پڑی کہ وہ شہنشاہیت کے خس و خاشاک کے ڈھیر کی چھان بین کر کے اسلام کی سوئی کو ڈھونڈے تاکہ انسانیت کی چاک دامانی کارفو کر سکے؟ اس کے پاس کارل مارکس کے سائنٹیفک سوشلزم کا ہتھیار موجود ہے وہ اس کے ذریعے سے امراء اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے اسلام کی اتنی لمبی تاریخ میں سے چند سال کے اوراق کو ڈھونڈ کر اپنی زندگی کے پروگرام بنانے کی فرصت کہاں؟ سرمایہ داروں نے ان برسوں کی تاریخ کے واقعات کو سرمایہ داری کے رنگ میں رنگا اور مساوات انسانی کی تحریک جس کو اسلام کہتے ہیں، مذہبی لحاظ سے عوام کی تاریخ نہ رہی اور نہ اس میں کوئی انقلابی سپرٹ باقی رہی۔ عامۃ المسلمین، امیروں، جاگیرداروں کے ہاتھ میں موم کی ناک بن کر رہ گئے۔ ہندوستان میں اس وقت بھی وہ سب سے زیادہ مفلوک الحال مگر حال مست ہیں، انہیں اپنے حال کو بدلنے کا کوئی احساس نہیں۔ یہ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ خود علماء نے مذہب انقلابی سپرٹ سے ناآشنا ہیں اور وہ اب تک مذہب کی اُموی اور عباسی عقائد کے مطابق تشریح کر رہے ہیں۔

تاہم کسی کی بے خبری یا کسی گروہ کا تعصب واقعات کو نہیں بدل سکتا۔ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نئے دور کے انقلابی تھے، درانتی اور کلہاڑا تو اب مزدوروں کی نشانی بنا۔ لیکن جس نے سرمایہ داری پر پہلے کلہاڑا چلایا اور قومی امتیاز کے ان رشتوں کو کاٹ کر رکھ دیا جس نے انسان کو انسان سے علیحدہ کر دیا تھا۔ صرف سرمایہ ہی طبقات پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ انسانوں میں گروہ بندی کرنے والے اور بھی محرکات ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ذریعہ مختلف نبیوں پر ایمان ہے۔ قومیں خدا پر ایمان کے نزاع پر مختلف نہیں بلکہ مختلف نبیوں پر ایمان لانے کے باعث الگ الگ ہیں۔ پہلے آمد و رفت کے وسائل کی کمی کی وجہ سے ہر ملک، ایک الگ دنیا تھی، الگ الگ پیغمبروں کے ذریعے ہر ملک کی روحانی

تربیت کی ضرورت تھی۔ ایک ملک میں بیٹھ کر سب ملکوں میں پیغام پہنچایا جا سکتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہوا۔ آپ نے لا نبی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں) کا اعلان کر کے دنیا کو اتحاد کا مژدہ سنایا۔ کہ وہ آئندہ نبیوں کی بنا پر قوموں کی تفریق ختم ہو گئی۔ آؤ ایک محکم دین کی طرف آؤ یہ سب کے حالات کے مطابق ہے۔ اسلام تمہارے سارے عوارض کا مکمل نسخہ ہے۔ زمانے نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بتدریج دُور دُور کے ملک آمد و رفت کے سلسلوں میں آسانیوں کے باعث نزدیک تر ہوتے گئے اب تو دور دراز ملک ایک شہر کے محلوں سے بھی قریب معلوم ہونے لگے ہیں۔ اس لیے ملک ملک کے لیے علیحدہ پیغامبر کی ضرورت نہ رہی تھی۔

اب انسانی دماغ کافی نشوونما پا چکا تھا۔ لوگ اپنا بھلا برا خود سمجھنے لگے۔ اب ایک سچائی پیش کرنا کافی ہے۔ باقی معاملہ لوگوں کی سمجھ پر چھوڑنا کفایت کرتا ہے۔ مذہب کی سچائی اب سمجھ سے بالا نہیں۔ بلکہ تعصب کے باعث اسے قبول کرنے میں دقت ہے دنیا نے دیکھ لیا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آتے ہی اہل دنیا کی عقل اور علم نے حیرت انگیز ترقی کی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے معنی یہ تھے کہ اب انسانیت سن شعور کو پہنچ چکی ہے۔ اب کسی سکول ماسٹر کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ دنیا کے حالات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ سچی اور جھوٹی بات میں فرق کر کے وہ صحیح راہ تلاش کر سکتے ہیں اب مکمل سچائی یعنی اسلام ہم تک پہنچ گیا۔ اب کسی نبی کی ضرورت نہ رہی اگر ہم نبوت کا سلسلہ ابھی تک جاری مان لیں تو پھر مختلف نبیوں پر ایمان کے باعث قوموں، ملکوں اور انسانیت میں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری رہے گا پہلے تو ملک ملک ایک الگ الگ دنیا تھی۔ الگ الگ نبیوں کی ضرورت تھی۔ اب جب دنیا سمٹ کر ایک کنبہ میں آ گئی ہے۔ تو نبوت کے مختلف دعویداروں کا آنا دنیا کو تقسیم بلا ضرورت کرنے سے کم نہ تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لا نبی بعدی کا ارشاد دنیا کے لیے رحمت کا پیغام اور انسانیت کے لیے خوشخبری تھی۔

(تاریخ احرار صفحہ)

احرار کی زندگی کی یہی بنیادی اساس تھی، جس پر اس نے تحریک کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ یہ نہ دیکھ پائے کہ جب وہ غریبوں کی حمایت کے لیے مذہب کو بنیاد بناتے ہیں اور بجا کرتے ہیں، تو اوپری طبقے بھی اپنی مدافعت کے لیے مذہب کو استعمال کرتے ہیں اور ان کے پاس چونکہ نشر و اشاعت کے وسائل اتنے وافر ہوتے ہیں کہ ان کی مدافعت بھی حملہ بن جاتی ہے۔ اور ان کا مذہب سچا؛ ور غریب کا مذہب جھوٹا اور سوشلزم بنا دیا جاتا ہے۔ پھر یہ علمائے حق، غریب کی مدد کرنے اور ان کو منظم کرنے کی بجائے اپنی صفائی پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور بحث مذہب کی مختلف توجیہات پر مرکوز ہو جاتی ہے اور اصل مسئلہ سرمایہ داری اور بھوک کا، ظالم اور مظلوم کا آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اوپری طبقے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹ جائے۔

احرار کا دس سالہ دورِ حیات اس امر کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ ان کی اٹھائی ہوئی تحریکیں، تمام قربانیوں اور خلوص و دیانت کے باوجود عوام کو زیادہ آگے نہ بڑھا سکیں یہ درست ہے کہ انہوں نے سامراج دشمنی کا جذبہ کبھی سرد نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے قربانی سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ لیکن اس کے باوجود وہ فعال تنظیم اور غریب محنت کش اور فلاکت زدہ مسلمانوں کے طبقاتی شعور کو اپنی پوری کوششوں کے باوجود تیز نہیں کر سکے۔ بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ ان کے اکثر قائد ابن الوقتی کا شکار ہو گئے۔ اور مقابلہ مذہب پرستی اور مذہب کو استعمال کرنے میں ہونے لگا۔

واقعہ یہ ہے کہ مجلس احرار ایک الگ جماعت کے طور پر قائم ہوئی تو مسلمانوں اور بالخصوص پنجاب کے مسلمان امراء طبقے نے بھی اس جماعت کے قیام پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس الگ تنظیم میں وہ اپنی فتح سمجھنے لگے کہ کم از کم قید و بند کے مصائب جھیلنے والے قائدین کا گروہ کانگرس سے تو الگ ہوا۔ اور کانگرس جن لوگوں کی قربانیوں کے سہارے اپنے آپ کو تمام اقوام اور مذاہب کا نمائندہ سمجھتی اور اس کے منوانے پر مصر رہتی ہے وہ احرار اور دعوے بہت حد تک کمزور ہو گئے۔ دوسرے یہ

امرار یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ ان جیالے قائدین کو کانگرس سے الگ ہونے کی صورت میں اپنے استعمال میں لے آئیں گے تیلسرے فرقہ وارانہ تنظیم کے طور پر احرار ہندو سے لڑنے پر مجبور ہوگی اور اس کا انگریز دشمنی کا جذبہ سرد پڑ جائے گا۔ اور امرار کے طبقے پر انگریز کا پیٹھو ہونے کا الزام بھی لگنا بند ہو جائے گا۔ لیکن اوپری طبقے کے مسلمان زعمار کو اس ضمن میں خاصی ناکامی ہوئی۔ کیونکہ جہاں تک احرار کو الگ تنظیم کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ وہاں تک تو مسلمانوں کے اوپری طبقے کو کسی حد تک کامیابی ہوئی ہو تو ہو' لیکن جب احرار نے مسلمان عوام کو براہِ راست سامراج دشمن نعروں پر منظم کرنا شروع کیا تو اوپری طبقے کو سخت مایوسی ہوئی۔ مجلس احرار نے پہلے دن ہی اس سلسلے میں اپنی پوزیشن واضح کر دی تھی۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ۱۱ جولائی ۱۹۳۱ء کو اپنے پہلے خطبۂ صدارت میں واضح الفاظ میں اپنی نئی جماعت کے موقف کا اعلان کر دیا اور کہا:

"میں ہندوستان کی تمام اقوام کو کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ جماعت احرار کسی قوم کے ساتھ بے انصافی نہیں چاہتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں وہ اچھوت بن کر رہنے کے لیے بھی تیار نہیں مسلمان ہندوستان میں برابر کے حقدار ہیں۔ وہ ہندوستان کی حکومت میں برابر کے حصہ دار ہو کر رہیں گے۔

ہندو پریس کے نزدیک ہر مسلمان اس لیے فرقہ پرست ہے کہ وہ مسلمان ہے اگرچہ اس نے ملک اور قوم کے لیے زبردست قربانیاں دی ہیں۔ لیکن جہاں اس نے کسی مسلمان پر ظلم ہوتے دیکھ کر اس کی امداد کی اسی وقت اسے فرقہ پرست کا خطاب مل گیا۔

کوئی مسلمان تمام عمر کانگرس کا وفادار رہے۔ مگر وہ کسی ایک ہندو کی شخصی رائے کی مخالفت کرے تو فرقہ پرست ہے۔ اس لیے میں اعلان کرتا ہوں کہ میں قوم پرست ہوں نہ فرقہ پرست صرف مسلمان ہوں۔ میں نے آج تک اپنے ملک اور قوم سے کبھی غداری نہیں کی۔ ہندو پریس میں اگر آج بھی

تھوڑا سا انصاف کا جذبہ آ جائے تو میں یقین کرتا ہوں کہ تمام جھگڑے آج ہی ختم ہو جائیں۔

ہندوستان میں مسلمان دو سیاسی جماعتوں میں تقسیم ہیں، ایک وہ ہیں جو کانگرس سے مل کر کام کر رہے ہیں۔ اور دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں، کہ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا ہی مسلمان کی عزت و آبرو کا باعث ہے۔ مسلمان تب ہی زندہ رہ سکتے ہیں، اگر جنگ آزادی میں ہر قوم سے بڑھ کر حصہ لیں۔ غیر کانگریسی مسلمانوں کے سامنے سوائے ہندوؤں کو ملامت کرنے انہیں بُرا بھلا کہنے، انگریز اور ہندوؤں سے ہمیشہ مسلمانوں کو ڈرانے کے سوا کوئی پروگرام نہیں۔

میری خواہش ہے کہ پنجاب کے مسلمان اس کثرت سے کانگریس میں حصہ لیں کہ دوسروں کو کانگریس میں جگہ نہ مل سکے۔ ہندو کہتا یہ ہے کہ مسلمان کانگریس میں آئیں اور چاہتا یہ ہے کہ نہ آئیں۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان اگر کانگرس میں آئے تو ان کی پولٹیکل طاقت بڑھ جائے گی۔ اور ہندوؤں کی قوم پرستی کا راز ان پر کھل جائے گا۔ ابھی تک کانگریس کے دفتروں میں مسلمانوں کو اچھوت سمجھنے والے ہندو موجود ہیں۔ جنگ آزادی شروع کرنے سے پہلے کانگریس کے جلیل القدر رہنماؤں نے نہرو رپورٹ کو مسترد کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ آئندہ کوئی نظام حکومت منظور نہیں کیا جائے گا۔ جس میں آزاد خیال مسلمانوں کی رضامندی حاصل نہ ہو گی۔"

اپنے اسی خطبہ صدارت میں مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے آخر میں واشگاف الفاظ میں کہا تھا:

"ہندوستان کی تمام مشکلات کا حل صرف ایک ہے کہ ہندوستان کے کسانوں، مزدوروں کی تنظیم کی جائے اور بجائے ایک سرمایہ دار حکومت کے غریبوں کی حکومت قائم ہو۔ اگرچہ میں کانگریسی ہوں اور ہمیشہ کانگریس کے

جھنڈے تلے کام کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں پس و پیش نہیں ہے کہ کانگریس کی محنت و قربانی کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی حکومت انگریز سے نکل کر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں چلی جائے۔ اس کا حل یہ ہے کہ مزدور اور کسان پوری طاقت سے کانگریس پر قبضہ کر لیں اور کانگریس سے تمام سرمایہ دار عناصر کو ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔ کانگریس نے مکمل آزادی کا جو ریزولیشن لاہور میں منظور کیا تھا۔ اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں کوئی قوم اقلیت و اکثریت کی وجہ سے نہ زندہ رہتی ہے اور نہ مرتی ہے۔ دنیا میں صرف وہی قوم زندہ رہتی ہے جس کے افراد نیک نیت، بہادر، صاحب عقل اور صاحب ایثار ہوں۔ مجھے یہ سن کر بے حد تکلیف ہوتی ہے، جب کوئی مسلمان کہتا ہے کہ ہم اس لیے کمزور ہیں کہ ہم ہندوستان میں اقلیت میں ہیں، اٹھو اپنے اندر زندگی پیدا کرو اور ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دو، جس قوم کے ہاتھ سے ہندوستان کو آزادی نصیب ہوگی۔ وہی سر بلند ہو کر رہے گی۔"

(رئیس الاحرار از جامعی صفحہ ۱۵۳)

اس موقف کے ساتھ مجلس احرار وجود میں آئی۔ اب اس مقبولیت کی عمارت کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے در پیش مسائل کو اپنے ہاتھ میں لے کر سلجھانا تھا۔ کہ وہ اپنی تنظیم کو اپنی قربانیوں سے فعال بنا سکے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک یہ جماعت مسلسل ہنگاموں اور تحریکوں میں الجھی رہی جب اس کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس وقت بھی یہ جیلوں کے سہارے زندہ تھی، جب غیر مقبول ہوئی تو اس غیر مقبولیت کے داغ دھونے کے لیے بھی جیل کے دروازوں پر ہی دستک دینی پڑی۔ بہر حال اجمالاً ان تحریکوں اور ہنگاموں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تحریک کشمیر ۱۹۳۱ء اور مجلس احرار

کشمیر سے وابستگی

مجلس احرار کے قیام کے بعد سب سے پہلی ہنگامہ خیز تحریک جو مجلس احرار کی قیادت میں چلی اور جس نے پورے شمالی ہندوستان میں تہلکہ مچادیا وہ کشمیر کی تحریک تھی، یہی وہ پہلی تحریک تھی جس نے ایک طرف کشمیر اور جموں کی ریاست میں بسنے والے مسلمانوں کو بیدار اور متحرک کیا اور دوسری طرف پنجابی مسلمانوں کو گرمایا۔ دراصل جموں اور کشمیر کی ریاست میں بسنے والے مسلمانوں کے خاندان پنجاب کے اکثر شہروں میں آباد ہو گئے تھے، کیونکہ ریاست میں مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی کے ذرائع محدود ہی نہ تھے بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے، اس لیے کھاتے پیتے مسلمان اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اکثر و بیشتر پنجاب کے شہروں میں بالخصوص سیالکوٹ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ کیونکہ ریاست جموں و کشمیر میں داخل ہونے کے جو دو راستے تھے ان میں ایک طرف اگر سب سے اہم شہر راولپنڈی تھا تو دوسری طرف سیالکوٹ تھا۔ اور سیالکوٹ کو ایک اور وجہ سے بھی اہمیت حاصل تھی۔ کہ یہ شہر جموں کے بالکل قریب ہے اور جموں کا علاقہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن تھا۔ اس لیے عام طور پر جموں کے لوگ

سیالکوٹ کو ہی کسی نہ کسی حد تک اپنا مسکن بناتے تھے۔ دوسرے جموں وکشمیر کے لوگوں کے لیے تجارت کا واحد ذریعہ پنجاب ہی تھا۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں کا دستکار طبقہ ہندوستان کے ساتھ تجارت پنجاب کی راہ سے ہی کر سکتا تھا۔ کشمیری شال ہندوستان کے طول وعرض میں پنجاب کی راہ سے ہی پہنچتی تھی' ان تجارتی ضروریات نے ہی ان دستکاروں کو امرتسر میں زیادہ تعداد میں آباد ہونے پر مجبور کیا۔ کیونکہ امرتسر پنجاب کا سب سے اہم تجارتی مرکز تھا اور ان کشمیری دست کاروں کو یہاں آباد ہونے میں سہولت یہ بھی کہ وہ سردیوں میں اپنا کاروبار اور تجارت جاری رکھ سکتے تھے۔ یہ دستکار خاندان اکثر وبیشتر گرمیوں میں کشمیر چلے جاتے اور سردیوں میں پنجاب کے شہروں میں آجاتے اس طرح پنجاب کے اکثر شہر کشمیریوں کے مراکز بن گئے۔

تیسرے جموں وکشمیر کے عام مسلمان روٹی روزگار کے لیے بھی پنجاب ہی کا رخ کرتے تھے' قیام پاکستان تک پنجاب کے تمام بڑے شہروں میں مال برداری کا پورا کام یہ کشمیری مزدور ہی کیا کرتے تھے۔

ان مختلف وجوہات نے پنجاب کو کشمیری مسلمانوں کے بہت ہی قریب کر دیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ پنجاب کے اکثر شہروں میں کشمیریوں کی انجمنیں قائم ہوتی رہتی تھیں لاہور ان انجمنوں کا مرکز تھا۔ چنانچہ خود علامہ اقبال بھی تعلیم سے فارغ ہو کر جب انگلستان سے واپس آئے تو وہ کشمیری مسلمانوں کی اس انجمن سے نہ صرف منسلک ہو گئے بلکہ اس کے سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ یہی وہ محرکات تھے 'جنہوں نے ریاست جموں اور کشمیر سے پنجابی مسلمانوں کی وابستگی بہت گہری کر دی تھی' اور اس وابستگی کا اظہار ہر سال کشمیر میں گرمیاں گزارنے کی صورت میں بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ آج بھی کشمیر کے مسئلہ سے سب سے زیادہ یگانگت اور جذباتی لگاؤ کا اظہار اگر کسی خطے میں ہوتا ہے تو وہ پنجابی مسلمانوں کا ہی پنجاب ہے۔

ریاست کشمیر میں بیداری کی لہر

بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں تک کشمیر کے ہندو ہوں یا مسلمان روٹی روزگار اور ملازمتوں کے لیے پنجاب کا رُخ کر لیا کرتے تھے' اور یہاں کسی حد تک ان کی کھپت ہو جاتی تھی جہاں تک ہندو پنڈتوں اور ڈوگروں کا تعلق تھا۔ ان کی ریاست میں ہی مانگ زیادہ تھی' کیونکہ ہندو راجہ ہونے کی وجہ سے مخصوص مذہبی تنگ نظری موجود تھی' اس تنگ نظری کی بنیادی وجہ ہی یہ تھی' کہ "اگر مسلمانوں کو اعلیٰ عہدے دیئے گئے تو وہ ریاست اور راجہ کا تختہ الٹ دیں گے' اس لیے اپنے ہم مذہبوں کو ملازمتوں میں رکھا جاتے۔ کیوں کہ وہ وفاداری کے جذبے سے ریاست اور اس کے حکمران خاندان کی حفاظت کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب خلافت اور عدم تعاون کی تحریک چلی تو مسلمانوں کے لیے بھی پنجاب میں ملازمتیں حاصل کرنے کی راہیں بہت حد تک مسدود ہو گئیں اور کشمیری مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو بالآخر ملازمتوں اور روزگار کے لیے اپنی ریاست کے اندر ہی توجہ کرنی پڑی۔ جب ان کو اپنے وطن اور ریاست میں ملازمت اور روزگار کا ہر دروازہ بند نظر آیا تو ان کو اس وقت احساس ہوا کہ حالات ناساعد ہیں' اور ان کو بدلنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ کشمیری مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ تھا جس نے سب سے پہلے ان حالات کی ناسازگاری اور نامساعدت کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ ان حالات کی تلخیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی راہیں سوچی جانے لگیں' ایک راہ جو اختیار کی گئی وہ پنجاب کے اخبارات میں مضامین اور ایڈیٹر کے نام مراسلات کی راہ تھی' اس مہم کے بارے میں مولانا عبدالمجید سالک اپنی خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں:

"کشمیر میں ڈوگرہ راج کے ظلم و ستم اور مسلمانوں کی مظلومی و کسمپرسی کے خلاف "انقلاب" میں بے شمار مراسلتیں شائع ہوئیں' اور بہت سے مضامین لکھے گئے' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کے اندر تمام پڑھے لکھے لوگ "انقلاب" کو پڑھنے لگے اور رفتہ رفتہ عوام میں بیداری پیدا ہونے لگی' "انقلاب" میں اس

مہم کا آغاز یوں ہوا کہ اس سے پیشتر ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن جموں کے بعض مخلص کارکنوں نے لاہور کے انگریزی اور ایک اُردو روزنامے میں مہاراجہ سر ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف مضامین لکھے، لیکن چند ہی ہفتوں کے اندر ان اخباروں کے ایڈیٹروں نے چند ٹکوں کی خاطر حکومت کشمیر سے ربط پیدا کر لیا۔ اور مراسلہ نگاروں کے نام ظاہر کر دیئے۔ جن پر مہاراجہ کی حکومت کا عتاب نازل ہو گیا۔ اور کارکنوں میں دہشت پھیل گئی کچھ مدت گزرنے کے بعد جموں سے ایک اخبار نویس دوست لاہور آ کر مجھ سے ملے اور کشمیری مسلمانوں کے دکھ کی داستان سنائی میں نے کہا "انقلاب آپ کی ہر خدمت پر آمادہ ہے کیونکہ ایک تو ہر مظلوم مسلمان کی حمایت ہمارا فرض ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی رہتا ہو دوسرے کشمیری مسلمان ہمارے ہمسائے اور ہمارا گوشت پوست ہیں۔ اور جب تک کشمیری مسلمان آزاد نہ ہوں پنجاب اور صوبہ سرحد اور سندھ کی سیاسی اصلاحات کچھ معنی نہیں رکھتیں"۔ وہ کہنے لگے ہمیں اندیشہ ہے کہ مبادا ہمیں انقلاب سے بھی وہی ضرر اٹھانا پڑے جو ہم اس سے پیشتر فلاں فلاں اخبار سے اٹھا چکے ہیں، یہ کہہ کر انہوں نے قومی غداری اور صحافتی خیانت کی وہ داستان سنائی، جس پر میں نے ان سے کہا کہ آؤ قرآن مجید پر حلف اٹھائیں، تم قسم کھاؤ کہ تم انقلاب میں جو کچھ لکھو گے یا جو واقعات ایڈیٹر کی اطلاع کے لیے قلمبند کرو گے، ان میں ذرہ بھر جھوٹ یا اشتباہ کی گنجائش نہ ہو گی، بلکہ ہر بات پوری تحقیق کے بعد درج کرو گے۔ اس کے مقابلے میں، میں قسم کھاتا ہوں۔ کہ انقلاب کے دفتر سے یا میرے قبضے سے تمہاری کسی تحریر کا ایک لفظ بھی مہاراجہ یا اس کے حکام تک نہ پہنچ سکے گا۔ میں دس لاکھ روپے پر بھی لات مار دوں گا۔ اور جیل خانہ میں جانا گوارا کر لوں گا۔ لیکن کسی قومی کارکن یا اپنے کسی نامہ نگار کا راز فاش نہ کروں گا۔

وہ مطمئن ہو گئے چنانچہ ہم نے حلف کے بعد زور شور سے کام شروع کر دیا

دو تین نامہ نگاروں نے جموں اور سری نگر سے مکتوب بھیجنے کا آغاز کر دیا۔ اور میں نے ان پر پے در پے مقالات لکھے، ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب، صنّاع مسلمانوں کی مظلومی اور مقروضی، تبدیل مذہب اور ذبح بقر کی پاداش میں ضبطی جائداد اور دس سال قید کی سزا، عام جبر و تشدد ناقابل برداشت ٹیکسوں کا بوجھ، غرض کشمیری زندگی کے تمام پہلو بے نقاب کر دیئے گئے۔ میرا عام قاعدہ یہ تھا۔ کہ میں ہر تیسرے چوتھے دن حکام کشمیر کو چیلنج دے دیتا تھا کہ کشمیر کے متعلق انقلاب میں جو کچھ شائع ہو رہا ہے۔ اگر اس کا ایک شوشہ بھی غلط ہے تو اس کی تردید کر د، ہم اس تردید کو انقلاب میں شائع کر ینگے۔ حکومت خود تردید نہ کرے، کسی اور کی طرف سے تردید کرا دے۔ اور کسی مسلمان اخبار میں نہ سہی کسی ہندو اخبار ہی میں چھپوا دے۔ لیکن انقلاب کے مندرجات کی کسی پہلو سے بھی تردید نہ ہوتی۔ اور نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ہمارے نامہ نگار حلف اٹھا چکے تھے۔ کہ غلط بات ہرگز نہ لکھیں گے۔"

(سرگزشت صفحہ ۲۸۵)

دراصل ریاست میں سیاسی شعور کی جھلکیاں ۱۹۲۵ء میں ہی نظر آنی شروع ہو گئی تھیں، اور یہی وہ سال تھا۔ جب مہاراجہ کشمیر جو لاولد تھا۔ سورگباش ہو گیا۔ اور گدی پر اس کا بھتیجا ہری سنگھ براجمان ہوا اس نئے مہاراجہ نے جب یہ احتجاجی آوازیں سنیں تو ۱۹۲۷ء میں سرکاری طور پر مہاراجہ نے ایک اعلامیہ جاری کیا۔ جس میں مسلمان رعایا کو سول اور فوجی ملازمتوں میں زیادہ حصہ دینے کا اعلان کیا۔ لیکن یہ اعلان صرف اعلان کی حد تک ہی رہا۔ اور اس پر قطعاً عملدرآمد نہیں ہوا۔ اس مایوسی نے ریاست کے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ میں غم و غصہ کو اور تیز کر دیا۔ اس وقت جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کی حالت کے بارے میں اعداد و شمار ایک المناک تصویر پیش کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آخری سالوں میں کشمیر کی آبادی جس میں جموں، کشمیر، لداخ اور گلگت کی مجموعی آبادی ۳۱ لاکھ ۸۰ ہزار ۳ جملہ نفوس پر مشتمل تھی، مذہبی لحاظ سے

اس مجموعی آبادی کی تقسیم وترتیب یوں تھی:

مسلم	———	۲۴۰۲۰۰۰	نفوس
ہندو	———	۷۰۰۳۰۰	"
سکھ	———	۳۹۰۰۰	"
بدھ	———	۳۹۰۰۰	"
کل آبادی	=	۳۱۸۰۳۰۰	"

اب اس آبادی کو مدِنظر رکھتے ہوئے مختلف محکموں میں ملازمتوں کا تناسب جو تھا۔ اس کا اندازہ ذیل کے اعداد وشمار سے ہوسکتا ہے:

محکمہ تعلیم

	مسلمان	غیر مسلم
گزیٹیڈ آفیسر	۴	۲۳
انسپکٹر	۳	۱۱
پروفیسر	۴	۲۹
ڈیمانسٹریٹر	۱	۷
ہیڈ ماسٹر ہائی سکول	۱	۱۴
" " مڈل "	۳	۴۶
استاد	۷۱۸	۱۴۸۳

یہ صورت حال صرف محکمہ تعلیم تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ دوسرے محکموں میں حالت اس سے بھی دگرگوں تھی، مثال کے طور پر:

	مسلم	غیر مسلم
محکمہ تعمیرات عامہ	۵۴	۱۸۳
شعبہ الیکٹریکل مکینیکل	۳	۴۷
تار ٹیلی فون	۷	۷۲
کسٹم	۱۴	۱۹۵
پٹواری اور گرداور	۴۰	۲۱۶

یہی حالت کلرکوں اور ادنیٰ ملازمین میں تھی،

		مسلم	غیر مسلم
کلرک	محکمہ خزانہ میں کلرک	۲۹	۳۶۸
	تعمیرات عامہ	۳	۱۹۴
	عدلیہ	۲۱	۱۶۲
چپراسی وغیرہ	محکمہ تعمیرات عامہ	۲۳	۱۲۰
	کسٹم	۱۰۸	۳۱۴
	سٹیشنری ڈپو	۵	۶۶

اس صورت حال میں ریاست کے اندر جو سیاسی شعور کا پہلا بیج پڑا وہ اسی حق طلبی اور ملازمتوں کے حصول کی خواہش تھی، اور روزنامہ انقلاب کی یہی ادا ان نوجوانوں کو پسند تھی، کیونکہ انقلاب اس زمانے میں جداگانہ انتخاب، مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی تنظیم اور آبادی کے تناسب سے ملازمتوں کی تقسیم کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ چنانچہ انقلاب کا ریاست میں داخلہ بند ہوتے ہی بقول مولانا چراغ حسن حسرت ان نوجوانوں کو ایسا معلوم ہوا کہ انہیں جو نورانی مشعل ہاتھ آگئی تھی وہ گل ہوگئی ہے اور وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھر رہے ہیں۔

یہ پہلا چرکا تھا۔ لیکن جب چنگاری کو شعلہ جوالا بننا ہوتا ہے تو حادثات کی ہوائیں

بڑا کام دیتی ہیں۔ عوام کی تلخیاں انہی حادثات کی ہواؤں سے اور بھڑک اٹھتی ہیں۔ اور یہی کچھ حالت کشمیر کے مسلمانوں کی ہو رہی تھی۔

"صوبہ جموں میں تحصیل ادھم پور" کا ایک بڑا زمیندار حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ وہاں کے تحصیل دار نے کاغذات مال سے اس کا نام خارج کر دیا۔ اور اس کی تمام جائداد واملاک پر اس کے بھائی کا قبضہ کرانے کے بعد اسے بے دخل کر دیا۔ عدالت میں چارہ جوئی کی گئی جج نے اسے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اسے "شدھ ہو جاؤ تو جائداد واپس مل جائے گی"۔ اس نے انکار کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔

ایک گاؤں ڈیگور میں مسلمانوں کو نماز باجماعت ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ جب اس کی اطلاع دوسرے مسلمانوں کو ہوئی تو ان میں شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

جموں جیل کی پولیس لائن میں انہی دنوں ایک ہندو ہیڈ کنسٹیبل نے ایک مسلمان کنسٹیبل کو عین اس وقت جب وہ تلاوت قرآن پاک میں مصروف تھا۔ کہا۔ "تم کیا بکواس پڑھ رہے ہو"۔ اور طیش میں آکر اس کا بستر (جس میں قرآن پاک کی بعض صورتوں کا مجموعہ "پنجسورہ" تھا) پرے پھینک دیا۔ (پنجسورہ جو قرآن مجید ہی کا حصہ تھا) زمین پر جا پڑا۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کو اور بھی برافروختہ کر دیا۔

۲۹ اپریل ۱۹۳۱ء کو عید الاضحیہ تھی، جموں میں مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع اس جگہ ہوا۔ جہاں انجمن اسلامیہ کے زیر اہتمام عید پڑھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس عید کی عبادت میں تین چیزیں شامل ہیں۔ دو رکعت نماز خطبہ عید اور دعا۔ نماز ادا کی گئی۔ خطبہ جاری تھا۔ امام الصلوٰۃ نے (قرآن مجید میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا جو واقعہ آتا ہے لوگوں کے سامنے بیان کرنا شروع کیا۔ ایک آریہ ڈپٹی انسپکٹر پولیس وہاں ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے فوراً خطیب کو خطبہ عید پڑھنے سے روک دیا۔ اور باوجود یہ بتانے کے کہ خطبہ نماز کا ایک ضروری جزو ہے۔ آریہ پولیس افسر اس بات پر اڑا رہا۔ کہ تم صرف نماز عید پڑھ سکتے ہو۔ لیکچر کی اجازت نہیں۔ حالانکہ اس پر یہ بات بار بار واضح کی گئی کہ عید کی نماز کے ساتھ خطبہ پڑھنا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ اس لیے اس کی

بندش مذہب میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔

(کشمیر کی کہانی صفحہ ۳۶)

ان پے بہ پے اشتعال انگیزیوں نے احتجاج کے لیے راہیں ہموار کیں، چنانچہ جموں کی ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے توہین قرآن کے سلسلے میں کچھ پوسٹر چھپوا کر سری نگر بھیجے سری نگر کے بازاروں میں ایک نوجوان پوسٹر لگا رہا تھا۔ کہ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ لیکن گرفتاریوں سے احتجاج تو نہیں رک جایا کرتے چنانچہ کشمیر میں بھی یہی ہوا کہ احتجاج بڑھا۔ اور پورا شمالی ہندوستان اس سے متاثر ہونے لگا۔ کیونکہ توہین کلام پاک کسی ایک خطے کے مسلمانوں کا مسئلہ نہ تھا۔ مہاراجہ بھی اس مسئلہ کی اہمیت اور اس سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو بھانپ گیا۔ چنانچہ سری نگر سے مہاراجہ نے اپنے وزیر متعلقہ، مسٹر ویکفیلڈ کو تحقیقات کی غرض سے جموں روانہ کیا۔ جہاں اس نے جملہ انجمن ہائے اسلامی کے پریذیڈنٹ و سیکرٹری صاحبان کو ملاقات کے لیے بلایا۔ اور اپنی تکالیف بیان کرنے کے لیے کہا گیا مسلمانوں نے زبانی اپنے مطالبات پیش کیے۔ جس پر وزیر موصوف نے کہا کہ میں مذہبی معاملات کا تو اسی جگہ فیصلہ کرتا ہوں۔ مگر ملکی معاملات کے لیے آپ میرے ساتھ کشمیر چلیں، میں مہاراج مہادر کے سامنے آپ کے ساتھ ہی آپ کے مطالبات بھی پیش کر دوں گا۔

سماعت اور انداز سماعت

دوسرے روز قرآن مجید کی توہین کا معاملہ پیش ہوا۔ مسٹر ویکفیلڈ نے مسلمانوں کی طرف سے دو نمائندوں (ایم یعقوب علی صاحب مرحوم اور سید الطاف علی شاہ صاحب) کو اپنے ساتھ رکھا۔ دو دن کی تحقیق کے بعد یہ تینوں صاحبان جس نتیجے پر پہنچے وہ یہ تھا۔

مسٹر ویکفیلڈ (نمائندہ حکومت کشمیر)

"قرآن کریم کی توہین میں تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن میرے خیال میں یہ اتفاقی امر تھا۔
میں صدق دل سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں"

ایم یعقوب علی (مسلم نمائندہ)

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنے ایمان سے یہ کہتا ہوں کہ قرآن مجید کی توہین ہوئی ہے۔ اور ملزم نے عمداً ایسا کیا ہے اور غصہ میں آکر ایسا کیا ہے"۔

سید الطاف علی شاہ (مسلم نمائندہ)

"میرے خیال میں قرآن کریم کی توہین ہوئی ہے۔ لیکن یہ ثابت نہیں کہ قرآن کریم ہاتھ میں سے چھین کر زمین پر دے مارا گیا ہے۔ قرآن کریم بستر میں تھا۔ اسے زمین پر پھینک دیا۔ اس طرح توہین ہوئی ہے"۔

مگر حکام ریاست نے اس کیس کا عجیب و غریب فیصلہ یہ کیا۔ کہ ہندو کنسٹیبل کو (جس کی ملازمت تیس سال ہو چکی تھی) پنشن دے کر گھر بھیج دیا اور مسلمان کنسٹیبل کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا اب کشمیر اور جموں دونوں حصوں میں احتجاجی جلسے ہونے شروع ہو چکے تھے۔ پنجاب کے پریس اور پلیٹ فارم پر بھی (کشمیری مسلمانوں پر) مظالم کا چرچا تھا۔ سری نگر کی ریڈنگ روم پارٹی نے سری نگر کے دونوں مذہبی راہنماؤں یعنی میر واعظ احمد اللہ ہمدانی اور میر واعظ محمد یوسف کا تعاون حاصل کر لیا تھا۔ جامع مسجد اور خانقاہ معلیٰ میں باقاعدہ اجلاس منعقد ہو رہے تھے۔

جموں کے مسلمانوں نے مسٹر ویکفیلڈ کے کہنے پر مہاراجہ کے سامنے مطالبات پیش کرنے کے لیے اپنے چار نمائندے چنے:

(۱) چودھری غلام عباس۔ (۲) ایم یعقوب علی۔
(۳) سردار گوہر رحمان اور (۴) شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ۔

سری نگر کے مسلمانوں کا اجتماع ۲۱ جون ۱۹۳۱ء کو ہوا جس میں سات نمائندے منتخب کیے گئے۔

(۱) شیخ محمد عبداللہ (۲) میر واعظ احمد اللہ ہمدانی (۳) میر واعظ یوسف شاہ (۴) خواجہ سعد الدین شال (۵) خواجہ غلام احمد عشائی (۶) منشی شہاب الدین اور (۷) آغا سید حسین شاہ جلالی۔

امروہہ ضلع مراد آباد کے ایک مسلمان (جن کا نام مسٹر عبدالقدیر تھا) چند ایک انگریزوں

کے ساتھ بطور گائیڈ آئے ہوئے تھے وہ بھی اس جلسہ میں شریک ہوتے ۔ اور انہوں نے بھی تقریر کی ۔ اور مسلمانوں کو بے غیرتی کی اس زندگی کو چھوڑ دینے کی تلقین کی ۔ ریاستی حکام نے ان کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا ۔

(کشمیر کی کہانی صفحہ ۴۲)

۱۳ جولائی

۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کا دن کشمیر کی تحریک آزادی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ وہ دن تھا ۔ جب سری نگر کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بنی ۔ یہی وہ دن تھا جب مسٹر عبدالقدیر جسے حکومت کشمیر نے پچھلے دنوں احتجاجی جلسہ میں تقریر کرنے کے سلسلہ میں گرفتار کیا تھا ۔ کا مقدمہ سری نگر جیل میں پیش ہوا ۔ کارروائی سننے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان جمع ہو گئے ۔ اور جیل کے اندر جانے کی کوشش کرنے لگے ۔ پولیس نے ہجوم دور کرنے کے بہانے گولی چلا دی ۔ جس میں اکیس مسلمان شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے ۔ مولانا چراغ حسن حسرت اپنی مشہور کتاب "کشمیر" میں لکھتے ہیں ۔

"یہ ہجوم جیل سے نعرے لگاتا ہوا لوٹا ۔ تو اس کے شہر پہنچتے پہنچتے دکانیں بند ہو چکی تھیں ۔ ایک پنجابی ہندو کی دکان کھلی تھی ، لوگوں نے کہا ۔ تم بھی دکان بند کر دو ، اس پر وہ بہت بگڑا اور لڑنے پر آمادہ ہو گیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک نے جس کا رخ ابھی تک حکومت کی طرف تھا ۔ فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کر لی اور اس ہنگامۂ عام میں ہندوؤں کی کچھ دکانیں بھی لٹ گئیں ۔ اب پکڑ دھکڑ شروع ہوئی ۔ اور کوئی ساڑھے تین سو مسلمان گرفتار کر لیے گئے ۔ جن میں چودھری غلام عباس اور ان کے دو ساتھی بھی تھے ۔ دوسرے دن جامع مسجد کو بھی گھیر لیا گیا ۔ اور شیخ محمد عبداللہ بھی پکڑے گئے ۔ لیکن اس پکڑ دھکڑ کا کوئی فائدہ نہ ہوا ۔ اور لوگوں کا جوش گھٹنے کی بجائے بڑھتا چلا گیا کئی دن مسلسل ہڑتال رہی ۔ عورتوں بچوں کے جلوس نکلے ۔ کہیں کہیں ہنگامے بھی ہوتے ۔ اور ایک آدھ جگہ پھر گولی چلی ۔ شہر تو خیر شہر تھا ۔ جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ دیہات تک جا پہنچا ۔

لوگوں کے دلوں پر گرفتاری اور قید کا جو رعب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مٹ چکا تھا۔ ا
گرفتاری کیا چیز ہے لوگ سینوں پر گولیاں بھی کھا چکے تھے، لیکن حکام ابھی تک اس و
میں مبتلا تھے۔ کہ کشمیری آخر کشمیری ہیں وہ تو اصل میں باہر کے لوگوں نے انہیں اُبھار
سرکار کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا ہے۔ ورنہ ان بیچاروں کو ان قضیوں سے کیا واسطہ یہ خیا
دلوں میں ایسا بیٹھا تھا کہ نکالے نہیں نکلتا تھا۔

حکومت کے کارپردازوں نے یہ نتیجہ اس لیے نکالا کہ مغلوں کے زمانے سے کشمیریوں
کو حکام کے احکام سے کبھی سرتابی کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ مغلوں کے عہد میں جو آرام
تھا اس نے عیش و عشرت کا خوگر کر دیا تھا۔ اس کے بعد ڈیڑھ سو سال ایسا ظلم و ستم دیکھ
کر ساری ہمت جواب دے گئی۔ چنانچہ مدتوں سے کشمیریوں کا یہ حال تھا۔ کہ کسی سرکاری
اہلکار نے ذرا دھمکی دی اور ڈر گئے۔ اس لیے حکام سمجھتے تھے۔ کہ یہ جوش و خروش عارضی
جذبات کی چڑھی ہوئی ندی اتر گئی تو وہی کشمیری ہوں گے۔ وہی ہم۔ جب چاہیں گے ڈ
لیں گے۔ اور جو چاہیں گے کریں گے۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ حکومت کا ڈر دلوں
سے ایک دفعہ نکل گیا تو نکل گیا۔ مہاراجہ نے جب دیکھا کہ معاملہ بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ تو راج
ہری کشن کول کو جو بڑا جہاندیدہ شخص تھا اور ریاستی معاملات کا بڑا تجربہ رکھتا تھا۔ بلوا کے
ریاست اس کے حوالے کر دی۔ اس نے بڑی ہوشیاری دکھائی۔ یعنی جب دیکھا کہ اعلانوں
سے کام نہیں نکلتا تو لیڈروں سے پُرامن رہنے کا وعدہ لے کر انہیں رہا کر دیا۔ پھر ان سے
سمجھوتے کے لیے گفتگو شروع کی۔ یہ مرحلہ بھی بڑی خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ یعنی ادھر سے
وفاداری کا یقین دلایا گیا۔ ادھر سے قیدیوں کو رہا کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ لیکن راجہ پرانا پاپی
تھا۔ زمانے کے کئی اتار چڑھاؤ دیکھ چکا تھا۔ ادھر شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی الہڑ
نوجوان تھے، جنہوں نے تحریکوں کا حال کتابوں میں پڑھا تھا۔ یا لوگوں سے سنا تھا۔ راجہ
نے نوجوانوں سے جو اقرار نامہ لکھوایا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ تحریک ختم کر دی جائے گی۔
جامع مسجد میں آئندہ تقریریں نہیں ہوں گی۔ ساری مسجدوں میں اعلان کر دیا جائے گا
کہ مسلمان باہر کے لوگوں کا اثر قبول نہیں کریں گے۔ اور مہاراجہ کے وفادار رہیں گے۔

ومت کی طرف سے وعدہ کیا گیا۔ کہ جب تحریک بالکل ختم ہو جائے گی تو قیدیوں کو رہا کر
یا جائے گا۔ جو احکام پچھلے دو مہینوں میں نافذ ہوئے ہیں، وہ واپس لے لیے جائیں گے۔
ر جن سرکاری ملازموں کو موقوف کیا گیا ہے۔ وہ آئندہ سیاسی جھگڑوں سے الگ رہنے کی
مانت دے سکے تو انہیں بھی بحال کر دیا جائے گا۔ نوجوان لیڈر سمجھتے تھے کہ میدان ہمارے
تھ رہا۔ یعنی ہم نے حکومت کو سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور اُدھر حکام اس خیال میں مگن تھے
بیرونی مداخلت کا کانٹا جو مدت سے کھٹک رہا تھا۔ وہ تو نکل گیا۔ یعنی باہر کے لوگ جب
نیر کے معاملات میں دخل دینا چاہیں گے۔ خود کشمیری مسلمان انہیں یہ کہہ کے چُپ کرا دینگے
م ہمارے معاملات میں دخل دینے والے کون؟"

(کشمیر صفحہ ۱۵۲)

لیکن ریاست کے حکام کے تمام جتنوں کے باوجود اس سانحہ نے پورے ہندوستان میں کہرام مچا دیا۔ اور بالخصوص پنجاب میں تو زبردست اشتعال پھیل گیا۔ اس اشتعال نے ں پنجابی مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو مختلف انداز میں متاثر کیا۔ ایک طرف نچلے درمیانہ قے کے مجاہدین کی جماعت مجلس احرار اس سانحہ سے متاثر ہوئی تو دوسری طرف اوپر کے بقہ کے مسلمان بھی خاصے پریشان ہوئے۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا قیام

گرمیوں میں شملہ حکومت ہند کا دار الحکومت ہوتا تھا۔ اور اوپر کے طبقے کے زعماء اکثر و بیشتر وہاں موجود ہوتے تھے، اور جو نہیں ہوتے تھے وہ بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۱ء کے آخری ہفتہ میں نواب سر ذوالفقار علی کی کوٹھی (FAIR VIEW) میں ان عمائدین کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں امام جماعت احمدیہ، ڈاکٹر سر محمد اقبال، نواب سر ذوالفقار علی خاں، خواجہ حسن نظامی، نواب گنج پورہ سید محسن شاہ، خان بہادر شیخ رحیم بخش، مولانا اسمٰعیل غزنوی، مولانا عبد الرحیم درد، مولانا نور الحق (مالک انگریزی روزنامہ آؤٹ لک) سید حبیب شاہ (مالک روزنامہ سیاست) اور نمائندگانِ ریاست و سرحد شامل ہوئے۔

مولوی عبدالرحیم، ایم اے۔ ایل ایل بی، نے صوبہ کشمیر کی اور جناب اللہ رکھا ساغر نے صوبہ جموں کی اور صاحبزادہ سر عبدالقیوم کے بھائی صاحبزادہ عبداللطیف نے صوبہ سرحد کی نمائندگی کی۔ ریاست کے تازہ حالات بیان کرنے کے بعد بڑی تفصیل کے ساتھ تمام امور پر بحث کی گئی اور فیصلہ ہوا کہ ایک "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" بنائی جائے۔ جو اس سارے کام کو اپنے ذمے لے کر پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ اور یہ مہم جاری رہے جب تک ریاست کے باشندوں کو ان کے جائز حقوق نہ مل جائیں۔

اس کمیٹی کے صدر مرزا بشیرالدین محمود امام جماعت احمدیہ مقرر ہوئے اور سیکرٹری بھی احمدی جماعت کے سرگرم کارکن اور مبلغ مولانا عبدالرحیم درد لیے گئے۔

ایک طرف اس کمیٹی نے اپنے اوپری طبقے کے انداز کے مطابق آئینی طور طریقوں سے اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوششیں شروع کیں لیکن مجلس احرار جو ہمیشہ سے اس طبقے کے چلن کے بارے میں شاکی رہتی تھی، اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے اس اقدام کو انگریز کی سازش تصور کیا۔ تاہم اس کی بظاہر کچھ وجوہات بھی تھیں۔

اولاً۔ احمدی حضرات کبھی بھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے عادی نہ تھے۔ وہ حکومت کے حامی اور وفادار تصور ہوتے تھے، اور یہ وفاداری ان کی مذہبی تعلیمات کا ایک حصہ تھی، اس لیے جب یکایک احمدی جماعت کا سربراہ کسی خالصتاً سیاسی مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہو تو ظاہر ہے اس مسئلہ کو ایک خاص انداز میں اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔

دوسرے۔ احمدی جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں کو عامۃ المسلمین نے ہمیشہ شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اس لیے اب ۳۲ لاکھ مسلمانوں کے خطے پر اگر احمدی جماعت کا اثر و رسوخ اپنا کام کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے اس سے ان کے فرقے کو بالواسطہ یا بلاواسطہ توسیع ہوتی ہے اس سے بھی احرار خاصے جزبز ہوئے۔ چنانچہ چودھری افضل حق مرحوم اپنی کتاب "تاریخ احرار" میں لکھتے ہیں:

کشمیر میں شورِ قیامت، احرار کی شرکت

"اس دوران میں کشمیر بھر دیوار گریہ بن گیا۔ سری نگر نے خون شہداء کے باعث کربلا

کی سی صورت پیش کی۔ مولانا مظہر علی کچھ تاریخ کربلا کی رعایت سے بے تاب ہوئے اور اقدام سوچنے لگے۔ ابھی ہماری سست فکری کسی منزل پر نہ پہنچی تھی کہ کچھ عافیت کوش مسلمان شملے کی بلندیوں سے بادل کی طرح گرجے اور حکومت کشمیر پر بجلی بن کر گرنے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں اور ایک درخواست بھیج کر تحقیقاتی کمیشن کی اجازت چاہی۔ ریاستی حکومت جانتی تھی کہ یہ گرجنے والے برسیں گے نہیں اس لیے درخواست پر نامنظور لکھ بھیجا۔ بہت اچھلے کودے۔ مگر کچھ دیر بعد تھک کر بیٹھ گئے۔ ان خانہ برباد رؤسا اور امراء نے غضب یہ ڈھایا۔ کہ مرزا بشیر الدین محمود قادیانی کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ جمعیت العلماء نے ستم یہ کیا کہ اس کشمیر کمیٹی سے تعاون کا اعلان کر دیا۔ اس شخص نے اہل خطہ کی یہ "خدمت" کی۔ کہ مرزائی مبلغ بھیج کر سرکاری نبوت کی اشاعت شروع کر دی۔ اور دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹا۔ کہ پورے اسلامی ہند نے اسے لیڈر مان کر اس کے باپ کی نبوت کی تصدیق کر دی ہے۔ کشمیر کا سادہ دل اور مصیبت زدہ مسلمان ہر کس و ناکس کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ اس لیے باخبر اہل مذہب کو مرزائی مبلغوں کے ہاتھوں، مسلمانان کشمیر کے ارتداد کا خطرہ لاحق ہو گیا۔

میں ان دنوں اپنے گاؤں گڑھ شنکر میں بیٹھا ان واقعات اور حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس پیدا شدہ صورت حال سے گھبرا گیا۔ اور لاہور پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا داؤد غزنوی ٹانگے پر سوار پریشان سے جا رہے ہیں۔ پوچھا کدھر کا عزم ہے؟ کہا کہ "مرزائی قیادت مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہو گی۔ میں شہر کے علماء سے مل کر ان کی قیادت کے خلاف اعلان کرانا چاہتا ہوں؟" میں نے کہا کہ بھائی محض کاغذی بم قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کو کافی نہیں۔ اب تو بڑی قربانی ہی مشکلات کا حل ہے۔ سواری چھوڑ دو تاکہ دفتر میں بیٹھ کر تدبر کے گھوڑے دوڑائیں۔ اور ہمت مردانہ سے قسمت پر کمند پھینکیں اور تدبیر سے تقدیر کو بدلیں۔ اسی دن یا اگلے دن علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں محمڈن ہال میں عمائدین شہر کا جلسہ تھا۔ جس میں کشمیر کی اس بڑی قسمت زیر غور تھی، مولانا مظہر علی غالباً مولانا داؤد غزنوی بھی اور میں بھی محمڈن ہال گئے۔ خیال یہ تھا کہ کوئی تدبیر لڑا کر مرزا بشیر کی کشمیر کمیٹی کے مقابلے میں احرار کے

حق میں ان لوگوں کی تائید حاصل کی جائے۔ باقی حاضرین طبقۂ اُولیٰ سے متعلق تھے۔ وہ احرار کے نام پر حقارت سے منہ لبسورتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صاحب احرار کو آگے بڑھانے پر بضد تھے۔ بہرحال بزدری و بزاری ان کا اعلان اپنے حق میں کروانے میں کامیاب ہوگئے۔ پس تھوڑی سی کھڑے ہونے کو جگہ ملی تھی، بیٹھے اور پاؤں پسار کر ساری جگہ پر قبضہ کرنے کے لیے ہمت درکار تھی۔ لیکن اب طبیعتوں میں زیادہ تذبذب نہ تھا۔ احرار سپاہی تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر نئے اقدام کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ احرار لیڈروں کو جیل کی سڑک بہشت کی روشوں کی طرح گل ریز اور عنبر بیز معلوم ہوتی ہے۔ کانگرس حکومت سے ٹکر نہ لینا چاہتی تھی۔ اب ہم سب کشمیر کے معاملے کو ہمت اور حوصلے سے سلجھانے پر آمادہ تھے۔ ملک کا ماحول یہ تھا کہ سیاسی جماعتیں باوجود غریبوں کا دم بھرنے کے رئیسوں کی منظورِ نظر رہنا چاہتی تھیں، آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۲۸ء میں رؤسا کی حیثیت برقرار رکھنے کی ایک دفعہ کا خاص اضافہ کیا گیا۔ گاندھی اور مالوی تو ریاستوں کے مسلّمہ راج گورو ہیں۔ اوروں میں مخالفانہ زبان ہلانے کی جرأت کہاں؟ رؤسا کے متعلق ہمارا تصور بیٹے بچاریوں اور حسن کے بے پناہ ڈاکوؤں سے زیادہ نہ تھا۔ خون غریباں جن کی رنگ و بو کا سامان ہے ہم پورے سکون قلب کے ساتھ رئیسی کا سکون دل برباد کرنے پر آمادہ تھے، غریب ہندو ہو یا مسلمان ہماری توجہ اور مدد کا مستحق ہے۔ مگر کشمیر کے مسلمان کی کیفیت سمجھنے کے قابل ہے۔ وہاں کا ہر ہندو عام اس سے کہ غریب ہو یا امیر، مسلمان کو "رمضانی مار کھانے کی نشانی" سمجھ کر راہ چلتے اس کے حصّۂ اسفل پر ٹھوکر رسید کرنے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ حاکم وقت کے ہم مذہب ہونے کے باعث اپنے آپ کو خاص امتیازات کا حامل خیال کرتا تھا۔ ایسی دوگونہ غلامی کشمیر کے مسلمان کی اس وقت کی قسمت تھی، رؤسا اور احرار کی آویزش طبعی اور طبقاتی آویزش کے علاوہ مذہبی بھی ہے۔ فطرت انسانی اور قلب سلیم نے عدم مساوات کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ احرار غریب طبقے سے متعلق ہونے کے باعث طبقۂ اُولیٰ کو نیچا دکھانے میں خاص خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اسلام طبعی مذہب ہونے کے باعث ہر قسم کی سرمایہ داری کا کھلا دشمن ہے۔ اس لیے جماعت کا ہر فرد انتہائی قربانی پر آمادہ

تھا۔ لیکن ایسی آمادگی کے باوجود حزم و احتیاط شرط دانائی اور کامیابی ہے۔

قصہ مختصر میرے وجدان نے ہمیشہ جماعتی فیصلوں کے بعد تحریکوں کو ان ہی کے سپرد کرنے کو کہا ہے۔ جب مولانا مظہر علی نے اقدام کی ذمہ داری اٹھائی میں مطمئن ہو گیا۔ اور مولانا حبیب الرحمن اور حضرۃ شاہ صاحب بمبئی سے اپنے مشن میں ناکام لوٹے۔ یعنی ارباب کانگرس کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شمولیت سے باز نہ رکھ سکے۔ اس عرصہ میں کشمیر میں گولی چلائی گئی ایک بے گناہ شہید اور کئی مجروح ہوئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ سارے خطے کو آگ لگ گئی ہے۔ اور پوری ریاست اس کی لپیٹ میں آگئی ہے۔ ریاستی مظالم سے تنگ آئی اور بھوکوں ماری مخلوق کی شمع زندگی بجھنے سے پہلے ایک آخری تڑپ دکھانے پر آمادہ تھی، خبروں پر سنسر اور آمدورفت پر پابندی کے باعث خیالات میں بھیانک بھوت ناچنے لگے۔ سچی خبروں پر پابندی جھوٹی افواہوں کے دروازوں کو چوپٹ کھول دیتی ہے۔ تخیلات کی دنیا میں گڑبڑی سی مچ جاتی ہے۔ اور دماغوں میں عام پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ پورے شمالی ہند کے مسلمان کشمیر کی افواہوں سے بن پانی کے مچھلی بنے ہوئے تھے۔ قرار پایا کہ مولانا فوراً ریاست کو تحقیقاتی وفد کے لیے لکھ دیں۔ اجازت نہ بھی ملے تو بھی اپنے مذہبی رجحانات کے مطابق "علی، علی" کہہ کر جائیں دیکھا جائیگا۔ بس یہی بے سروسامانوں کا سامان ہے۔ احرار کے پاس توکل کے سوا کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ مگر بڑے اقدامات کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں، اب جو ریاست کے پاس ہمارا عریضہ پہنچا۔ تو انہوں نے سرکار انگریزی سے پوچھا۔ کہ یہ احرار کیا بلا ہیں؟ ادھر انگریزی سرکار بھی بے خبر نہ تھی۔ وہ ہمارے مزاج اور ذہن سے واقف تھی، کہ ان بادلوں کے آوارہ ٹکڑوں میں طوفان پوشیدہ اور بجلیاں لرز رہی ہیں، انہوں نے بھی دریافت شروع کی۔ کہ تمہارے کیا ارادے ہیں؟ لاہور کے مقامی افسروں کی معرفت حکام بالا تک یہ خبر پہنچا دی گئی کہ اگر اجازت نہ دی گئی تو ہم بن بلائے مہمان کی طرح ریاست میں چلے جائیں گے۔ جواب ملا کہ اگر انہوں نے جیل کا مہمان بنایا۔ تو جواب الجواب میں کہا گیا کہ ہم بھی آفت جان بن جائیں گے۔ یہ سن کر برٹش سرکار نے ریاستی دربار کو لکھا۔ کہ یہ بے ڈھب کے لوگ ہیں، کہیں مرزا بشیر کی کشمیر کمیٹی نہ سمجھ لینا۔ یہ امراء نہیں، عوام کے نمائندے ہیں مطلب یہ کہ اپنی پگڑی پہلے ہی بغل میں دابے پھرتے ہیں، اور دوسروں کی اچھل جائے تو افسوس

نہیں کرتے۔ اس سرکاری تحقیقات میں بھی کچھ عرصہ گزر گیا۔ تاہم خاموش ہم بھی نہیں رہے، برابر "یوم کشمیر" منانے اور عوام کو اپنا ہمدرد بنانے میں مصروف رہے۔ آخر ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور حسب الحکم ورکنگ کمیٹی بلا رخت سفر باندھے سری نگر کی نیت کر کے چل پڑے۔ اسٹیشن پہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ لاہور سے گوجرانوالہ تک وفد کے چار ممبروں کا پورا کرایہ نہیں، اتنے عزم اور یہ وسائل اپنی بے بسی پہ ہنسی تو آئی۔ مگر عاشقوں کی منزلیں یونہی طے ہوا کرتی ہیں، راہ روان منزل محبت پلے باندھ کر کب چلے ہیں کہ ہم چلتے ؎

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

مالی پریشانیوں میں منزل کھوٹی کر دینا مسلمانوں کا کام نہیں، چنانچہ میں اور مولانا مظہر علی تو گوجرانوالہ روانہ ہو گئے خواجہ غلام محمد اور ایک اور عزیز ممبر وفد تو نہ تھے۔ مگر دفتری ضرورتوں کے لیے ہمراہ تھے، لاہور میں رہے چودھری اللہ بخش گنائی کو جو لاہور کے مخلص دوستوں میں سے ہیں، معلوم ہوا کہ مالی مجبوریاں مانع سفر ہیں، تو بیوی کا زیور رہن رکھ کر ڈیڑھ صد روپے دفتر کو دیا۔ کہ خدا کا کام اتنے میں نہ رکے مجھے مولا چاہیئے مال نہ چاہیئے۔ گوجرانوالہ کے دوستوں نے سنا تو یہ روپیہ واپس کر دیا۔ کہ زادِ راہ کے ہم کفیل ہیں، رات کو گوجرانوالہ میں جلسہ عام ہوا سید عطا اللہ شاہ بخاری کی تقریر اور کشمیر کا مسئلہ، چھن چھن کے دماغ سے اترے موتیوں کی مالا بن بن کر منہ سے جھڑتے، سننے والوں میں آگ لگا دی، اور سامان سکون چھین لیا۔ صبح شہر کا رنگ اور تھا۔ گھر گھر کشمیر کے مظالم کی داستانیں بیان ہو رہی تھیں اور بازاروں میں بچے ٹولیوں میں "احرار زندہ باد" کے نعرے بلند کر رہے تھے، اس حوصلہ افزائی سے ہمارے دل دگنے ہو گئے اور نیک دعائیں دیتے ہوئے اس شہر سے چلے اور سیالکوٹ پہنچے یہ مقام زندہ دل اور پُرجوش لوگوں کی بستی ہے۔ احرار کا یہ "مدینہ" نیکی کی تخت گاہ اور بروں کے ہاتھوں بھاگے ہوئے لوگوں کی آخری جائے پناہ، جب ہم اسٹیشن پر پہنچے۔ تو بڑا اژدھام تھا۔ لوگوں کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ ہمیں ایک نظارۂ طائر سے معلوم ہو گیا کہ اہل شہر کے قلب کی کیفیت کیا ہے۔ اگلے روز مختلف شہروں کے احرار والنٹیروں کا اجتماع تھا۔ شہر کے مرد و زن تماشائی تھے۔ بڑی چہل پہل تھی۔ جموں کا گورنر خود حالات کا جائزہ لینے سیالکوٹ میں موجود تھا۔

اس نے غریبوں کے یہ ٹھاٹھ دیکھے تو بڑا متاثر ہوا اور وزیر اعظم کشمیر کو بذریعہ تار کہا کہ احرار وفد کو داخلے سے روکنا ریاست کی فوری پریشانی کا باعث ہوگا۔ یوں گورنر نے ہمارے داخلے کی اجازت حاصل کر لی۔

مرزا بشیر الدین محمود بھی شہر پر اپنا رنگ جمانے آیا۔ مگر مجمع کو مخالف پاکر چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں وہ کچھ بولا تو سہی۔ مگر عوام کے نقار خانے میں سرکاری طوطی کی کون سنتا ہے۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے تھے۔ کسی کی کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بہت زور مارا مگر شور نہ تھما۔ جب سعی بے سود سے گلا بیٹھ گیا۔ تو ناچار مرزا صاحب بھی بیٹھ گئے۔ اور ایسے بیٹھے کہ کسی شہر میں جا کر احرار کے خلاف اور کشمیر کمیٹی کے حق میں کھڑے ہو کر کچھ کہنے کی پھر جرأت نہ ہوئی۔ ورنہ ان دنوں انہیں بھی مرزائیوں کا سید عطاء اللہ بننے کا شوق چرایا ہوا تھا۔ زعم باطل یہ تھا کہ میں سید موصوف کی طرح بے قابو مجمع کو جادو بیانی سے مسحور کر سکتا ہوں۔

مولانا مظہر علی کے لاہور آنے کے بعد وزیر اعظم کشمیر سر ہری کشن کول کا پرسنل اسسٹنٹ میری تیمار داری کے لیے ہوس بوٹ میں آیا۔ مزاج پرسی کے بعد یوں ہی اس نے سیاسیات کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسے اپنی قوت تمیز پر بڑا ناز تھا۔ بے شک وہ اچھی سوجھ بوجھ کا آدمی تھا۔ لیکن عوام کے ذہن کے بنیادی محرکات کو سمجھنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس کو یقین تھا کہ وہ انگریزی فوج کی مدد کے بغیر ریاستی فوج اور پولیس کی قوت سے حالات پر قابو پالیں گے۔ میں تحریک کشمیر کو عوام کے گہرے اقتصادی اور سیاسی زخموں کا نہ مندمل ہونے والا گھاؤ سمجھتا تھا۔ میرا قیاس یہی کہتا تھا۔ کہ اگر مجلس احرار جان و دل سے مدد کو اٹھی۔ تو حالات ریاست کے قابو میں نہ رہیں گے۔ یک بیک میں نے دیکھا کہ اس کی طبیعت پر میرے دلائل کا جادو چل گیا۔ پھر وہ مبہوت سا ہو کر میرے وجوہات کو سننے لگا۔ اور میری امید سے کہیں زیادہ اثر لے کر اٹھا۔ وہ دوسرے دن پھر وزیر اعظم کی طرف سے مجھے ملنے آیا۔ پہلے کی نسبت اب اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ اب وہ زیادہ مؤدب تھا میری ہر بات پر توجہ دیتا تھا۔ اس نے وزیر اعظم کی طرف سے خواہش ظاہر کی۔ کہ میں کشمیر کی

سیاسیات کے متعلق اپنی کُل والی رائے کو اپنی آولین فرصت میں قلم بند کر دوں۔ چنانچہ میں نے باوجود بیماری کے مکمل رائے اردو میں لکھ کر بھیج دی۔

اب مولانا مظہر علی واپس آگئے تھے۔ تعجب ہے کہ حالات نے اس میری رائے کے مطابق بدلنا شروع کیا۔ شیخ محمد عبداللہ کشمیر کے لیڈر گرفتار ہو چکے تھے۔ ہم پہ پابندیاں زیادہ ہو گئیں۔ لیکن واقعات نے نازک صورت اختیار کر لی۔ توانائوں کا ناتوانوں کی رائے کو رد کر دینا کتنا آسان ہوتا ہے؟ وہ اکثر اوقات خطرے کو برداشت کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں، مگر کمزوروں کی رائے کا احترام کرنا اپنی عزت نفس کے خلاف سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہم کشمیر سے ناکام لوٹ آئے۔ مولانا کی ملاقات مہاراجہ سے بھی ہوئی۔ میں نے واپسی پہ وزیر اعظم سے ملنا ضروری سمجھا۔ میں اپنی سیاسی زندگی کے ابتدا ہی سے مسٹر ہری کشن سے واقف تھا۔ وہ جالندھر ڈویژن کے کمشنر تھے۔ جب میں ملازمت سے مستعفی ہو کر آیا۔ ضلع کی خلافت کمیٹی کا صدر اور کانگرس کا سیکرٹری ہونے کے باعث ان کی تشویش کا باعث ہوا۔ وہ مجھے میرے وطن گڑھ شنکر ملنے آئے۔ مگر میں نے وقت کے تقاضے اور خلافت اور کانگرس کی پیدا کردہ سپرٹ کے ماتحت ملنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ حکام سے عدم تعاون لازمی قرار پا گیا تھا۔ اب صورت مہمان عزیز کی تھی، سیاسی دستور یہی تھا۔ اس دستور کی یہ باعزت استثنا تھی۔

واپس آکر پُرامن جنگ کو ہم نے ضروری سمجھ لیا تھا۔ دلائل بغیر قوت کے بیکار ہیں۔ کمزور کی دلیل بے دھار کا کھانڈا ہے نہ اپنے ہاتھ کی زینت نہ دوسروں کے گلے کی کاٹ۔ ہم نے قوت کی فراہمی پر پہلے سے زیادہ زور دیا۔ اب ریاست کو پہلے سے قوی تر خطرہ ہو گیا۔ شیخ محمد عبداللہ کو رہا کر دیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور ریاستی حکومت نے ہمارے ساتھ معاملہ کرنے کی لائن تیار کی۔ ہمیں کشمیر آنے کی دوبارہ دعوت دی گئی۔ ہم پھر وہاں گئے۔ ہم ریاست میں ذمہ دار حکومت کے طالب تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کے ذہن میں یہ ڈالا گیا تھا کہ اوّل تو احرار حکومت انگریزی کی مخالف جماعت ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں ان کا اثر معکوس ہے۔ دوسرے ان کا یہ مطالبہ انقلابی نوعیت رکھتا ہے۔ مناسب ہے کہ تم ریاستی

لیڈر کی حیثیت سے اقل ترین مطالبہ کرو۔ اور احرار سے بے نیاز رہو۔ بدنصیبی سے احرار کے خلاف یہ ہتھیار بڑا مؤثر ثابت ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ کو ہم اپنا ہم خیال نہ بنا سکے۔ ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کہ ہم بھی ریاست میں سے ذمہ دار حکومت کا کوئی طالب بنائیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور ہم دونوں یہ سمجھ رہے تھے۔ کہ ہم آئندہ بیس برس کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور لڑائی اسی بات کی ہے۔ کہ عوام کو کس قدر اختیارات دیئے جائیں؟ اگر شیخ محمد عبداللہ جیسا وسیع النظر باا ثر ریاستی لیڈر دل سے ہمارا ہمنوا ہوتا۔ تو ہم نہ صرف ریاست کشمیر بلکہ دوسری ریاست کے باشندوں کا بہت کچھ راستہ صاف کر دیتے۔ فوج میں بہادری کے ہزار جوہر ہوں۔ مگر کمان کرنے والے جرنیل ہم خیال نہ ہوں۔ تو قوت کمزور ہو جاتی ہے۔ ہم شیخ محمد عبداللہ کی پارٹی کو بد دیانت یا بزدل نہیں کہتے۔ مگر معاملہ سمجھنے میں انہوں نے بڑی ٹھوکر کھائی۔ رائے کا یہ اختلاف حوصلہ شکن ہو سکتا تھا لیکن ہم نے ہمت نہ ہاری۔ سیالکوٹ پہنچ کر فوراً والنٹیروں کو ریاستی حدود میں داخل ہونے کا حکم دے دیا۔ خود مولانا مظہر علی نوجوانوں کا ایک دستہ لے کر ریاست کے حدود کی طرف بڑھے۔ ریاست نے آسان کھیل سمجھ کر ان پر ہاتھ ڈالا۔ لیکن ان کی گرفتاریوں سے گویا جنگل میں آگ لگ گئی۔

زور آزمائی

گورنمنٹ آف انڈیا کی اطلاع پر ریاست نے پانچ ہزار قیدیوں کی رہائش کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ ہماری قوت کا انتہائی اندازہ تھا۔ اس اندازے سے ہم بھی غیر مطمئن نہ تھے۔ وقت کی بات ہوتی ہے۔ ہم چھوٹے بڑے سب جان لڑانے کے لیے آمادہ تھے۔ جب ارادہ ہو تو کام کی راہیں نکل آتی ہیں۔ دنیا نے تعجب سے دیکھا۔ کہ مردہ قوم زندگی کی کروٹیں لینے لگی۔ سیالکوٹ سے اکیس اکیس نوجوانوں کے جتھے رات کی تاریکی میں دشوار گزار راستوں سے گزر کر نور کے تڑکے جموں میں داخل ہوئے۔ جب گلی کوچوں سے تکبیر کے نعرے بلند ہوئے۔ تو ہندوؤں نے سمجھا کہ محمود سومنات پر چڑھ دوڑا۔ دیویوں نے بچے چھاتیوں سے لگا لیے اور ایشور جپ، جاپ کرنے لگیں۔ کہ ہرے بھگوان ان ملیچھوں کا ناش کر دے۔ یہ موئے منڈی

کالٹے کہاں سے آگئے۔ پولیس بے خبری میں خراٹے لے رہی تھی، وہ ڈراؤنے سپنے کی طرح اللہ اکبر کے نعروں سے دھڑ دھڑا کر اٹھی۔ افسروں نے گھبرا کر فالن فالن (FALLINFALLIN) کہنا شروع کیا۔ مشہور ہے کہ بدحواسی اور جلدی میں کوٹ کو برجس سمجھ کر بعض سپاہیوں نے اس کے بازوؤں کو ٹانگوں پر چڑھا لیا۔ خیر یہ تو مبالغہ آمیز اور مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر ریاست کی پولیس کو ان اچانک حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ جس کے لیے وہ تیار نہ تھی۔ ہر طرف آگئے آگئے ہوتا تھا۔ مگر کسی کو یہ نہ سوجھتی تھی کہ یہ آگئے ہیں تو ان کا کریں کیا؟ سیالکوٹ کی ماؤں نے قرون اُولیٰ کی عورتوں کا نقشہ پیش کر دیا۔ ہر گھر میں نوجوانوں سے اصرار کا ساتھ دینے کا تقاضا تھا۔ بہنوں نے بھائیوں کو پیار سے جدا کیا۔ بیویوں نے خاوندوں کو ڈبڈباتی آنکھوں سے الوداع کہی۔ جوش و خروش کے ایسے نظارے چشم فلک نے کہاں دیکھے ہوں گے؟ نور ایمان لوگوں کی آنکھوں سے ٹپکنے اور چہروں سے جھلکنے لگا۔ کفر دروازے بند کر کے دروازوں سے سہم سہم کر دیکھنے لگا کہ اسلام — خون کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے۔ ماں کی گود ہی اقوام و ملل کی پرورش گاہ ہے۔ یہاں کا عزم بیٹے کی سربلندی عمل کا باعث ہوتا ہے۔ سیالکوٹ کے نوجوانوں میں روح جہاد کی ذمہ دار سیالکوٹ کی مائیں بہنیں اور بیٹیاں ہیں، اپنے عزیزوں کو الوداع سے شیر طبیعت مجاہد بنا دیا۔ میں نے کسی اسلامی شہر میں عورتوں میں سیاسی جلسوں میں شمولیت کا ایسا شوق نہیں دیکھا۔ پس پہلے عورتوں نے ضرورت زمانہ کو سمجھا پھر بچوں کو سرفروشی کے لیے آمادہ کیا۔ جس ملک و قوم کی مائیں دنیا کے حالات اور ضرورت سے بے خبر ہیں۔ اس ملک کے نوجوان روح جہاد کو ضائع کر کے حرم سراؤں کے خواجہ بن جاتے ہیں، پس قوموں کی درست تربیت عورتوں کی درست تعلیم پر ہے۔ سیالکوٹ کے بہادر فرزندوں نے ہندوستان کی سول نافرمانی کے سارے ریکارڈ کو مات کر دیا۔ باوجود اس امر کے کہ متعدد مقامات پر وہ سنگینوں پر دھر لیے گئے لیکن انہوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر سرد راتوں میں یلغار کر کے جموں کے قریب تند و تیز ندی کو ہمت سے عبور کیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ۲۱ نوجوانوں کا دستہ شہر سے روانہ ہو کر رات کی تاریکی میں گم ہو جاتا تھا۔ سات دن کے اندر دس ہزار شیر دل مجاہدوں نے سرحد کو عبور کر کے

اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ بے مثال قربانی کی یہ مثال دیکھ کر ریاستی حکام کے دماغ پریشان ہو گئے۔ اور ساری سلطنت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ صرف جموں ہی ایک محاذ نہیں بنایا گیا۔ بلکہ جہلم کے راستے میرپور ایک اور پُرامن جنگ کا محاذ تجویز ہوا۔ جہاں شہید الٰہی بخش کا ریاست کے ایک ذمہ دار افسر نے نوک سنگین سے سینہ چھید کر مسلمانوں کے سینہ میں ناسور ڈالا۔ اور وہ ماہی بے آب کی طرح خاک اور خون میں تڑپا۔ موت کی بے کلی میں بھی کلمہ پڑھتے شہید ہوا۔ خون ناحق کا بہنا تھا۔ کہ پنجاب کے غریب نوجوانوں کا خون کھولنے لگا۔ ہر طرف سے پیدل جیتھے کشمیر کی سرحدات کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے پیدل مارچ نے عوام میں جوش جہاد کو اور زیادہ کر دیا۔ خواجہ غلام محمدؒ تیس سرفروشوں سے قرآن پر حلف لے کر لاہور سے راولپنڈی اور پھر کوہالہ پہنچا۔ حلف یہ تھا۔ کہ "جان دے کر بھی کوہالہ کے پل کو بند کر دیں گے۔" دریا جہلم وہاں کتنا پر جوش تیز و تند ہے۔ کئی نوجوان دریا میں گرے کچھ سپاہیوں کی سنگینوں پر پڑے۔ تیسرے دن خبر آئی۔ کہ احرار نے پل پر قبضہ کر کے آمد و رفت کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ کشمیر کی تجارت کی یہی شاہراہ ہے۔ دو دن میں ہزاروں لاریاں دونوں طرف رُک گئیں۔ ریاست کو گولی میں تذبذب تھا۔ کیونکہ علاقہ پہاڑی اور ہر شخص مسلح تھا۔ گولی چلنے سے ایسی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ جس کا فرو کرنا ریاست کے بس کی بات نہ تھی۔

ریاست کا انتظام

ریاست کی جیلوں کا انتظام تارِ عنکبوت ہو گیا۔ احرار قیدیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی۔ کہ خاردار جیل خانے سیرگاہ بن گئے۔ بدانتظامی کے باعث جو جب چاہے گھر کو آ جائے جو چاہے بغیر گرفتاری کے جیل میں داخل ہو جائے۔ اتنی بھاری قیدیوں کی تعداد کے لیے جیل کا سٹاف پورا نہ تھا۔ یہاں جیل سچ مچ کھیل بن گئی۔ ابھی نئے احرار دستوں کی آمد آمد تھی۔ حالات سے گھبرا کر آخر ریاست نے انتظام وائسرائے کے حوالے کر دیا۔ جس نے غیر معمولی

گزٹ کے ذریعہ ریاستی انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے کر احرار کی قوت کا علانیہ اعتراف کیا۔ گزٹ کی اشاعت کے ساتھ ہی مسلمان امراء کی طرف سے اعلان شائع ہونے شروع ہوئے کہ احرار کو سول نافرمانی اب بند کرنا چاہیئے۔ اب سول نافرمانی کا جاری رکھنا انگریز کی ہمدردی کو بے سبب ضائع کرنا ہے "گویا انگریز ریاستوں میں ترقی پسند آئین چاہتا تھا۔ اونچے طبقے کی کیا بات ہے۔ انہیں اندیشہ یہ ہوا کہ مبادا حکومت ساری مسلم قوم کے سر سوار ہو جائے۔ کہ تم سب باغی ہو۔ اور غریب احرار کے ساتھ گھن کی طرح نہ پس جائیں، دفتر میں گروہ در گروہ وہ آئے۔ کہ بھیا بہت ہولی۔ اب بس بھی کر دو ایسا نہ ہو۔ کہیں سرکار ناراض ہو جائے میں نے کہا۔ بزرگو! نبرد آزمائی تو احرار اور سرکار میں ہو رہی ہے۔ تمہاری سانس کیوں پھول رہی ہے ! اطمینان سے تماشا دیکھتے جاؤ۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ کرے مونچھوں والا اور پکڑا جائے داڑھی والا۔ انہوں نے کہا سنا نہیں کہ اونٹوں کو بیگار میں پکڑتے تھے۔ تو احتیاط کے تقاضوں کے مطابق لومڑی بھی ڈر کے مارے بھاگ نکلی۔ کسی نے کہا بی لومڑی تم کیوں بھاگی جا رہی ہو ؟ بولی بھیا اونٹوں کو بیگار میں پکڑا جا رہا ہے۔ کسی کا کیا بگڑے گا جو کوئی یہ کہہ دے کہ یہ بھی اونٹ کا بچہ ہے۔ اور میں بھی اونٹوں کے ساتھ دھر لی جاؤں۔

غرض میری خواہش تھی، کہ احرار کی طرف سے سول نافرمانی کے خلاف اعلان نہ ہو۔ مگر انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ جن کے اغراض حکومت کے ساتھ وابستہ ہوں، وہ غریب جماعت کا ساتھ کب تک دے سکتے ہیں ؟ حکومت ہند کو ضرورت تھی۔ کہ ثابت کرے کہ نام نہاد سنجیدہ طبقہ احرار کے بجائے سرکار کے ساتھ ہے۔ کمزور طبیعت غریبوں پر اس اعلان کا اثر ضرور ہوا۔ مگر جلدی ہی احرار نے سنبھالا لیا۔ گورداسپور اور گجرات کی سرحدات کی طرف والنیٹروں نے نئی یلغار شروع کر دی۔ لکھنؤ کے مشہور احرار میاں منّے خان گورداسپور کے قافلہ سالار تھے۔ علاقہ ہندوؤں کا تھا۔ وہاں ہندو آبادی نے ان کو گھیر لیا۔ اور ڈوگروں نے سب کو جوتوں سے پیٹنا شروع کیا۔ جب والنیٹر بے ہوش ہو گئے تو ان کو انگریزی علاقے میں پھینک کر چلے گئے۔ منّے خان پھر اٹھ کر ریاست میں داخل ہوئے ساتھی ان کے ساتھ تھے، اس دفعہ زیادہ زخم آئے مرکزی دفتر نے اس سمت کی یلغار ترک

دی، دوسرے محاذوں پر گرفتاریاں دن دگنی رات چوگنی ہوتی گئیں۔

انگریزی حسن انتظام کی ایک دنیا قائل ہے۔ اور سچ بھی یہ ہے کہ انگریز قوم اس زمانے میں بھی جرمنی سے دوسرے درجے پر خوش سلیقہ ہے۔ مگر احرار کی یلغار نے اسے بھی حواس باختہ کر دیا۔ پنجاب کی جیلوں میں گنتی چار گنا ہو گئی۔ کمبل کپڑے نہ ہونے سے قید خانے محتاج خانے نظر آنے لگے۔ احرار قیدیوں کی حالت سڑک کے فقیروں کی سی ہو گئی جن کے جسم کے کپڑے غلیظ اور تار تار تھے، یہ تو جیلوں کے اندر کی صورت تھی، باہر برابر جوش ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ حکام جیل یہاں تک مجبور ہو گئے کہ نووارد قیدیوں کے گلے میں تختیاں لٹکا کر احرار کے دفتروں میں چھوڑ جاتے تھے، کہ انہیں صبح لے جائیں گے۔ ریل گاڑی سے بعض قیدی اترتے جاتے تھے۔ تعداد پوری کرنے کے لیے الوداع کہنے آئے اور والنٹیروں کو پولیس منت سماجت کر کے قیدی بنا کر لے جاتی تھی۔ کئی ایک کو دھکے دے کر جیلوں سے باہر نکال دیا گیا کہ اندر کا انتظام تباہ نہ ہو۔ میری اس تحریر اور انتظامی افراتفری کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو گا۔ کہ سینکڑوں رضاکار موت کے منہ سے بچے۔ تاہم اکیس نوجوان نمونیہ سے جیلوں میں وفات پا گئے۔ کیونکہ سردی سے بچنے کا مناسب انتظام نہ تھا قلم قوم مسلم کے جوش کا کماحقہ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ صرف پنجاب سے ہمارے اندازے کے مطابق ۴۵ ہزار نوجوان گرفتار ہوئے۔ ۵ ہزار باہر کے صوبوں سے بھی شریک حال ہو کر جیل گئے۔ (تاریخ احرار)

گلینسی کمیشن

آخر اس طویل اور صبر آزما جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ مہاراجہ نے آئینی اصلاحات کے لیے ایک باقاعدہ کمیشن مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کمیشن کی جو مقتضیات تھیں، ان کو گو جیل میں بند احرار قائدین نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو بُری بھلی آئینی اصلاحات اس خطے کو ملیں، اس میں اگر ایک طرف

کشمیر کے اندر نوجوانوں کی جدوجہد کا حصہ تھا۔ تو دوسری طرف احرار کا بھی اس سیاسی شعور کی نشوونما میں وافر حصہ تھا۔ اور یہ اسی جدوجہد کا ثمر تھا۔ کہ برصغیر کی ریاستوں میں جو عوامی تحریکیں منظم ہوئیں۔ ان میں اگر سب سے زیادہ جاندار عوامی تحریک کہیں منظم ہوئی تو وہ یہی کشمیر کی ریاست تھی، اور آج بھی کشمیر کے اندر جو جہاد ہو رہا ہے۔ اس کے ڈانڈے ۱۹۲۷ء میں شروع ہونے والی حقوق طلبی کی تحریک سے ہی جا ملتے ہیں۔

یہ گلینسی کمیشن مہاراجہ کشمیر کی طرف سے ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو قائم کیا گیا۔ اور اس نے چار ماہ کام کرنے کے بعد ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء کو اپنی سفارشات مہاراجہ کو پیش کر دیں۔

"تینوں غیر سرکاری ارکان نے رپورٹ کے ساتھ اپنے اختلافی نوٹ شائع کیے، ایک پریم ناتھ بزاز کی طرف سے تھا۔ دوسرا خواجہ غلام احمد عشائی اور چودھری غلام عباس کی طرف سے مشترکہ تھا۔ اور تیسرا صرف چودھری غلام عباس کی طرف سے جو انہیں ایک ہمدردِ کشمیر نے تیار کر کے دیا تھا۔

مہاراجہ کے احکام

اس رپورٹ میں مہاراجہ نے ۱۰ اپریل ۱۹۳۲ء کو احکام جاری کیے۔ اس وقت مسٹر ای۔ جے۔ ڈی کالون وزیر اعظم مقرر ہو چکے تھے۔ مہاراجہ نے کمیشن کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے۔ ان پر حتی الامکان جلد سے جلد عمل کرنے کی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت کر دی۔ اس طرح آئینی جدوجہد کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوتے۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی مخلصانہ مساعی کے نتیجہ میں اہالیان ریاست کو جو جو حقوق ملے۔ انکا مختصر ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ نعمت بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی تھی۔

مذہبی آزادی

مذہبی مشکلات کو دور کرنے کے لیے جو احکام صادر کیے گئے۔ ان میں اذان سے روکنا اور اس طرح مذہب تبدیل کرنے یا تبدیلی مذہب کا اظہار کرنے پر لوگوں کو خوفزدہ

کرنے کو، جرم قرار دیا گیا تھا۔ اور ایسے مجرموں کے لیے سخت سزائیں دینے اور ان کی گوشمالی کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ توہین مذہب کرنے والوں کے متعلق یہ حکم دیا گیا۔ کہ ہائیکورٹ اپنی ماتحت عدالتوں کو یہ ہدایات جاری کرے کہ ان تمام مقدمات میں سے جن میں توہین مذہب کے ارتکاب کا ثبوت مہیا ہو جائے۔ مجرمین کو ایسی سزائیں دی جائیں جن سے مجرمین کو یقین ہو جائے کہ انہوں نے کس قدر سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

مقدس مقامات

مقدس مقامات کی واپسی کے متعلق کچھ احکام پہلے مہاراجہ کی طرف سے جاری ہو چکے تھے۔ بقیہ کے متعلق کمیشن نے جو سفارشات کی تھیں۔ ان کے متعلق مہاراجہ نے حکم دیا۔ کہ ان کی پوری پوری تعمیل کی جائے۔ زیارت مدنی صاحب۔ میدان عید گاہ (سری نگر) خانقاہ شاہ درہ (جموں)، خانقاہ صوفی شاہ (جموں) وغیرہ کا انتظام مسلمانوں کے سپرد کیے جانے کے احکام جاری کیے گئے۔ مسجد شاہ ہمدان اور مندر مہاکالی کے متعلق بھی احکام دیئے اور یہ بھی قرار دیا گیا۔ کہ جن جائدادوں کی حق داروں کو واپسی ہو گی۔ اس کے لیے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔

یہ بھی ہدایت دی گئی کہ مسجدیں، دھرمسالے اور گرجا وغیرہ بنانے کے لیے درخواست آئے تو اس پر بہت ہمدردی سے غور کیا جائے گا۔

تعلیم کی ترقی

تعلیم کے متعلق کمیشن کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے مہاراجہ نے ابتدائی تعلیم کی توسیع اور عربی کے معلموں کی تعداد بڑھانے اور صنعتی تعلیم کے اجرا کے متعلق احکام دیئے۔ اور مڈل اور ہائی سکولوں میں اضافہ کرنے کی ہدایت کی۔ اس طرح یہ بھی حکم دیا کہ کالجوں میں سائنس کی جماعتوں میں داخلہ کے وقت جانبداری سے کام نہ لیا جائے۔ اور تمام اقوام کے جائز تحفظ کا انتظام کیا جائے۔ نیز حکم دیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ مسلمان اساتذہ اور انسپکٹر اور ایک خاص مسلم انسپکٹر مقرر کیا جائے۔ جو صوبائی انسپکٹروں سے علیحدہ اپنے فرائض سرانجام

دے۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے جد وجہد کرے۔

ملازمتیں

ملازمین کے متعلق مہاراجہ نے کمیشن کی سفارش کے مطابق معیار تعلیم کم کرنے اور ہر نئی آسامی کے خالی ہونے پر بذریعہ اعلان درخواستیں طلب کر کے اسے پُر کرنے اور مختلف اقوام کی آبادی کے تناسب کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا۔ اور یہ بھی حکم دیا۔ کہ کمیشن کی سفارش کے مطابق ہر سال ایک نقشہ شائع ہوا کرے۔ جس میں یہ بتایا جایا کرے کہ مختلف ادارہ جات میں مختلف اقوام کے ملازمین کی تعداد کیا ہے؟

مالیہ اراضی

مالیہ اراضی کے متعلق یہ احکام جاری کیے کہ مالکانہ کی وصولی بند کر دی جائے۔ نذرانہ کی رقم کے متعلق فوراً غور ہو، کہ اس میں کیا تبدیلی ضروری ہے۔ اس طرح جو زمینیں ریاست کی ملکیت میں ہیں، لیکن قبضہ کے حقوق عوام کو حاصل ہیں۔ ان سب کے مالکانہ حقوق قابض لوگوں کو دے دیئے جائیں۔ کاہچرائی کا ٹیکس سات تحصیلوں، یعنی، جموں، سانبہ، اکھنور، کٹھوعہ، جسمیر گڑھ، میرپور اور بھمبر میں منسوخ کر دیا۔ اور دیگر علاقوں کے متعلق وزیر مال سے رپورٹ طلب کی گئی۔ اسی طرح دھاروں کا ٹیکس بھی معاف کر دیا گیا۔ قصاب جو جانور حدود میونسپل کمیٹی میں ذبح کرنے کے لیے لاتے تھے۔ ان سے کاہچرائی کا محصول لیا جاتا تھا۔ اسے بھی بند کر دیا۔ اخروٹ وغیرہ کے درختوں کو کاٹنے کے متعلق جو پابندیاں تھیں۔ ان کو دُور کر دیا گیا۔ کواپریٹو قرضہ جات کے نظام کو وسعت اور ترقی دینے کے متعلق احکام جاری ہوئے۔ ریاستی پریس ایکٹ جو بہت سخت اور ناقابل برداشت تھا۔ اسے جلد تبدیل کرنے اور برطانوی ہند کے قانون مطابع کے مطابق کر دینے کا بھی مہاراجہ نے حکم دیا۔

ان احکام کے علاوہ (جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے) مہاراجہ نے کئی دیگر امور کے متعلق بھی احکام دیئے۔ مثلاً رشوت ستانی، کار سرکار، جنگلات اور رکھیں، کسٹم، مذہبی فریضہ کی

بجا آوری۔ جانوروں کے ذبح کرنے پر ٹیکس کی معافی، وغیرہ وغیرہ ان سب امور کے متعلق احکام جاری کیے۔

کیور تھلہ تحریک اور مجلس احرار

کشمیر کی تحریک میں کون جیتا کون ہارا۔ تحریکوں کی کامیابی و ناکامی کا تعین کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ جس کو عام طور پر ناکامی سمجھا جاتا ہوتا ہے۔ وہی ناکامی اکثر و بیشتر نئی کامیابیوں و کامرانیوں کی وجہ بن جاتی ہے اور بہت دفعہ ظاہرہ کامیابی بھی جماعتوں کے اثر و رسوخ اور مقبولیت عامہ پر ضرب کاری لگا جاتی ہے۔ کشمیر میں اس تحریک کے بہر حال بہت اہم نتائج مرتب ہوئے۔ اسی تحریک نے مسلم کانفرنس اور بعد میں نیشنل کانفرنس کے قیام کے لیے راہ ہموار کی۔ لیکن ہمیں تو اس تحریک کے پنجاب میں اثرات اور نتائج کا جائزہ لینا ہے۔ کیونکہ واقع یہ تھا کہ کشمیر کی تحریک کو قیادت بخشنے کی جدوجہد پنجاب کے مسلمانوں نے ہی کی۔ کشمیر کمیٹی ہو یا احرار، دونوں پنجابی مسلمانوں کا حصہ تھے، اس لیے جب کشمیر کمیٹی اور مجلس احرار کشمیر کی تحریک کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے سر توڑ جدوجہد کر رہے تھے اور اس میں ظاہر ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش بھی لازمی کرتے ہونگے لیکن جب تحریک ختم ہوئی۔ تو پھر پوری توجہ دونوں گروہوں کی ایک دوسرے کی طرف ہو گئی۔ لیکن حقیقت کا یہ صرف ایک رُخ ہے دوسرا رُخ یہ ہے کہ مجلس احرار نے اس پوری تحریک میں جہاں کشمیر کے مہاراجہ اور اس کے دربار کو اپنے مدمقابل پایا تو ساتھ ہی دوسری طرف کشمیر کمیٹی کے قائدین کو بھی ایک دوسرے انداز میں حملہ آور ہوتے دیکھا اور یہ قائدین کون تھے۔ سب کے سب مرزائی، ان مرزائیوں نے کشمیر کمیٹی کے پردے میں، کشمیر میں اچھے خاصے اپنے پاؤں جما لیے چنانچہ یہ اسی زمانے کی "جدوجہد" کا ثمر ہے کہ آج بھی کشمیر میں اس فرقے کے اچھے خاصے اثرات پائے جاتے ہیں۔ مجلس احرار جو مسلمانوں کے نچلے درمیانہ طبقے کی جماعت تھی، اسے ویسے بھی امراء سے پرخاش تھی، جب انہوں نے امراء کے ایک طبقے کو مرزائیوں کی قیادت تسلیم کرتے دیکھا تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ کہ ہو نہ ہو یہ گٹھ جوڑ اور مرزائیوں

کو آگے بڑھانے کا کام برطانوی شہنشاہیت کی ایک نئی چال ہے۔ اور اس کا مقصد مجلس احرار جیسی جماعت کو زک پہنچانا ہے۔ اور بات کسی حد تک صحیح بھی تھی کیونکہ کشمیر کی تحریک نے ریاستی عوام کی زبوں حالی کو ایک طرف اگر کل ہند مسئلہ بنا دیا تو دوسری طرف ریاستی عوام کو بھی ایک گونہ ہمت وجرأت دلائی اور ان کے مایوس اور پژمردہ چہروں پر ولولوں اور نئے جوش کی لکیریں ابھرنے لگیں، مگر پنجاب کے اندر کی ریاستوں کی اکثریت میں مسلمان سب سے زیادہ مظلوم اور پسے ہوتے تھے، اور مہاراجے ہندو سکھ تھے، اور ہندو سکھ آبادی کا اوپر کا حصہ بہت حد تک مہاراجوں اور ان کے درباروں کا حامی ومددگار تھا۔ چنانچہ جس ریاست میں بھی مسلمانوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اس کو فرقہ واریت کا نام دے دیا گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کشمیر تحریک نے ریاستوں میں بسنے والے عوام کو بالخصوص مسلمان عوام کو ایک نیا عزم بخشا اس طرح سے تحریک کے شعلے ابھی پوری طرح بجھنے بھی نہ پائے تھے، کہ مجلس احرار کو کئی دوسرے محاذوں پر لڑنا پڑ گیا۔ کشمیر کی تحریک کے دوران ہی کپورتھلہ کی ریاست میں ہلچل پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ اس ہلچل کا کشمیر کی تحریک سے براہِ راست واسطہ تھا کپورتھلہ میں بھگوال کا مقام مسلم راجپوتوں کا مرکز تھا۔ وہاں کشمیری عوام کے حق میں جلسہ منعقد ہوا تا کہ کشمیر کی تحریک کے لیے چندہ اکٹھا کیا جا سکے چنانچہ اس جلسے نے علاقے کے مسلمانوں کو بھی اپنی اصلاح کے لیے سوچنے پر مجبور کیا۔ یہاں سیاسی تحریک ناپید تھی۔ لیکن اصل مسئلہ تو مسلمانوں کی اقتصادی محرومیاں تھیں، کچھ زمیندار اور متمول قسم کے لوگوں نے ان اقتصادی محرومیوں کے متعلق یہ سوچا کہ ہندو دکانداروں کا بائیکاٹ کیا جاتے اس طرح سے مسلمانوں کو تجارت کی طرف راغب کیا جا سکے گا۔ اب یہ براہِ راست اقتصادی لڑائی تھی، لیکن پسماندہ ممالک میں اقتصادی لڑائیوں کو مذہب اور فرقوں کی آڑ میں لڑنا پڑتا ہے اور انہی ہتھیاروں سے ظالم طبقہ عوام کی اس جدوجہد کو شکست دیتا ہے چنانچہ کپورتھلہ میں مسلمانوں کی تحریک ابھری تو ہندو اخبارات نے شور مچا دیا۔ جب یہ شور اٹھا۔ تو مجلس احرار دسوہہ ضلع ہوشیار پور کے جنرل سیکرٹری نے پوری صورت حال کے متعلق ایک اخباری بیان دیا۔ یہ بیان اکتوبر ۱۹۳۲ء میں روزنامہ زمیندار میں شائع ہوا۔ اس میں بتایا گیا

"کئی ماہ سے تحصیل بھولتھ ریاست کپورتھلہ کے متعلق ہندو اخبارات کے پراپیگنڈے سے بےشمار غلط فہمیاں دوآبہ لبست جالندھر میں خصوصاً اور پنجاب کی اخباری دنیا میں عموماً پیدا ہوگئی ہیں۔ بحیثیت ایک خادم ملت مجھے اس امر کے احساس نے صحیح حالات کی تحقیق پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو میں نے اسی امر کی جستجو میں تحصیل ہٰذا کے شمالی حصہ کے دس دیہات کا دورہ کیا جس کے نتائج امید ہے کہ ان غلط فہمیوں کے ازالے کا باعث ہوں گے۔

گزشتہ رمضان مبارک میں جب سرفروشان احرار ریاست کشمیر کے عاقبت نااندیش حکام کے انسانیت سوز مظالم کے خلاف مصروف جہاد تھے۔ اس وقت بگوال کے حساس مسلمانوں کو بھی اپنے ان مظلوم بھائیوں کی اخلاقی امداد کے فریضے کی ادائیگی کی طرف رغبت ہوئی تو "میرپور ڈے" کے عظیم الشان جلسے میں بمقام بگوال قرار پایا کہ عیدالفطر کے موقعے پر چندہ فراہم کر کے مظلومین کشمیر کی بذریعہ مجلس احرار امداد کی جائے۔ ساتھ ہی مسلمانان علاقہ کی اخلاقی و اقتصادی اصلاح نماز روزہ کی پابندی کے لیے تبلیغ کا انتظام بھی کیا گیا۔ ہندو ساہوکاروں کی قلیل آبادی کو یہ امر شاق گزرا اس پر وہ چراغ پا ہوتے اور شور محشر برپا کر دیا۔ رضاکاران اسلام بگوال کی جماعت نے پہلا قدم یہ اٹھایا تھا کہ مسلمان عورتیں خرید و فروخت کے لیے بازار میں نہ آئیں۔ کیونکہ یہ اخلاقی و اقتصادی اصلاح کے لیے ضروری تھا جب عورتوں کو یہ کہنا شروع کیا کہ خرید و فروخت مردوں کے ذریعے ہو اور اگر کسی بہن کو دقت محسوس ہو تو ہم خود اس کی ضرورت کی اشیا خرید کر لا دیں گے۔ اسے ہندو ساہوکاروں اور دکانداروں نے پکٹنگ کا جامہ پہنا کر حکام ریاست سے شکایتیں شروع کر دیں۔

حالانکہ رضاکار نہ بازار میں جاتے تھے اور نہ دکانوں پر خرید و فروخت میں رکاوٹ پیدا کرتے تھے۔ بلکہ گھروں پر جا کر سمجھاتے بجھاتے تھے۔ اور ایسی عورتوں کا سودا خود خرید کر ان کے گھر پہنچاتے تھے جن کے مرد موجود نہ ہوں، یہ ہے حقیقت اس پکٹنگ کی جس کے متعلق آج تک بدستور شکایت کی جا رہی ہے اور افسران علاقہ ہندو دکانداروں کی شکایات پر بلا تحقیق مسلمانوں کو دھمکاتے ہیں۔

رضاکار صبح اور شام کے وقت مساجد میں نماز ادا کرنے کے لیے مسلمانوں کے گھروں پر کلمہ طیبہ کا ذکر کرتے ہوئے جاتے اور غافل مسلمانوں کو مسجد میں آ کر نماز ادا کرنے کے لیے توجہ دلاتے تھے۔ بگووال کے ساہوکاروں نے اس پر بھی بے شمار اعتراضات کیے یہاں تک کہ نعرۂ تکبیر کی قطعی بندش کے لیے حکام ریاست سے امداد طلب کرتے تھے۔ عامۃ المسلمین ان اعتراضات پر اکثر برافروختہ ہوتے۔ مگر ذمہ دار اصحاب کی دانشمندانہ تدابیر انہیں جادۂ عمل سے باہر قدم نہ نکالنے دیتیں۔ اسی وجہ سے کام صلاحیت سے چلتا رہا۔ اسی اثنا میں مسلمانوں کے لیے ہندو دکانداروں نے دو روزہ ہڑتال کر دی، ہڑتال کے پہلے دن ہی ایک مسلمان بقضائے الٰہی فوت ہو گیا۔ اس کا وارث کفن کا کپڑا خریدنے کے لیے دکانوں پر آیا تو جواب صاف پایا۔ اس غریب کے کفن کا کپڑا پیر سید جعفر حسین صاحب نے مہیا کیا۔ اسی طرح دو روز تک مسلمانوں کے لیے روزانہ ضرورت کی اشیاء کی فروخت بند رہی، اس پر خاص بگووال اور بھولتھ دیہات سے اپنی دکانوں کے اجراء کا تقاضا شروع ہوا۔ اور بہت جلد بگووال اور اس کے نواح میں مسلمانوں کی دکانیں کھل گئیں۔ جس نے ہندو سرمایہ داروں کو اس علاقہ کے غریب مزدوروں اور کاشتکاروں کے اور بھی درپئے آزار کر دیا۔ انہوں نے یہ متفقہ فیصلہ کر لیا۔ کہ ان لوگوں کو آئندہ قرض نہ دیا جائے اور سابقہ قرضوں کا فی الفور تقاضا کیا جائے۔ چنانچہ ساہوکاروں کی طرف سے اس فیصلہ پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اور نہایت سختی کے ساتھ مقروضوں سے وصولی قرضہ کا مطالبہ شروع ہونے لگا۔ اس پر کاشتکاروں کو اس امر کا احساس پیدا ہوا کہ پہلے کی طرح اب بلا رسید لین دین نہ کریں گے۔ چنانچہ ساہوکاروں کی اراضی کی پیداوار کی بٹائی کی کاشتکاروں نے رسیدیں طلب کیں جو اس وقت تک حاصل نہ کر سکے۔ جب تک تحصیلدار صاحب علاقہ نے ساہوکاروں کو رسیدات دینے کے لیے مجبور نہ کیا۔ اب زر مالیہ ادا کرنے کا وقت آیا تو زمینداروں اور ساہوکاروں نے مالیہ بعد دقت وقت پر ادا کیا اور ساہوکاروں کو قرضہ جات کے سود واپس نہ کر سکے۔ کیونکہ یہ امر یقینی تھا کہ اگر پیداوار فصل ربیع ساہوکاروں کو دے دیتے تو مالیہ کی ادائیگی ان کے لیے ناممکن ہو جاتی۔ ماہ جون کے آخیر میں تحصیل بھولتھ کے ذمہ دار اصحاب نے مطالبات کی ایک طویل

فہرست مہاراجہ بہادر کی خدمت میں پیش کی جن کی تائید ریاست کے ہر حصّے سے ہوئی۔ ان میں سے پانچ نہایت اہم ہیں، جن کے باعث آج تک کشمکش جاری ہے:

۱- آئندہ اصلاحات کے مطابق ہندوستان میں جو اختیارات صوبجاتی کونسلوں کو دیئے جائیں۔ انہی پر ریاست میں عملدر آمد ہو۔

۲- ایکٹ انتقال اراضی مروجہ پنجاب جلد از جلد ریاست میں نافذ ہو۔

۳- مزدوروں اور پیشہ وروں کی جائیداد غیر منقولہ (مکانات رہائشی وغیرہ) قرق ہونے سے مستثنیٰ قرار دی جاتے۔

۴- قرضوں کی اصلیت کی تحقیق کی جائے۔ کہ اصل زر میں کتنا سود شامل ہو چکا ہے۔ اور وہ چند سے جتنی رقم تجاوز کر چکی ہے، ناواجب قرار دی جاتے۔

۵- مالیہ ریاست میں مناسب و معقول مستقل تخفیف کی جائے۔

ان مطالبات نے کش مکش میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ جو ساہوکاروں، کاشت کاروں اور مزدوروں کے مابین بے اعتمادی کی آخری حد کا باعث ہوئے۔

اب ساہوکاروں کو اپنی اراضی کی کاشت مطلوب تھی، اور مقروض کاشت کار اور مزدوروں کو ایسے زر قرضہ کی رسیدیں درکار تھیں، جو وہ ساہوکاروں کو واپس کر چکے تھے۔ یہ وصولی کی رسیدیں دینے سے انکار کرتے تھے۔ اور وہ کاشت اراضی سے دست کش تھے۔ عوام کی ہمدردی اس غریب طبقہ سے فطرتی تقاضا تھا۔

تحصیل بھولتھ کے باشندگان کے باہمی تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لیے مہاراجہ بہادر کی طرف سے ایک ایسی کمیٹی کا تقرر ہوا۔ جس کا صدر علاقہ مجسٹریٹ تھا۔ جب اس کمیٹی کے روبرو یہ معاملہ پیش ہوا۔ تو صاحب صدر نے بعد استصواب وزیر اعظم حسابات کی جانچ پڑتال کے اعتراض پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ساہوکاروں کی اراضی کاشت کرانے کے لیے ممبران کمیٹی پر زور ڈالا اور وہ بھی اس وقت جب کہ زمینیں خشک ہو چکی تھیں۔ اور قابل کاشت نہ تھیں۔ اتحاد کمیٹی کے صدر نے نہ معلوم اس سوال کو بعد از وقت کیوں اٹھایا اور

جوں توں کر کے وقت کیوں ضائع کیا؟

عام لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اتحاد کمیٹی کا صدر اتحاد کا معاملہ تعویق میں نہ ڈال رکھتا تو پہلی نشست میں اس کے تصفیہ کی طرف راغب ہوتا، طرفہ یہ کہ ساہوکار اور زمیندار نمائندے وقتاً فوقتاً توجہ بھی دلاتے رہے۔ مگر صاحب صدر نے توجہ نہ کی۔

۱۴ اکتوبر کو وزیر اعظم صاحب ریاست نے ساہوکاروں اور کاشت کاروں کے نمائندوں کو اپنے در دولت پر طلب فرمایا۔ ساہوکاروں کی شکایات نہایت تحمل سے سنی گئیں اور کاشت کاروں کو جواب کی مہلت سے محروم رکھتے ہوتے ذیل کا حکم نافذ کر دیا گیا کہ جن دیہات میں جیتے بندی کے طریق کار پر کاشت اراضی سے انکار ہو گا۔ ایسی اراضی کا معاملہ ان کے دیہات کے باشندوں پر باچھ ہو کر وصول کیا جاتے گا۔ یہی حکم میں نے کئی دیہات میں قلمی لکھا ہوا دیواروں پر چسپاں دیکھا۔ اس خلاف قانون حکم کو دیکھ کر میری حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کسی کاشت کار کو کس ضابطہ و قانون کے ماتحت کسی زمین کی کاشت کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر وہ کاشت نہ کرے تو ادائیگی مالیہ اراضی کا کاشت کار کیسے ذمہ دار ہو سکتا ہے؟ وزیر اعظم صاحب کے انوکھے حکم سے تحصیل بھولتھ کے باشندوں میں بے چینی و بددلی کی ایک لہر پیدا ہو گئی ہے۔ حکام کا ایک ایسا متشددانہ رویہ امن عامہ میں ہمیشہ خلل کا باعث ہوا ہے۔ علاوہ ازیں پولیس کو غالباً ریاست میں غیر محدود اختیارات آجکل دے دیئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ شاخ تراشی کے جھگڑوں پر بھی پولیس افسر بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ اور غریب کاشت کاروں کو مرعوب و دہشت زدہ کرنے کے تمام وسائل عمل میں لا رہے ہیں۔

اس تحصیل کے کاشت کار و مزدور اس وقت زندگی کے نازک مراحل میں سے گزر رہے ہیں تحصیل کا شمالی علاقہ جو بالکل مسلمان کاشت کاروں کی آبادی ہے۔ سول و پولیس افسروں کی سختیوں کا تختہ مشق بنا ہوا ہے اور حکام ریاست نے ان کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہجرت کر جانے پر آمادہ ہیں۔ ایسے نازک وقت میں مہاراجہ صاحب

کو حکام کی من مانی کارروائیوں کا سدباب کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لینا چاہئیے کہ اس سے وفادار اور پُرامن رعایا کو مشتعل ہو کر مظاہروں کا موقع ہاتھ آئے اور ساتھ ہی زمینداروں کاشتکاروں اور پیشہ وروں کے جائز مطالبات کو تسلیم کرنے میں والئی کپورتھلہ کو تامل نہیں کرنا چاہیئے۔ مہاراجہ بہادر نے صورت حالات کی اصلاح کی طرف جلد توجہ نہ دی اور نااہل افسروں پر ہی تمام معاملہ کو چھوڑ رکھا تو نتائج ایسے مرتب ہونے کا امکان ہے جو ریاست اور باشندگان ریاست کے لیے نقصان عظیم کا باعث ہوں گے۔"

جنرل سیکرٹری مجلس احرار اسلام دسوہہ ضلع ہشیارپور

کپورتھلہ کے مسلمان کاشت کاروں کی اس تحریک کے بارے میں نہ تو زیادہ لکھا گیا اور نہ اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس تحریک کے خدوخال مجلس احرار کی طبقاتی پوزیشن اور اس کی طبقاتی جدوجہد کے انداز کو بہت حد تک متعین کر دیتے ہیں، اصل میں یہی ان کا بہت حد تک طبقاتی شعور تھا جو انہیں مسلمانوں کے اوپری طبقے اور برطانوی حکمرانوں میں سب سے زیادہ معتوب قرار دینے کا موجب ہوتا تھا۔ چنانچہ اس تحریک کے قائد چودھری عبدالعزیز خان تھے، جو خود بیگووال کے متمول زمیندار تھے۔ اور مجلس احرار کے نائب صدر تھے، انہوں نے اس زمانے میں مہاراجہ کے نام ایک عرضداشت مرتب کی، جو بعد میں "انصاف اور روٹی کی پکار" کے نام سے شائع بھی ہوئی، یہ عرضداشت ۱۹۳۲ء کے آخری دنوں میں مہاراجہ کپورتھلہ کو روانہ کی گئی، اس میں کہا گیا تھا:

"عقیدت و فرمانبرداری کے جذبات کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں کہ حضور والا کی خدمت میں مفصلہ ذیل چند سطور گزارش کروں۔ اور مجھے امید ہے کہ حضور والا مہربانی سے اس معاملہ پر غور فرماتے ہوئے از رہ نوازش اپنی غریب زمیندار رعایا کی حفاظت کی خاطر فوری احکام صادر فرمائیں گے ریاست ہذا میں قانون انتقال اراضیات پنجاب کے نفاذ و نیز تخفیف ابواب یعنی رقم ملبہ و بیگار کا مطالبہ دیرینہ ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس نے زمینداران کے درمیان

گزشتہ پندرہ سال کے عرصہ کے اندر طاقت حاصل کرنے کے بعد ایک عام تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔ زمینداران نے اپنی حالت کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد آج سے بہت عرصہ پہلے حضور والا کی خدمت میں اپنے مطالبات جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے پیش کیے تھے:

۱۔ یہ کہ محصول مالیات کا معیار اسی پیمانے کے مطابق ہونا چاہیئے جس کا عملدرآمد ملحقہ اضلاع برطانوی ہند میں ہے۔

۲۔ ابواب مالیات مثلاً بیگار ملبہ جو داخل خزانہ سرکار ہوتا ہے ترک کیا جا کر یکدم بند فرمایا جائے۔

۳۔ تحفظ حقوق زمینداران کے پیش نظر قانون انتقال اراضیات پنجاب کے اصول پر ریاست میں بھی قانون نافذ فرمایا جائے

۴۔ اسمبلی ریاست آئندہ صحیح طور پر ایک نمائندہ مجلس ہونا چاہیئے جسے وضع قوانین اور اسی قسم کے دوسرے اختیارات حاصل ہوں۔ جن سے برطانوی ہندوستان کی ایسی مجالس بہرہ اندوز ہو کر استفادہ کر رہی ہیں۔

۵۔ بلا ضرورت اسامیوں بلکہ محکمہ جات کو تخفیف میں لایا جا کر بچت شدہ رقم دیہاتی اصلاح پر صرف کی جائے

چونکہ قانون انتقال اراضیات کا مسئلہ زمینداروں کے نزدیک نہایت اہم تھا۔ اس واسطے اس سوال کو سب سے پہلے اٹھایا گیا۔ ابتداءً منظور فرمایا گیا کہ طرفین یعنی زمینداران و ساہوکاران اپنے اپنے مقدمات جداگانہ طور پر سری حضور ٹکا راجہ صاحب و جناب وزیر اعظم صاحب کے روبرو بیک وقت پیش کریں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ریاست نے ایک بل مرتب کر کے عوام کی رائے حاصل کرنے کے لیے شائع کر دیا۔ ساہوکاران نے شروع ہی سے اس کے متعلق مباحثہ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ بلکہ اس سب کمیٹی کے جلسوں کا بھی مقاطعہ کیا۔ جو اس مسودہ قانون کی تفصیلات پر غور کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی، مگر زمینداروں نے

حکومت کے ساتھ یہاں تک تعاون کیا کہ مسوّدہ مذکور کی بعض دفعات کے خلاف اپنے اعتراضات پیش کر دیئے۔ امید کی جاتی تھی کہ نہایت قلیل عرصہ کے اندر زمینداران ریاست کی حفاظت کے لیے کوئی قانون ضرور نافذ ہو جاتے گا۔ حضور والا کی یورپ کو روانگی کا وقت قریب آ گیا تھا۔ چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں زمینداران ریاست نے بہ سرپرستی مرکزی زمیندارہ لیگ کپورتھلہ میں بر محل اکٹھے ہو کر ۱۶ پھاگن ۱۹۸۹ء بکرمی حضور والا کی خدمت میں اپنی مشکلات کے رفع داد کے لیے گزارش کی، حضور والا نے ان کے وفد کو حاضر ہونے کا شرف بخشا اور ان کی معروضات سماعت فرمانے کے بعد بڑی مہربانی سے اس مجمع کثیر کے درمیان تشریف لے جا کر ایک اعلان عام فرمایا۔ جس کا منشا یہ تھا۔ کہ حکومت ریاست کی نظر میں قانون انتقال اراضیات پنجاب کی قسم کا کوئی قانون ریاست ہذا میں نافذ کرنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے چنانچہ یہ اعلان بصورت گزٹ اشاعت پذیر ہو گیا۔ جس سے حالات ایک حد تک سلجھ گئے۔ مگر چند ماہ بعد یہ اعلان منسوخ کیا جا کر اس کی جگہ ۲۸ ہاڑ ۱۹۹۰ء بکرمی کو ایک یادداشت جاری ہوئی، یہ یادداشت نہ تو حضور والا کے اعلان کی حامل تھی، اور نہ زمینداروں کے مطالبات سے مطابقت رکھتی تھی، گو زمیندار اس کے اجراء سے کمال مایوس ہوتے۔ لیکن اصولاً بامن رہتے ہوتے حضور کی یورپ سے تشریف آوری پر مزید پُرامن تحریک کا فیصلہ کیا۔

بتاریخ ۵ مگھر ۱۹۹۰ء بکرمی، کو مرکزی زمیندارہ لیگ کے ایک وفد نے جناب وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر باضابطہ عرض کی، کہ یادداشت مجریہ ۲۸ ہاڑ ۱۹۹۰ء بکرمی غریب زمینداروں کے حق میں ہونے کی بجائے زیادہ تر ساہوکاران کے مطالبات کی حفاظت کرتی ہے۔ اور اس یادداشت جدید میں حسب ذیل ترامیم و ایزادی تجویز کی:

ا۔ زمینداروں کی اراضیات کا دوامی انتقال اجرائے ڈگریات میں قطعاً ممنوع قرار دیا جائے

ب۔ اجرائے ڈگریات میں جو زمین ڈگری داروں کو منتقل کی جائے وہ مقررہ میعاد کے لیے ہو جو کسی حالت میں بھی بیس سال سے زائد نہ ہو، اور اس میعاد کے ختم ہونے کے بعد اراضی منتقلہ مالک اراضی کے نام ہر قسم کے بار سے آزاد دوبارہ منتقل ہو جائے۔

ج - زمینداروں کو اپنے درمیان اراضیات کے انتقال کی آزادی حاصل ہو۔

د - تمام ایسی بے ضابطہ کارروائیاں جو سابقہ قوانین مرتبہ ۸ ماگھ ۱۹۳۳ء بکرمی کے خلاف عمل میں آئی ہیں، کالعدم تصور فرمائی جا کر تکمیل قانون کی غرض و غایت کے لیے منسوخ و مسترد فرمائی جائیں۔ دوبارہ ۲۱ مگھر ۱۹۹۰ء بکرمی کو مرکزی زمیندارہ لیگ کا دوسرا وفد جناب وزیر اعظم صاحب کے پیش ہوا۔ اور سابقہ معروضات کا اعادہ کیا۔ صاحب موصوف نے زمینداروں کو ہدایت کی کہ انہیں صبر و تحمل کے ساتھ ہنگامہ آرائی کے بغیر اس وقت تک انتظار کرنا چاہیئے جب تک کہ ہدایت مجریہ ۲۸ ہاڑ ۱۹۹۰ء بکرمی کے عملی نتائج سامنے نہ آ جائیں۔ زمیندار اس جواب سے اس قدر دل برداشتہ ہو گئے ہیں، کہ وہ اپنی حالت کو خوف سے دیکھ رہے ہیں، کہ ان کے لیے بحالات موجودہ زیادہ عرصہ تک انتظار کرنا محال ہے۔

زمینداروں کی خصوصاً چھوٹے زمینداروں کی حالت زار اقتصادی نکتہ خیال سے بڑی قابل رحم ہے۔ زمینداروں کو برطانوی اضلاع کی مروجہ شرح مالیات سے بڑھ کر مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے اور اس رقم میں مزید اضافہ جریب کے چھوٹے ہونے کے باعث ہو جاتا ہے۔ مزید برآں ابواب کا زائد بار و نیز بیگار ناقابل برداشت ہے۔

حضور والا! یہ امر واضح ہے کہ زمینداران ان گرانبار ذمہ داریوں اور ادائیگی مالیہ ریاست کے بوجھ تلے بے طرح دب گئے ہیں، یہ زمینداران کی بدقسمتی ہے کہ ان کے مقدمہ کی طرف حضور والا کی نظر عنایت منعطف نہیں ہو سکتی۔ تاکہ یہ معاملہ جو ان کے لیے حد سے زیادہ اہم اور دقیع ہے حل ہو سکتا، اگرچہ ہم جانتے ہیں، کہ حضور والا ان تمام حالات سے کما حقہ' واقف ہیں، لیکن زمینداروں کے مصائب اور ان کے ساتھ حضور والا کی دوسری غریب رعایا کی تکلیفات اس لیے بھی حد سے زیادہ تجاوز کر گئی ہیں، کہ ریاست کی عدالتوں کا رویہ نہایت غیر منصفانہ ہے۔ غریبوں کو خواہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان عدالتوں سے انصاف کی قطعاً توقع نہیں، یہ عدالتیں جو حضور والا نے انصاف کے لیے قائم کی ہوئی ہیں ان عدالتوں

کی تمام تر ہمدردی سرمایہ داروں کے لیے وقف ہے۔ برعکس اس کے غریب زمینداران و کاشت کار کے حقوق عدالتی کارروائیوں میں نہایت بیدردی سے پامال کیے جاتے ہیں۔

ایک بیدار مغز حکمران ہوتے ہوئے حضور والا سے قرار واقعی توقع تھی کہ چھوٹے زمینداران کاشت کاران اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کے سامان مہیا کرنے کی طرف کامل توجہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ مالداروں پر نوازشات کی بارش ہو رہی ہے اور غریب کاشت کاران و مزدوران کی محنتوں کا ثمرہ بڑی بے رحمی سے محض سرمایہ داران اور بعض امتیازی خاندانوں کی پرورش پر صرف کیا جاتا ہے۔ حضور والا! میں بلا کم و کاست یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا مقصد وحید چھوٹے چھوٹے زمینداران و مزدور پیشہ کسانوں کی سیاسی اور مالی حالت کی اصلاح وارتقاع ہے۔ ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے ہم تہ دل سے خواہاں ہیں کہ غریب زمینداران کے مقدمہ کو جامع طور پر گزارش کریں۔ نیز ہم اس امر کے متمنی ہیں کہ حضور کی توجہ زمینداران کی حالت زار کی طرف مبذول کرائیں۔ میں بلا تکلف یہ ظاہر کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ بڑی کوشش سے وہ ایسا رویہ اختیار کرنے سے باز رہے ہیں، جس کا ظہور ہرگز مستحسن تصور نہیں ہوگا۔ تاوقتیکہ ان کی شکایات کو رفع کرنے اور ان کے پورا کرنے کے لیے فوری اقدام اور موثر انتظام نہ کیا گیا۔ میری نظر میں حالات پر قابو پانا حد درجہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا میں التجا کرتا ہوں۔ کہ مذکرہ صدر معاملات پر کامل غور فرمایا جائے"

چودھری عبدالعزیز آنریری سیکرٹری سنٹرل زمیندارہ لیگ کپورتھلہ سٹیٹ

کپورتھلہ میں یہ لاوا پک رہا تھا جس میں ترتیب پا رہی تھیں، کہ مجلس احرار کے ہزاروں رضاکار اور قائدین جو کشمیر کی تحریک کے سلسلے میں جیلوں میں بند تھے وہ رہا ہونے شروع ہو گئے۔ اب ان کو ایک نیا محاذ مل گیا۔ اور بقول چودھری افضل حق "طبقاتی جنگ احرار کے مزاج کے عین مطابق ہے" مجلس احرار نے اس طبقاتی جنگ میں بھرپور حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کے بارے میں خود چودھری افضل حق لکھتے ہیں:

"غرض ہم نے آتے ہی اور میدان تیار پایا۔ ہر چند آدمی تھکا ہوا گرا زمیں آجاتے

کوفت دور ہو جاتی ہے قیدِ فرنگ کی کوفت ضرور تھی، مگر کپور تھلہ کا میدان گلزار تھا۔ وہاں موج ہوا ہمارے مزاجوں کے مطابق تھی، کیونکہ وہاں اقتصادی مشکلات کے حل کے لیے پکار تھی، یہی پکار احرار کو سرمست کرتی ہے۔ مولانا مظہر علی کا نام ریاست کشمیر کے سلسلے میں نمایاں ہو چکا تھا کپور تھلہ کے ریاستی باشندوں کے بلاوے پر مولانا مظہر علی احرار کانفرنس منعقدہ کپور تھلہ کے صدر قرار پائے تاکہ کام اور عوام پر اس اقتصادی تحریک کی گہرائی اور قوت کا اثر ہو اور معلوم ہو کہ بدون انصاف کیے مقامی طور پر دبانے سے یہ تحریک نہ دبے گی۔ جس تحصیل میں تحریک کی ابتدا ہوئی اور جہاں جہاں یہ پھیلی وہ زیادہ تر اسلامی آبادی تھی، سکھ زمیندار ضرور شامل ہو جاتے مگر پر بندھک کمیٹی، جس کا سکھوں پر اثر ہے وہ اس ریاست کو غلط طور پر، سکھ ریاست سمجھ کر رئیس کے خلاف یا رؤسا کے خلاف کچھ کرنا نہ چاہتی تھی۔ دنیا جانتی ہے کہ بنانا مشکل اور بگاڑنا آسان ہے بےعملی اور سستی پھولوں کی نرم نازک سیج ہے اس میں پڑ کر کوئی مشکل سے اٹھتا ہے۔ زمینداروں کا بےعملی کو خیرباد کہنا عام طور پر دشوار ہے۔ اگر انہیں یہ بھی سمجھایا جائے کہ عمل تمہارے مفاد کے خلاف ہے تو یہ آواز اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ خالص زمیندارہ تحریک، سکھ کاشت کاروں کی پوری امداد سے محروم رہی، اس میں شبہ نہیں کہ خود ریاست نے بھی مسلمان سکھ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی، کیوں نہ کرتی کہ یہ بات ریاست کے مفاد کے عین مطابق تھی، الغرض یہ تحریک مسلمان زمینداروں کی تحریک بن کر رہ گئی۔"

(تاریخ احرار صہ ۵۵-۵۶)

پسماندہ ممالک میں شہنشاہیت، ہمیشہ طبقاتی جنگ کو مذہبی مناقشوں اور جھگڑوں میں الجھا کر عوام کو دوسری راہ پر ڈال دیتی ہے۔ اور بجائے مظلوم اور ظالم کی جنگ تیز ہونے کے، مظلوم آپس میں ہی لڑنا مرنا شروع کر دیتے ہیں، چنانچہ یہی طریق کار ریاستی حکام نے کپور تھلہ میں استعمال کیا۔ جب تحریک ابھر رہی تھی، اور کسان اپنی اقتصادی تلخیوں کے

راو کے لیے میدان میں آ رہے تھے۔ تو خیال یہ تھا کہ کہیں مسلمان زمینداروں کے ساتھ ہندو اور سکھ زمیندار بھی متحرک نہ ہونے لگیں، چنانچہ اس "خطرے" کو بھانپ کر ایک ڈرامہ کھیلا گیا۔

"اگرچہ اقتصادی تحریک کا مرکز تحصیل بھولتھ تھا۔ مگر سلطان پور لودھی کے بُرے دن جو آئے تو وہاں "تعزیہ" اور "بڑ" کا شاخسانہ کھڑا ہو گیا۔ "تعزیہ" اور "بڑ" کے درختوں کو ہندوستان کی عورتوں کو بیوہ کرنے اور بچوں کو یتیم بنانے میں بڑا دخل ہے۔ جہاں اس پوتر درخت کی شاخ "تعزیہ شریف" سے چھوئی بس قیامت ہو گئی۔ "یا علی" اور "جے جے مہابیر" کے نعرے بلند ہونے لگے۔ یوں معلوم ہونے لگتا ہے گویا غزنوی نے سومنات پر حملہ کر دیا ہے۔ اور کفر و اسلام باہم گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ آن کی آن میں لاشے خاک میں تڑپتے نظر آتے ہیں، خون کے نالے بہ نکلتے ہیں۔ وحشت کے ایسے نظارے قومیتِ متحدہ کے دعوے پر یے لاگ تبصرہ بن جاتے ہیں۔ پوری ایک صدی سے لیا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں سول وار جاری ہے۔ جس کے ختم ہونے کی ابھی کوئی امید نہیں، غرض مند ہوا دیتے ہیں سلگتی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔"

"ہاں سلطان پور کے مسلمانوں کا ستارہ گردش میں آیا۔ تعزیہ کے راستے پر ایک "بڑ" کا درخت تھا۔ اس سال اس "بڑ" کی مخصوص شاخیں بڑھ کر تعزیے کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں، زبان حال سے کہتی تھیں، کہ ادھر سے گزرو تو نوجوانوں کا خون بھینٹ چڑھا کر جاؤ۔ اس "بڑ" کی تقدیس بڑھانے کے لیے سکھوں نے کہا کہ یہ "بی بی نانکی" کے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے یوں اس بڑ کو گورو نانک جی سے نسبت دی گئی، اب درحقیقت "امام حسین" اور "بابا نانک" کا سوال بن گیا۔ حکام ریاست اس معاملہ میں پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ اور سمجھوتہ ہوتا ہوتا رہ جاتا تھا۔ مہندی، اور علم بطور احتجاج اٹھانے

سے انکار کر دیا گیا۔ تعزیہ داروں نے جو خیر سے سب "سنی مسلمان" تھے، ٹولیوں میں بڑھ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ پولیس افسر اور علاقہ مجسٹریٹ موقعہ پر موجود تھے۔ انہوں نے گرفتاریاں شروع کر دیں۔ دو دن میں ساڑھے چار صد مسلمان گرفتار ہوتے۔ چودھری عبدالعزیز کا ایک قدم سلطان پور اور ایک قدم کپور تھلہ میں تھا۔ تاکہ کسی طرح سلطان پور کے سر سے آئی بلا ٹل جاتے۔ مگر حکام کی بے جا ضد نے کوئی صورت نہ پیدا ہونے دی۔ چودھری عبدالعزیز خاں کے بیان کا وہ حصہ جو سلطان پور فائرنگ کے متعلق انہوں نے ڈسٹرکٹ ایسوسی ایشن جالندھر کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے دیا وہ بھی قابل غور ہے۔"

بگووالہ کا موقف

"دوپہر سے قبل وفد سلطان پور پہنچا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پندرہ اشخاص کی ایک جماعت تحصیل دار صاحب کے در دولت یا کچہری میں حاضر ہو کر دس بجے یہ مطالبہ کرنے کے لیے تیار تھی کہ تعزیہ کا راستہ صاف کرا دیا جائے مگر ۱۲ بجے تک معززین کے اصرار پر یہ جماعت رک گئی۔ میں اس جماعت کے پاس گیا۔ ان کے پاس ایک بورڈ تھا۔ جس پر بدین مضمون عبارت تحریر تھی، کہ اسٹیٹ ریگولیشن ۱۹۱۵ء کے مطابق تحصیلدار صاحب کا فرض ہے کہ تعزیہ کے لیے راستہ صاف کرائیں۔"

ان کو ملنے کے بعد میں چودھری فتح محمد کے مکان پر گیا۔ جہاں مجھے معلوم ہوا کہ ادھم سنگھ اس بات کے لیے تیار ہے۔ کہ اگر وزیر اعظم صاحب یا معززین میں سے کوئی اور اس سے کہیں تو وہ اپنا اعتراض واپس لے لے گا جو دوست وہاں موجود تھے، انھوں نے مجھے ادھم سنگھ کے پاس جانے کے لیے مخاطب کیا۔ میں منشی فیض بخش کے مکان پر ادھم سنگھ سے ملا۔ اور اس سے درخواست کی کہ تعزیہ کے راستہ کی رکاوٹ کا باعث نہ ہو، جس کے جواب میں اس نے کہا کہ اگر صرف اس سال تعزیہ دار ہی اس راستہ سے تعزیہ نہ گزاریں

ون سیا حرج ہو جائے گا میں تو بعض وجوہات کی بنا پر مجبور رہوں۔ یہیں تک گفتگو کا
لمہ پہنچا تھا کہ گردت سنگھ اور دھرم سنگھ کو بلا کر لے گئے۔

میں پھر احباب کے مشورے سے سٹیٹ ریسٹ ہاؤس کو گیا۔ جہاں وزیر اعظم صاحب
پکٹر جنرل پولیس اور دیگر افسران موجود تھے۔ جس کی غرض یہ تھی کہ افسران متعلقہ اور وزیر اعظم
حب کو صورت حال سے بخوبی مطلع کر کے تعزیہ کے راستے کی رکاوٹ کو دور کیے جانے کے
لئے کہا جاتے۔ چونکہ وزیر اعظم صاحب معترضین سے گفتگو میں مشغول تھے، اس لیے میں
ٹھہرا رہا۔ ساڑھے بارہ بجے کے بعد مجھے اطلاع ملی۔ کہ راستہ طلب کرنے والی جماعت پر
ٹی چارج کیا گیا ہے۔ اس اطلاع پر میں مع چودھری فضل محمد وکیل جائے وقوع کی طرف
نہ ہوئے، میجر کوٹھڑ والا اور فوجی افسر بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس وقت وہاں صرف پندرہ
ی اس گلی میں موجود تھے، جو عبداللہ علم والے کے مکان سے بازار کو آتی ہے۔ اور کوئی دوسرا
ی موجود نہیں تھا۔ میجر صاحب نے وہاں آتے ہی اس کی گلی کے دو طرفہ چھتوں پر چار
سپاہی یعنی کہ آٹھ رائفلیں دے کر چڑھا دیئے۔ جو فائر پوزیشن لے کر بیٹھ گئے۔ خود میجر
نب نے ان پندرہ اشخاص کو مخاطب کر کے کہا کہ "یا تو ہٹ جاؤ ورنہ میں فائر کرا دونگا"
ندرہ آدمیوں کی جماعت بلا کسی جواب کے بیٹھ گئی، اس وقت میں نے ایک سپاہی کو
کا نام شاید بوٹا سنگھ تھا بازار میں لیٹے ہوئے دیکھا۔ جس کے چہرے پر چند خراشیں تھیں
س گلی سے ہوتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں دوسرے لوگ متعلقہ تعزیہ داری موجود تھے
نے ان میں چھبیس اشخاص کو مجروح پایا۔ دو اشخاص کے ضربات شدید معلوم ہوتی تھیں،
ے تعزیہ داروں کو اپنی مجلس ماتم اور مرثیہ خوانی جاری رکھنے کے لیے کہا اور راستہ طلب
ت کو مزید توقف کی ہدایت کی۔ اس وقت انسپکٹر جنرل صاحب پولیس نے اس مقام
سے دریافت کیا کہ آپ لوگ کسی نتیجہ پر پہنچے؟ میں نے جواب دیا کہ تعزیہ دار اپنے قدیمی
و منظور نہیں کرتے، میجر صاحب نے کہا ہم بڑ کی شاخیں کاٹنے پر تیار نہیں، میں نے
یہ بیجا ہے۔ اور بڑ کوئی متبرک درخت نہیں، تاہم اگر آپ زمین کھود کر تعزیہ گزارنے
اجازت دے دیں۔ تو میں تعزیہ داروں کو رضامند کر لوں گا۔ میجر صاحب نے کہا، کہ دس
زمین کیسے کھودی جا سکتی ہے؟ میں نے کہا کہ کھدائی اور پھر اس کو ہموار کرنے کا انتظام

ہم خود کرلیں گے۔ آپ صرف اجازت دے دیں۔ مگر میجر صاحب نے منظور نہ کیا۔ تقر
۲ بجے میں پھر وزیر اعظم کی طرف گیا۔ اور توجہ دلائی، کہ جو بحث اس وقت آپ کے سا
ہندو سکھ اور مسلمان کر رہے ہیں بے نتیجہ ہے، کیونکہ راستہ کے قضیہ کا حق تعزیہ داروں کو
کو ہی پہنچتا ہے انہیں بلا کر ان سے بات چیت کی جائے میری رائے سے اتفاق کرتے ہو
تحصیلدار صاحب کو تعزیہ داروں کی کمیٹی کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ چھ اشخا
کا ایک وفد وزیر اعظم صاحب کے پاس گیا۔ مگر اس کے کوٹھی پہنچنے سے چند منٹ قبل وزیر
صاحب کپورتھلہ روانہ ہو چکے تھے، تعزیہ داران مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے رات کے ۹
کپتان عزیز احمد کپورتھلہ سے سلطان پور آیا۔ اور تعزیہ داروں سے میری موجودگی میں کہا
وزیر اعظم صاحب کسی غلط فہمی کی بنا پر سلطان پور سے چلے گئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ
آپ لوگ کپورتھلہ پہنچ جائیں اور ان سے گفتگو ہو جائے تعزیہ دار رضامند ہو گئے۔ ۲ محرم
صبح نو بجے ابھی چھ تعزیہ داروں کے وفد کو میں اپنے ہمراہ لے کر کپورتھلہ پہنچا وفد ا
وزیر اعظم کے مابین راستہ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ وزیر اعظم اس بات پہ زور دیتے تھ
کہ اس سال وہ راستہ چھوڑ دو، آئندہ ہر امکانی کوشش اس راستہ کو صاف کرنے کے
متعلق کی جائے گی۔ وفد کا خیال تھا کہ یہ محض رفع الوقتی ہے اور اگلے سال کہا جائے گا
بس تمہارا یہی راستہ ہے جس سے پچھلے سال گزر چکے ہو۔ ممبران وفد کا اصرار تھا کہ بڑ
درخت کاٹا جائے یا نہ کاٹا جائے ہمیں وہاں سے زمین کھود کر گزر جانے کی اجازت دے
دیجئے اور ساتھ ہی یہ دلیل پیش کرتے تھے، کہ اسی بڑ کی شاخیں ایک مکان کی تعمیر کے لیے
اگر کاٹی جا سکتی ہیں تو تعزیہ کے گزرنے کے لیے کیوں نہیں کاٹی جا سکتیں۔ وزیر اعظم صا
بڑ کی شاخوں کو کاٹنے کے لیے کسی حالت میں بھی رضامند نہ تھے، میں نے مسٹر کوٹھاوالے
موجودگی میں یہ تجویز پیش کی کہ دو تحریریں لکھ لی جائیں ایک یہ کہ اگر تعزیہ دار اس سال تمنا
راستے سے نہ گزریں تو آئندہ ہمیشہ کے لیے محلے کے کسی فرد کو کوئی اعتراض کرنے کا حق حا
نہ ہوگا۔ اور راستہ کی رکاوٹ دور کرنے میں کوئی عذر پیش نہ کیا جائے گا۔ اگر اس تجویز پ
معتبر فریقین دستخط کر دیں اور حکومت اس معاہدہ کی تکمیل کی کامل ذمہ داری لے لے تو میر

زیہ داروں کو اس بات کے منظور کرنے کے لیے انشاءاللہ رضامند کر لوں گا یا یہ کہ اس
ل تعزیہ اسی راستہ سے گزرے اور آئندہ کے لیے تعزیہ دار اس راستہ کو ترک کر دیں۔
لوں تحریر یں دل میں جس پر معترضین متفق ہو جائیں۔ یا جس کو معترضین منظور کر لیں اور جانبین
، دستخط ہو جائیں تو میں مسلمانوں کی طرف سے معاہدہ کی پابندی کا یقین دلاتا ہوں۔ وزیر اعظم
حب نے میجر کوٹھا والے کو فریق ثانی کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی ہدایت
۔ اور ہم واپس سلطان پور چلے آئے۔ اسی دن یہاں مہندی نکالی جاتی ہے۔ علم
طرح مہندی بھی بطور احتجاج نہ اٹھائی گئی۔ کوٹھا والے نے تعزیہ داروں سے دریافت
بھیجا کہ اگر تمہیں سمجھوتہ کے لیے بلاؤں تو آ جاؤ گے؟ تعزیہ داروں نے جواب دیا کہ ہم ہر
تے آنے کو تیار ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ علم نکالنے کا وقت گیا اور مہندی نکلنے کا وقت بھی
۔ اسی لیت و لعل میں تعزیوں اور ذوالجناح کا وقت نہ گزارا جائے۔ تعزیہ داروں نے
صاحب کے پیغام کا ۵ بجے تک انتظار کیا۔ لیکن ۵ بجے تک کوئی پیغام نہ آیا۔ مجھے
صاحب نے بتایا کہ فریق ثانی اس تجویز کے متعلق کسی رضامندی کا اظہار نہیں کر رہے
۔ ۵ بجے پھر تعزیہ دار اور دوسرے متعلقین جمع ہوئے۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟ راستہ
مطالبہ کے جواب تک تو سب متفق تھے اور آئندہ طریق کار میں ضرور اختلاف رائے نظر
۔ فریق کی رائے تھی کہ تمام ریاست کے تعزیے تاوقتیکہ راستہ صاف نہ کیا جائے نہ اٹھائے
یں۔ میری بھی یہی رائے تھی، ۷ بجے ایسی جماعتیں محلہ زرگر یزوں میں سے نکلنی شروع
یں۔ پولیس نے بحکم مجسٹریٹ علاقہ انہیں گرفتار کرنا شروع کیا۔ دو گھنٹہ کے اندر ۱۱۵
تاریاں نہایت پُرامن طریقے سے عمل میں آئیں۔ رات کو صبح تک کے لیے یہ سلسلہ
ی کر دیا گیا۔ ۸ محرم اور ۹ محرم کو ۲ بجے تک گرفتاریوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تقریباً
بھے چار سو گرفتاری بغیر کسی شور و شر کے عمل میں آئی۔ ۸ محرم کی صبح کو دیہات کے
مان وہاں موجود تھے۔ انہیں میں نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس طریق سے
اف ہے میں چاہتا ہوں کہ اس وقت تک تعزیہ نہ اٹھائیں، جب تک راستہ صاف
۔ آپ خود سوچ کر فیصلہ کر لیں کہ کیا طریق اختیار کرنا ہے؟ ان میں سے بعض واپس

لوٹ گئے اور بعض محلہ رنگریزوں میں جاکر راستہ طلب جماعتوں میں شامل ہو گئے۔ ۹ محر
۲ بجے میں نے پھر ایک بار کوشش کی کہ اس طریقہ کو ملتوی کر دیا جائے۔ تاکہ ایک
پھر راستہ کی بندش کو دور کرنے کی سعی کا موقعہ ہاتھ آئے۔ ۱۰ محرم کو ۱۰ بجے تک ایسی جما
کا بھیجنا ملتوی کر دیا گیا۔ میں ۴ بجے مع چودھری علی اکبر، وزیر اعظم صاحب کے پاس گ
آیا۔ سلطان پور سے روانہ ہونے سے قبل میں نے میجر کوٹھا والے سے کہا۔ آپ کے ما
آفیسر اور بعض سول آفیسر عوام کو مشتعل کرنے کی بہت کوشش کر رہے ہیں۔ جو مع
کے سلجھاؤ میں ایک روک ثابت ہو رہی ہیں۔ اس سے نتیجہ یہی اخذ ہوتا ہے۔ کہ تنا
کے اسباب پیدا ہو جائیں ان کی نیتوں میں فتور ہے آپ کو کامل حزم و احتیاط سے ک
لینا چاہیئے۔ لیکن میجر صاحب نے کچھ توجہ نہ فرمائی۔ جناب وزیر اعظم سے کپورتھلہ میں
شام کے میں نے کہا کہ تعزیہ کو وہاں سے گزارنا اور شاخوں کا کاٹنا ہی مناسب ہے۔ مگر ا
نے بڑ کی شاخوں کا کاٹنا منظور نہ کیا۔ میں نے ایک اور تجویز پیش کی۔ اور وعدہ کیا کہ
یہ عملدر آمد کیا جائے۔ تو مسلمانان سلطان پور کو میں رضامند کر لوں گا۔ وہ یہ کہ سردار بہادر
پوران سنگھ سی۔ آئی۔ ای ریاست کے مفاد اور بحالی امن کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑ کی شا
کاٹ دیں۔ اور آپ تعزیہ کے ساتھ ہوں)۔ اور تعزیہ آپ کے تجویز کردہ راستہ سے گزر
تجویز کے پہلے حصہ کو بھی وزیر اعظم صاحب نے منظور نہ کیا۔ میں ۹ بجے کے بعد واپس سلطان
پہنچا۔ ابھی اس قضیہ کے متعلق منتخبہ پنچایت کے ممبران کو پیغام بھیج ہی رہا تھا کہ اچانک
دو، ڈرا تفل فائر کی آواز سنائی دی، سرائے سلطان پور سے جو اس وقت بطور جیل استعمال ہو
تھی۔ چیخ و پکار اور فغاں کا شور اٹھا۔ میں سرائے سلطان کی طرف بھاگا۔ انسپکٹر جنرل
کی اجازت سے اندر داخل ہوا۔ رضاکاروں سے ملا۔ بائیس آدمی زخمی اس وقت میں
دیکھے بعض کے خون بہہ رہا تھا۔ اور دو تین بے ہوش پڑے تھے لیفٹیننٹ ڈاکٹر طعبا
اور ڈاکٹر کشمیرا سنگھ زخمیوں کو دیکھ رہے تھے۔ واقعہ کی تحقیق شروع کی تو معلوم ہوا کہ
سے ہی یعنی جس دن سے ملٹری یہاں پہنچی ہے سکھ سپاہیوں اور افسروں نے کھانا پکا
کے لیے اپنے چولہے مسجد کی دیوار کے ساتھ بنائے ہوئے ہیں جن کے نشانات آج تک

پر موجود ہیں۔ وہاں جھٹکا پکایا جاتا تھا۔ اور نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کے راستے میں بھی اکثر فوجی سپاہی نمازیوں کے لیے مزاحمت کا باعث ہوتے تھے۔ موجودہ ہنگامہ کی وجہ یہ ہوئی کہ نماز عشار کی اذان پر سکھ فوجیوں نے پہلے تو مضحکہ اڑایا اور پھر جب لوگ نماز ادا کر رہے تھے، تو ایک سکھ فوجی ملازم نے خدا کی شان میں ایسے الفاظ کہے جنہیں کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ اس پر رضا کاران معترض ہوئے اور کہا کہ گو ہم قیدی ہیں لیکن ہم اپنے مذہب کی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔ ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ بعض سکھ سپاہیوں نے چھت کا منڈیرا اکھاڑ کر رضا کاروں پر خشت باری شروع کر دی، ان اکھڑی ہوئی اینٹوں کے نشانات میجر کوٹھا والا اور مجسٹریٹ دونوں کو دکھا دیئے گئے تھے، رضا کاروں کا یہ بیان میری تحقیق کے مطابق صداقت پر مبنی ہے۔ میں اس میں شک و شبہ کی گنجائش محسوس نہیں کرتا۔ اس تحقیق کے بعد میں نے میجر کوٹھا والا کو حالات کی نزاکت کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ جہاں جذبات کی یہ کیفیت ہو وہاں خیریت کی امید کیونکر ہو سکتی ہے؟ میں نے ۱۲ بجے رات کپور تھلہ پہنچ کر چیف منسٹر کو تمام جھگڑے اور بنائے جھگڑے کی اطلاع دے دی۔ اور بتا دیا کہ اس دفعہ کے باعث دیہات میں بھی اشتعال پیدا ہو گا۔ نہایت ضروری ہے کہ تعزیہ کے راستہ کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا۔ کہ سکھ ملٹری سٹاف فائر کرنے کے بہانے کا ہی متلاشی ہے۔ معاملات اس حد تک بگڑ چکے ہیں۔ کہ مسلمان سپاہی بھی اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنے آپ کو مامون نہیں سمجھتے میجر کوٹھا والا صاحب کو میں بار ہا مطلع کر چکا ہوں لیکن اس کے نزدیک میری آواز صدا بہ صحرا رہی، ۲½ بجے کے قریب میں واپس سلطان پور آیا۔

۱۰ محرم صبح ۹ بجے مسلمان میرے پاس آئے اور شب گزشتہ کی کوشش کا نتیجہ طلب کیا۔ میں نے کہہ دیا کہ وزیر صاحب اپنے تجویز کردہ راستہ سے خود تعزیہ لے جانے کو تیار ہیں بجز اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ بجز اس کے اور کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ قریباً ۱ بجے سپیشل مجسٹریٹ نے مجھے کہا کہ جو لوگ تلونڈی اور دیہات سے آئے ہیں، وہ تعزیہ متنازعہ راستہ سے نہ لے جائیں۔ میں بمعیت چودھری فضل محمد وکیل اور چودھری فتح محمد جو ان تمام ایام میں میرے ساتھ ہر کوشش میں شامل رہے، مجمع کی طرف روانہ ہوا۔ اس مجمع میں

سے سربرآوردہ اشخاص کو بلا کر سمجھایا کہ تم رحمت والا تعزیہ متنازعہ راستہ سے نہ لے جاؤ میں نے حد سے زیادہ اصرار کیا۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ مجمع خواہ کتنا ہی پر امن کیوں نہ ہو اُن پر فائر ہو جائے گا اور وہ بھی منتقمانہ جذبہ کے تابع ہوگا۔ فائر کرنے والے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے فائر نہیں کریں گے۔ بلکہ قتل عام کا منظر دنیا کے سامنے ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں نے ان اشخاص سے درخواست کی کہ یا تو تعزیے پڑے رہنے دو، اور جب تک راستہ متنازعہ صاف نہ ہو جائے کوئی تعزیہ نہ اٹھایا جائے۔ اور وہ اس پر رضامند تھے یعنی صرف اتنے پر رضامند نہ تھے' اس لیے میں نے یہ رائے دی کہ جو طریق اہل سلطان پور نے رضاکاروں کو قید کراتے کا آج سے تین روز پہلے اختیار کر رکھا ہے اسی کے مطابق موقعہ پر جا کر اپنے آپ کو گرفتار کرا دو، ان کا جواب یہ تھا۔ کہ حکومت ہم پر کیوں گولی چلائے گی۔ اور کیوں تشدد بے جا کرے گی نہ ہم کسی فریق سے لڑنے جا رہے ہیں، نہ زبردستی بڑ کاٹ رہے ہیں نہ ہمارے پاس اسلحہ ہے اور نہ ہماری دنگا فساد کی نیت ہے۔ اہل سلطان پور کے پروگرام میں صرف اتنی ترمیم کریں گے کہ تعزیہ راستے پر رکھ اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کریں گے۔ ہماری نیتیں صاف ہیں اور ہم اسی بات کا اعلان کرتے ہیں، حکومت اگر چاہے تو ہمیں اسی مقام پر گرفتار کر سکتی ہے۔ میں نے تعزیہ اٹھاتے وقت انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ تم پر آتش باری کی جائے گی۔ اور ان سب سے وہی جواب پاتا رہا جو وہ پہلے دے چکے تھے "پیرو" ہمشیرزادہ رحمت تعزیہ دار انہیں تعزیہ اٹھانے اور راستہ متنازعہ پر چلنے کی نہ صرف ترغیب دیتا تھا بلکہ اس پر اصرار کرتا تھا۔ میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ کچھ وقت آرام کرنے کے بعد مع چوہدری فتح محمد مستری محمد یعقوب کے بالاخانے کی چھت پر آ گیا۔ جہاں سے کہ بڑ متنازعہ تک سب کچھ نظر آتا تھا۔ اور تعزیہ کے جلوس کی ہر حرکت میں دیکھتا۔ اور باتوں کی مجھے اطلاع ملتی تھی' منشی محمد حسن گرداور اور کیپٹن عزیز احمد کو میں نے بار بار رہنمایان جلوس میں دیکھا۔ جلوس ایک ہی جگہ پر رک گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک گھنٹہ کا وقفہ اس لیے قرار پایا ہے کہ ممبران کونسل و صاحب صدر موقعہ پر آ جائیں۔ تو خاطر خواہ تصفیہ کرا دیا جائے گا۔ اس ایک گھنٹہ سے بیس پچیس منٹ زائد وقت بھی گزر گیا۔ مگر انتظامیہ کونسل موقعہ پر نہ پہنچی، ۴ اور ۴½ بجے کے درمیان ایک بگل

بجا۔ جو لوگ اس مکان کے قریب تھے۔ جہاں میں موجود تھا۔ ان کی آواز میرے سننے میں آئی۔ کہ لو بھئی میاں صاحب آئے ہیں۔ اسی لیے بگل بجا ہے۔ بگل بجنے کے معاً بعد لوئیس گن اور رائفل فائر شروع ہوگیا۔ فائر ہر مقام سے ہوا۔ گوردوارہ ہٹ صاحب سے بھی فائر ہوتا تھا۔ تحصیل کے ایک برج سے بھی تین چار فائر ہوئے۔ تکیہ راجپوتاں میں اور وٹرنری ہسپتال کے قریب جو لوگ شہید یا زخمی ہوئے وہ سب ہٹ صاحب کی گارد کے فائر سے ہوئے ایک شخص شادی کمبوہ سکنہ الولپور چراغ شاہ کے مکان کے قریب گولی کا نشانہ بنا اور وہیں جاں بحق ہوا۔ فائر بند ہو جانے کے بعد بھی ہٹ صاحب سے تین فائر ہونے کے قریباً ۲۰ اور ۲۵ منٹ بعد میں جائے وقوع پر پہنچا۔ زخمی زیادہ تر موٹروں میں ہسپتال بھیجے جا چکے تھے۔ شہدا کی نعشوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لاریوں میں لادا جاتا تھا۔ موقعہ پر صرف ایک ڈاکٹر تھا۔ کوئی سٹریچر تھا۔ اور نہ مرہم پٹی کا کوئی انتظام۔ یہاں تک کہ بعض زخمی شدت پیاس کے باعث بے تاب تھے۔ پانی کے چند قطروں کے لیے ترستے ہوئے جاں بحق ہوئے۔ ہٹ صاحب اور تحصیل کے برج کے علاوہ اس بلند مقام یعنی آوا سے بھی فائر ہوئے۔ جو اس مقام سے جہاں لوئیس گن رکھی ہوئی تھی، جنوب مشرقی گوشہ میں واقع ہے۔ مسلح سکھ اور مہابیر دل کے والنٹیر کرپانوں، برچھیوں اور لاٹھیوں سے مسلح فوج کے پیچھے کثیر تعداد میں موجود تھے، دیکھنے والا ان کو میجر کوٹھا والا کی ریزرو فورس ہی تصور کر سکتا ہے۔

چودھری عبدالرشید خاں مجسٹریٹ علاقہ میرے حقیقی بھائی ہیں کیپٹن عزیز احمد بھی میرے چھوٹے حقیقی بھائی ہیں، لوئیس گن پر کام کرتے ہیں، میں نے ایک سکھ سپاہی کو دیکھا لوئیس گن کی آواز بھی بخوبی پہچان سکتا ہوں۔ شہداء کے زخموں کی کیفیت سے بھی میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ زخم لوئیس گن کی گولیوں سے واقع ہوتے ہیں۔ مثلاً نبی بخش سقہ جس کے سینہ میں چھ گولیاں تھیں، اور پیرو ہمشیرہ زادہ رحمت تعزیہ والا، جس کے پیٹ میں کئی گولیاں تھیں، ایک ہی نشان پر کئی گولیوں کا لگنا صرف لوئیس گن ہی سے ہو سکتا ہے۔

س: اگر ایک ماہر نشانچی ٹھیک نشانہ پر کئی ایک بار رائفل سے فائر کرے اور یہ سب گولیاں ایک ہی مقام پر لگیں، تو کیا ایسے ہی زخم پیدا نہیں ہو سکتے۔ جو نبی بخش اور

پیرو کے آپ ... سمجھے اگر نہیں تو کیوں؟

ج : رائفل کا فائر اتنا تیز نہیں ہوتا جیسے تھامسن گن کا ہوتا ہے۔ رائفل کی پہلی گولی جس شخص کے لگے گی وہ لازماً اپنی پہلی پوزیشن سے حرکت کرے گا۔ اس لیے دوسری گولیاں اس نشانہ کے قریب نہیں لگ سکتیں، یہ ٹومیں گن کے تیز فائر ہی سے ہو سکتا ہے کہ کئی ایک گولیاں ایک ہی نشانہ پر ایک ہی نشانہ کے قریب لگ سکیں۔

س : کیا واقعہ سلطان پور کا داخلی سیاسیات سے کچھ تعلق ہے یا یہ محض اتفاقی ہے؟

ج : میں اس فائرنگ کے متعلق پہلے بیان کر چکا ہوں، کہ ایسے حالات پیدا کرنے کی بعض ملازمین ریاست خود کوشش کر رہے تھے، میں اسے محض اتفاقی حادثہ قرار نہیں دیتا۔

س : یہ کوششیں کیوں اور کب شروع ہوئیں، کیا آپ اس امر کا مفصل بیان فرما سکتے ہیں

ج : ریاست کپورتھلہ میں سالہا سال سے مسلمان پسماندہ قوم کی حیثیت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ باوجودیکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے قریباً ستاون فی صدی مسلمان آباد ہیں، لیکن ریاست کے ہر محکمہ میں ملازمتوں کے اعتبار سے مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے مسلمان اس وقت بھی تقریباً ساٹھ فیصدی مالیہ ادا کرتے ہیں، مگر وظائف اور اوقاف میں انہیں صرف آٹھ ہزار چار سو چالیس روپیہ ملتا ہے، برعکس اس کے غیر مسلموں کو ۶۸۳۳۸ روپیہ نقد ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مندروں اور دھرم شالاؤں کے نام معافیات ہیں، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمان کپورتھلہ میں نہایت کمتر درجہ میں رکھے گئے ہیں، ۱۹۳۱ء میں مسلمانوں نے حقوق طلبی کی پہلی ہلکی سی آواز بلند کی تھی، اور ساتھ ہی زمیندار جو آئے دن بے انصافی کا شکار ہوتے تھے، ان کی اس تباہ حالی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے ایک زمیندارہ تحریک کی بنیاد ڈالی، چونکہ زمیندار اقوام میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ اس لیے ہندو ساہوکاروں نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی ہر امکانی کوشش کی۔ سکھ زمیندار بہت تھوڑی تعداد میں اس تحریک میں شامل ہوئے۔ کیونکہ وہ ایسے سکھ افسروں کے زیر اثر تھے، جو خود بڑے پیمانے کا ساہوکارہ کا کام کرتے ہیں، اور مسلمانوں میں بیداری اور حقوق

طلبی کے جذبہ کے وہ متحمل نہ ہو سکے' اس لیے وہ تحریک خالص زمیندارہ تحریک تھی، جو ہندو ساہو کاروں کے علاوہ ریاست کے ذمہ دار اہلکاروں کو بھی ناگوار گزری اور انہوں نے اپنے آوردوں اور پروردوں کے ذریعے اس تحریک کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور اس تحریک کو کچلنے کیلئے مسلمان زمینداروں کو بے طرح تنگ کیا جاتا رہا۔ جنوری ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتہ میں قانون تحفظ اراضیات زمینداران میں ترمیم اس تحریک کا نتیجہ ہوئی۔ اس ترمیم کے بعد ہندوؤں نے سول نافرمانی کی تحریک بڑی شد و مد سے جاری رکھی۔ اور منجملہ دیگر مطالبات ایک یہ مطالبہ بھی پیش کیا۔ کہ نظام ریاست کی ذمہ داریاں ایک انتظامیہ کونسل کو سونپی جائیں۔ جس کو مہاراجہ صاحب نے منظور کرتے ہوئے اس طرح ترتیب دیا۔ کہ ۶ ممبروں کی کونسل مرتب کی، جن میں سے دو مسلمان تھے' مسلمانوں کو اس کے خلاف شکایت تھی، کہ کونسل میں ان کی نمائندگی ان کے تناسب آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ ہندوؤں کی اس تحریک کی کامیابی کے بعد ہر طبقہ کے مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ ہندوؤں کی خوشنودی کیلئے ریاست اپنے دیرینہ اصول کے مطابق مسلمانوں کے حقوق اور بھی زیادہ پامال کرے گی۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا۔ اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے احرار کانفرنس کا انعقاد کیا۔ جو ۲۴ اپریل ۱۹۳۷ء کو ہوئی۔ اس کانفرنس میں ذمہ دار اسمبلی، مسلمانوں کے لیے ملازمتیں' بلحاظ تناسب آبادی اور چند دیگر اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا۔ مہاراجہ صاحب کی طرف سے کانفرنس کے پنڈال میں وزیر اعظم صاحب نے اعلان کرتے ہوئے یقین دلایا کہ سرکار کی واپسی یورپ پر مطلوبہ اسمبلی قائم کر دی جائے گی۔ اور مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ بھی یقین دلایا گیا۔ کہ جن محکمہ جات میں مسلمان کم ملازم ہیں۔ وہ کمی پوری کی جائے گی۔ انہی مطالبات میں جگت جیت انفنٹری اور محکمہ جنگی کی دوسری شاخوں میں جہاں مسلمان بہت کم تعداد میں ہیں، مسلمانوں کی کمی کو پورا کرنا بھی شامل تھا۔ اس کانفرنس کی کامیابی اور حکومت ریاست کا اعلان اور بالخصوص اس تیسرے مطالبے نے ریاست کے اکثر غیر مسلم ذمہ دار افسروں کو اور بھی چراغ پا کر دیا اور مسلمانوں کو کچلنے کے منصوبے گانٹھے جانے لگے' سلطان پور کا

واقعہ ہر ذی فہم کے نزدیک انہی اسباب کا ایک نتیجہ تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری ان کے لیے جو ریاست کے ہر شعبہ پر قابض ہیں اور ان کے معاونین کے لیے ناقابل برداشت تھی، اس سیاسی بیداری اور حقوق طلبی کی سپرٹ کو ہمیشہ کے لیے فنا کرنے اور مسلمانوں کے شیرازہ کو بکھیرنے کے لیے سلطان اپور کا قتل عام ظہور میں آیا ورنہ شارع عام پر ایک بڑ کے درخت کی چند شاخوں کے لیے جو میونسپلٹی کی زمین میں ہو مسلمانوں کا اس بیدردی سے خون بہایا جانا اور کیا معنی رکھتا ہے؟ میں اس امر کو اپنے بیان کے پہلے حصہ میں واضح کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کے اس مجمع سے نقص امن کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ جو کچھ ہوا جرم کو ہوا ایک خاص سازش کا نتیجہ تھا جس میں ریاست کے بڑے سے بڑے ذمہ دار افسروں کی شمولیت ہے"

(تاریخ احرار صفحہ ۱۶۶)

یہ مناقشہ خدا خدا کر کے ٹھنڈا پڑا تو پھر ریاست کے وزیر اعظم سر عبدالحمید نے جوڑ توڑ شروع کیا لیکن تمام جوڑ توڑ کے باوجود یہ تحریک سرد نہ پڑ سکی اور بالآخر سر عبدالحمید نے چودھری عبدالعزیز بگوال کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے اور ان کو پانچ سال سزا کا حکم دلوادیا۔ اس سے صورت حال اور بگڑ گئی۔

"چودھری عبدالعزیز جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ریاست کے امتیازی خاندانوں میں سے ایک کے فرد ہیں، وہ قید ہوئے تو ہر ریاستی غریب مسلمان کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ مہاراجہ کپور تھلہ تمام راجوں، مہاراجوں سے مختلف ڈھب کے آدمی ہیں، وہ ریاست کے نظم و نسق میں کم حصہ لیتے ہیں اور سیر سپاٹے کے شائق مرنجاں مرنج سے آدمی ہیں، سیر یورپ سے واپس لوٹے تو یہاں لٹیا ڈوبی ہوئی نظر آئی۔ اگرچہ میاں صاحب پر ان کو بڑا اعتماد تھا۔ مگر ان کو سیاسی مصلحت پر قربان کرنا پڑا۔ چودھری عبدالعزیز کی اپیل ریاست کی عدالت عالیہ کے پاس کی گئی، میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر نے نہایت قابلیت سے مقدمہ مفت لڑا۔ عدالت کو مقدمہ میں سزا بحال رکھنے کی کوئی گنجائش نظر نہ آئی۔ آخر چودھری عبدالعزیز کو مہاراجہ صاحب نے رہا کر دیا اور میاں صاحب، وزارت سے الگ کیے گئے اور ایک کمیٹی قائم کر دی گئی جو اصلاحات کی سفارش کرے عبدالعزیز بگوال کو اس کا رکن بنایا گیا۔ اور اس طرح یہ تحریک کامیاب و کامران ہوئی"

قادیانیوں کے خلاف مہم

مجلس احرار اور اس کے قائدین کا سیاست کے بارے میں ایک پختہ نظریہ تھا کہ قوم کو ہر وقت کسی نہ کسی ہنگامے اور تحریک میں الجھائے رکھو، اس سے لوگوں کا خون حرکت میں رہتا ہے ان کا ولولہ اور جوش سرد نہیں پڑتا۔ چنانچہ اپنے اس نظریہ کو چودھری افضل حق یوں بیان کرتے تھے:

"لیڈر سنیما سٹاروں کی طرح تب تک ہر دلعزیز رہتے ہیں، جب تک وہ لوگوں کی نظروں میں آتے رہتے ہیں جہاں فلم پرانا ہوا اور نئی فلموں میں نئے ایکٹر آ گئے پہلے فلم سٹاروں کا ستارہ غروب ہوا کبھی، کوئی بھولے سے بھی یاد نہیں کرتا"

یہی خدشہ تھا کہ وہ ہر لمحہ تحریک اور ہنگاموں کی تاک میں رہتے پہلے وہ کانگریس اور خلافت میں تھے تو ان پر ایک کل ہند جماعت کی بری بھلی پابندیاں تھیں، ان کا ڈسپلن تھا اور پھر قربانیوں کا کریڈٹ بھی، ان کل ہند جماعتوں کو ہی جاتا تھا۔ لیکن اب ۱۹۳۰ء کی کشمیر تحریک اور ۱۹۳۲ء کی کپورتھلہ تحریک نے مجلس احرار کے حوصلے بہت بلند کر دیئے تھے۔ ان میں اپنی کامیابی و کامرانی کا نشہ تھا اور وہ اس نشے میں، اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کا جذبہ اور شوق لیے مختلف ہنگاموں کی تاک میں رہتے۔ لیکن جب کپورتھلہ تحریک ختم ہوئی۔ تو اس وقت ملک کی صورت حال میں نمایاں تبدیلیاں ہونے والی تھیں کمیونل ایوارڈ کا اعلان ہو چکا تھا۔ اور نئی اصلاحات کے بارے میں قانون نافذ ہونے والا تھا۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ نئی اصلاحات کے بعد انتخابات ہوں گے۔ چنانچہ مجلس احرار کے اکثر قائدین اس دور میں اپنی مقبولیت کے بل پر انتخابات میں حصہ لینے کے انداز میں سوچ رہے تھے، احرار کے قائدین میں دو قائدین تو کم از کم ایسے تھے۔ جو دو عملی کے زمانے میں بھی پنجاب کونسل کے رکن رہ چکے تھے، ان کو پارلیمانی زندگی کا تھوڑا بہت تجربہ بھی تھا۔ اس لیے ان کے سامنے شعوری طور پر ہونے والے انتخابات بھی تھے۔

پنجاب کے آیندہ انتخاب میں احرار کو اچھی طرح پتہ تھا کہ ان کا مدمقابل فضل حسین ہے

دراصل سر فضل حسین ایک دوسرے طبقے کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس طبقے کے اپنے داؤ پیچ تھے۔ لڑائی کے اپنے انداز تھے۔ طاقت و اقتدار کے حصول کا اپنا ایک طریقہ تھا۔ وہ طریقہ جوڑ توڑ، زمینداروں کے اثر و رسوخ کا استعمال، نوکر شاہی کی بھرپور امداد پر تکیہ تھا اس داؤ پیچ اور طریق کار کے بارے میں ایک انگریز صحافی کا تجربہ بہت ہی وقیع سمجھا جائیگا یہ انگریز صحافی الہ آباد سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار پائنیر کے مدیر اعلیٰ" ایف، ڈبلیو ولسن تھے۔ یہ بحیثیت صحافی وائسرائے کے بہت قریب تھے، اور برطانوی حکومت کے ارادوں، سیاسی چالوں اور ضرورتوں سے بہت حد تک واقف سمجھے جاتے تھے، انہوں نے سر فضل حسین کے بارے میں جن خیالات کا اظہار اپنی کتاب" ہندوستانی انتشار" میں کیا ہے وہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے سر فضل حسین کے طریق سیاست کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

"بدقسمتی سے لارڈ ارون کو اپنی کونسل کے لیے جو ہندوستانی ممبر میسر آئے وہ بہت ہی معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔ سیاسی بصیرت سے محروم ہونے کے علاوہ انہیں ہندوستان کی سیاسی ترقی و تبدیلی کا بھی براہ راست کوئی علم نہ تھا۔ ان میں سے دو نے تو سائمن کمیشن کی تشکیل کے وقت وائسرائے کو صریحاً غلط مشورہ دے کر گمراہ کیا تھا۔

البتہ لارڈ ارون کی حکومت کے آخری دور میں سر فضل حسین نے جو بلاشبہ ہندوستان کے قابل ترین افراد میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وائسرائے کی کونسل کو اپنی شرکت کا اعزاز بخشا۔ فضل حسین کا رویہ عام ملکی اصلاحات کے بارے میں ہمدردانہ نہیں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ وائسرائے کی کونسل میں ان کی موجودگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ اس کام کے لیے وہ اصلاحات کے نفاذ کو بھی اس وقت تک ملتوی رکھنے کو تیار ہیں۔ جب تک مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ایک پونڈ سے بھی زیادہ گوشت کا مطالبہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں۔ ہندوستان میں یہ بات پایۂ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ سر فضل حسین اور ہندوستان کی سول سروس کے درمیان ایک واضح مفاہمت قائم ہے۔ جس کا

مدعا یہ ہے کہ سر فضل حسین سول سروس کی ہر آڑے وقت میں مدد کریں۔ اور اس کے معاوضے میں سول سروس والے مسلمانوں کے مطالبات کی تائید کریں گے۔ لندن کی گول میز کانفرنس میں غیر کانگرسی مسلمانوں نے جس یکجہتی اور نظم وضبط کا ثبوت دیا اور جس ہوشمندی اور تدبر سے اپنے مطالبات تسلیم کرلئے اسے دیکھ کر ان لوگوں کو، جن کی باگ ڈور براہِ راست فضل حسین کے ہاتھ میں تھی۔ بے اختیار مبارکباد کہنے کو جی چاہتا ہے۔ فضل حسین کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان میں اس وقت تک نئی اصلاحات رائج نہیں ہوسکیں گی۔ جب تک وہ مسلمانوں کو اس قدر مضبوط و منظم نہ کر دیں کہ وہ اپنی شرط منوانے کے قابل ہوسکیں۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ کہ سر فضل حسین اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی عوامی اور قومی تحریکوں سے دلچسپی رکھتے پھریں۔ میرا یقین ہے کہ وہ ان تحریکوں سے چشم پوشی ضرور کرتے ہیں۔ تاکہ حکومت میں ان کا وقار روز بروز بڑھتا رہے۔ اور وائسرائے اور وائٹ ہال یہ خیال کر کے ان کے ممنون ہوں۔ کہ انہوں نے اپنی زبردست شخصیت سے مسلمانوں کو حکومت کی وفاداری و خیر خواہی سے منحرف نہیں ہونے دیا۔ سر فضل حسین نے سول سروس سے جو مفاہمت کر رکھی ہے اس کی ابتدار لاہور میں ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ قوم پرست مسلمانوں کی تحریک کو کچلا جائے۔ مسلمانوں کے مطالبات کو شدومد سے پیش کیا جائے۔ اور آخر کار گول میز کانفرنس میں تہدید و تخویف کے حربوں سے ان مطالبات کو منوایا جائے۔

ظاہر ہے یہ سب کچھ دیکھ کر حکومت ہند کے رجعت پسند طبقے کا دل باغ باغ ہو جاتا ہوگا۔"

(THE INDIAN CHAOS F.R. WILSON. PAGES 81 + 11…)

سر فضل حسین کے اس طریق کار پر مزید روشنی علامہ اقبال نے بھی ایک تقریر کے دوران میں ڈالی تھی۔ یہ تقریر علامہ اقبال نے اس زمانے میں کی تھی، جب سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت سے سبکدوش ہو کر واپس لاہور پہنچے تھے۔ اور یونینسٹ پارٹی کی ازسرنو تشکیل کے منصوبے بنا رہے تھے، علامہ اقبال نے کہا تھا:

"یہ کس قدر افسوسناک امر ہے۔ کہ پنجاب میں شہری دیہاتی کا جو جھگڑا چل

رہا ہے اسے سر فضل حسین کی امداد حاصل ہے۔ فضل حسین کو ابتدا میں قیادت کا منصب اس لیے حاصل نہیں ہوا تھا۔ کہ وہ دیہاتی تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ صوبے کے مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ لیکن انہوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری، دیہاتی جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ اس طرح ان کا منصب بحال رہے اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بعض ایسے ناکارہ اور تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا۔ جو حکومت کے قطعاً اہل نہ تھے۔ اور جن میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ اس اقتدار اور وقار کو برقرار رکھ سکیں، جو وزارت کا لازمہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تیسرے درجے کے لوگ جو اپنے موجودہ عروج کے لیے فضل حسین کے ممنون ہیں۔ خود ادنیٰ صلاحیت کے مالک ہونے کے باعث فضل حسین کو گویا ایک فوق البشر سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حکومت کے بعض کارندوں نے بھی اس پالیسی کی حمایت کی۔ کیونکہ اس طرح وہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا زور توڑنے میں کامیاب ہو سکتے تھے، ان تمام اسباب و محرکات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں صحیح "لیڈر شپ" مفقود ہو چکی ہے اور سیاسی میدان چند درجہ نالائق مقدر آزماؤں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔"

(اقبال کے آخری دو سال صفحہ ۲۷۶-۲۷۷)

عام طور پر اس طریق سیاست کو صرف فضل حسین سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ طریق سیاست برطانوی شہنشاہیت کے زیر سایہ نشو و نما پانے والے زمیندار طبقے سے مخصوص تھا۔ اور تیس چالیس برس گزرنے کے بعد بھی یہ طبقہ قریب قریب اسی انداز سے سوچتا ہے اور عمل کرتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں مجلس احرار اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود عوام کو ابھار کر ان کو مختلف تحریکوں سے متاثر کر کے ان سے ووٹ لینے کے طریق پر گامزن تھی۔ چنانچہ اس کا طریق کار یہ تھا۔ کہ اپنے دشمنوں کے خلاف عوامی غیض و غضب کو ابھارا جائے

دشمنوں کی لوٹ ڈیٹ، عوام دشمنی اور کاسہ لیسی کو آشکارا کیا جائے۔ اب اس لڑائی میں مدِمقابل سر فضل حسین ضرور تھے لیکن سر فضل حسین کی ہمدردیاں احمدیوں کے ساتھ بھی تھیں۔ اس کی غالباً وجہ یہ تھی۔ کہ مسلمانوں میں یہ سب سے منظم فرقہ تھا جو سرکار پرست بھی تھا۔ اس لیے وہ سر فضل حسین کو ان کی سیاست میں خاصا کار آمد ہو سکتا تھا۔ اب احرار نے جب یہ گٹھ جوڑ دیکھا تو وہ بہت پریشان ہوئے اس لیے کہ مرزائیوں کا کردار وہ اس سے پہلے کشمیر کی تحریک کے دوران دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ ان کو یقین ہو گیا کہ سر فضل حسین پر براہِ راست حملے سے پہلے قادیانیوں پر حملہ کیا جاتے اور حملے کی زد میں سر فضل حسین کو لے آیا جائے۔

قادیانیوں کے خلاف مجلس احرار کی تحریک کو ایک مذہبی تحریک کے طور پر سمجھنے کی کوشش ہمیشہ کی جاتی رہی ہے۔ لیکن تمام تقدّس کے باوجود یہ مذہبی تحریکیں سیاسی اور اقتصادی تقاضوں، خواہشات اور ضرورتوں کیلئے اوپر کا خول ہوتی ہیں، کبھی یہ تحریکیں عوامی خواہشات کا مظہر بن جاتی ہیں۔ تو کبھی یہ بدترین قسم کے رجعت پسند طبقوں کے ہاتھ کا ہتھیار بن جاتی ہیں۔ چنانچہ خود احرار کے قائد بھی اس تحریک کے سیاسی تقاضوں کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکے، وہ لکھتے ہیں:

"مرزائیت میں اگر فاش خامیاں نہ بھی ہوتیں اور وہ غلط دعووں کا عبرت انگیز مرقع نہ بھی ہوتی۔ تو بھی نبوت کا دعویٰ بجائے خود اسلام پر ضرب کاری اور مسلمانوں میں انتشار عظیم پیدا کرنے کا سبب ہے۔ اس دعوے کے ساتھ ہی یہ گروہ مسلمانوں کی کڑی نگرانی کا سزاوار ہو جاتا ہے پس ہم نے دیکھا کہ مرزائی لوگ:

۱۔ برٹش امپیریلزم کے کھلے ایجنٹ ہیں۔

۲۔ وہ اعلیٰ طبقے کا ذہن رکھتے ہیں۔ ارد گرد کی غریب آبادی کا بائیکاٹ کرنا اور دوسرے ذریعوں سے انہیں مرعوب کرنا ان کا دھندا ہے۔

۳۔ وہ مسلمانوں میں ایک نئی گروہ بندی کے طلب گار ہیں۔ جو مسلمانوں کی جمعیت کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ دے گی۔

۴۔ وہ مسلمانوں میں بطور ففتھ کالم کام کرتے ہیں"۔

(تاریخ احرار صفحہ ۱۸۰)

کشمیر کی تحریک میں قادیانیوں کے رویے کے خلاف مجلس احرار پہلے ہی غیض وغضب سے بھری ہوئی تھی، اور اسی تحریک کے دوران میں علامہ اقبال کو بعض ذرائع سے کشمیر کمیٹی کے صدر اور سیکریٹری کی وائسرائے اور اعلیٰ برطانوی حکام کو خفیہ اطلاعات بہم پہنچانے کا بھی علم ہوا۔ اسی بنا پر انہوں نے کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مرزا بشیر الدین محمود کو الگ کروا دیا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے میں احمدی اپنی تنظیم اور طاقت کے نشے میں سرشار تھے اور قدم قدم پر اس کا اظہار وہ قادیان اور اس کے گردو نواح میں کر رہے تھے۔ قادیان کے اندر مظالم کی داستان کو خود اس وقت کے ضلع گورداسپور کے سیشن جج، جے ڈی کھوسلہ نے تسلیم کیا ہے۔ یہ وہی کھوسلہ ہیں۔ جو بھارت کے چیف جسٹس بھی رہ چکے ہیں۔ انہوں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف ایک مقدمہ کے فیصلے میں لکھا ہے:

> "قادیان کے ایک باشندے مسمّی غلام احمد نے دنیا کے سامنے یہ دعوےٰ پیش کیا کہ میں مسیح موعود ہوں اس اعلان کے ساتھ ہی اس نے اُسقفِ اعظم (لاٹ پادری) کی حیثیت بھی اختیار کر لی۔ اور ایک نئے فرقہ کی بنا ڈالی۔ جس کے ارکان اگرچہ مسلمان ہونے کے مدعی تھے، لیکن ان کے بعض عقائد و اصول عام عقائد اسلامی سے بالکل متبائن تھے۔ اس فرقہ میں شامل ہونے والے لوگ قادیانی یا مرزائی یا احمدی کہلاتے ہیں۔ اور ان کا ما بہ الامتیاز یہ ہے کہ یہ لوگ فرقہ مرزائیہ کے بانی (مرزا غلام احمد) کی نبوّت پر ایمان رکھتے ہیں۔ بتدریج یہ تحریک ترقی کرنے لگی۔ اور اس کے مقلدین کی تعداد چند ہزار تک پہنچ گئی۔ مسلمانوں کی طرف سے مخالفت ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی اکثریت نے مرزا کے دعاوی بلند بانگ خصوصاً اس کے دعاوی تفوق دینی پر بہت ناک منہ چڑھایا۔ اور مرزا نے ان لوگوں پر کفر کا جو الزام لگایا۔ اس کے جواب

میں لوگوں نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا۔ مگر قادیانی حصار میں رہنے والے اس بیرونی تنقید سے کچھ بھی متاثر نہ ہوئے اور اپنے مستقر یعنی قادیان میں مزے سے ڈٹے رہے۔

قادیانی مقابلتہً محفوظ تھے۔ اس حالت نے ان میں متمردانہ غرور پیدا کر دیا۔ انہوں نے اپنے دلائل دوسروں سے منوانے اور اپنی جماعت کو ترقی دینے کے لیے ایسے حربوں کا استعمال شروع کیا جنہیں ناپسندیدہ کہا جائے گا۔ جن لوگوں نے قادیانیوں کی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ انہیں مقاطعۂ قادیان سے اخراج اور بعض اوقات اس سے بھی مکروہ تر مصائب کی دھمکیاں دے کر دہشت انگیزی کی فضا پیدا کی۔ بلکہ بسا اوقات انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا کر اپنی جماعت کے استحکام کی کوشش کی۔ قادیان میں رضاکار کا ایک دستہ (والنٹیئر کور) مرتب ہوا۔ اور اس کی ترتیب کا مقصد غالباً یہ تھا۔ کہ قادیان میں لمن الملک الیوم کا نعرہ بلند کرنے کے لیے طاقت پیدا کی جائے۔ انہوں نے عدالتی اختیارات بھی اپنے ہاتھ میں لے لیے دیوانی اور فوجداری مقدمات کی سماعت کی۔ دیوانی مقدمات میں ڈگریاں صادر کیں۔ اور ان کی تعمیل کرائی گئی۔ کئی اشخاص کو قادیان سے نکالا گیا — یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ قادیانیوں کے خلاف کھلے ہوئے طور پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے مکانوں کو تباہ کیا۔ جلایا اور قتل تک کے مرتکب ہوئے۔ اس خیال سے کہ کہیں ان الزامات کو احرار کے تخیل ہی کا نتیجہ نہ سمجھ لیا جائے۔ میں چند ایسی مثالیں درج کر دینا چاہتا ہوں۔ جو مقدمہ کی مسل میں درج ہیں۔

کم از کم دو اشخاص کو قادیان سے اخراج کی سزا دی گئی۔ اس لیے کہ ان کے عقائد مرزا کے عقائد سے متفاوت تھے۔ وہ اشخاص حبیب الرحمان گواہ صفائی نمبر ۲۸۔ اور مسمی اسمٰعیل ہیں مسل میں ایک چھٹی (ڈی۔ زیڈ ۳۲) موجود ہے جو موجودہ مرزائی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور جس میں یہ حکم درج ہے۔ کہ حبیب الرحمٰن (گواہ نمبر ۲۸) کو قادیان آنے کی اجازت نہیں۔ مرزا بشیر الدین گواہ صفائی نمبر ۲ نے اس چھٹی کو تسلیم کر لیا ہے۔ کئی اور گواہوں نے (قادیانیوں کے) تشدد و ظلم کی عجیب و غریب داستانیں بیان کی ہیں۔ بھگت سنگھ گواہ صفائی نے بیان کیا ہے کہ

قادیانیوں نے اس پر حملہ کیا۔ایک شخص مسمی غریب شاہ کو قادیانیوں نے زدوکوب کیا۔لیکن جب اس نے عدالت میں استغاثہ کرنا چاہا۔تو کوئی اس کی شہادت دینے کے لیے سامنے نہ آیا۔ قادیانی ججوں کے فیصلہ کردہ مقدمات کی مسلیں پیش کی گئی ہیں (جو شامل مسل ہذا ہیں) مرزا بشیر الدین محمود نے تسلیم کیا ہے۔کہ قادیان میں عدالتی اختیارات استعمال ہوتے ہیں۔اور میری عدالت سب سے آخری عدالت اپیل ہے۔عدالت کی ڈگریوں کا اجرا عمل میں آتا ہے اور ایک واقعہ سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ڈگری کے اجرا میں ایک مکان فروخت کر دیا گیا۔ اسٹامپ کے کاغذ قادیانیوں نے خود بنا رکھے ہیں۔جو ان درخواستوں اور عرضیوں پر لگائے جاتے ہیں۔جو قادیانی عدالتوں میں دائر ہوتی ہیں۔قادیان میں ایک والنیٹر کور کے موجود ہونے کی شہادت گواہ نمبر ۴ مرزا شریف احمد نے دی ہے۔

سب سے سنگین معاملہ "عبدالکریم ایڈیٹر مباہلہ" کا ہے۔جس کی داستان' داستان درد ہے۔یہ شخص مرزا کے مقلدین میں شامل ہوا۔اور قادیان میں جاکر مقیم ہوگیا۔وہاں اس کے دل میں (مرزائیت کی صداقت کے متعلق) شکوک پیدا ہوئے۔اور وہ مرزائیت سے تائب ہو گیا اس کے بعد اس پر ظلم و ستم شروع ہوا۔اس نے قادیانی معتقدات پر تبصرہ و تنقید کرنے کے لیے "مباہلہ" نامی اخبار جاری کیا۔مرزا بشیر الدین محمود نے ایک تقریر میں جو دستاویز ڈی۔ زیڈ (الفضل یکم اپریل ۱۹۳۰ء میں درج ہے) مباہلہ شائع کرنے والوں کی موت کی پیش گوئی کی ہے۔اس تقریر میں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو مذہب کے لیے ارتکاب قتل پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔اس تقریر کے بعد جلد ہی عبدالکریم پر قاتلانہ حملہ ہوا۔لیکن وہ بچ گیا۔ایک شخص محمد حسین جو اس کا معاون تھا۔اور ایک فوجداری مقدمہ میں جو عبدالکریم کے خلاف چل رہا تھا اس کا ضامن بھی تھا۔اس پر حملہ ہوا اور قتل کر دیا گیا۔قاتل پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا کا حکم ملا۔پھانسی کے حکم کی تعمیل ہوئی۔اور اس کے بعد قاتل کی لاش قادیان لائی گئی اور اسے نہایت عزت و احترام سے بہشتی مقبرہ میں دفن کیا گیا۔مرزائی اخبار "الفضل" میں قاتل کی مدح سرائی کی گئی قتل کو سراہا گیا۔اور یہاں تک لکھا گیا کہ قاتل مجرم نہ تھا۔پھانسی کی سزا سے پہلے

ہی اس کی رُوح قفسِ عنصری سے آزاد ہوگئی اور اس طرح وہ پھانسی کی ذلت انگیز سزا سے بچ گیا۔ خدائے عادل نے یہ مناسب سمجھا کہ پھانسی سے پہلے ہی اس کی جان قبض کرلے۔

عدالت میں مرزا محمود نے اس کے متعلق بالکل مختلف داستان بیان کی۔ اور کہا کہ محمد حسین کے قاتل کی عزت افزائی اس لیے کی گئی کہ اس نے اپنے جرم پر تاسف و ندامت کا اظہار کیا تھا۔ اور اس طرح وہ گناہ سے پاک ہوچکا تھا لیکن دستاویز ڈی۔ زیڈ ۴۰ اس کی تردید کرتی ہے۔ جس سے مرزا کی دلی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

میں یہاں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس دستاویز کے مضمون سے عدالتِ عالیہ لاہور کی توہین کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

محمد امین ایک مرزائی تھا۔ اور جماعت مرزائیہ کا مبلغ تھا۔ اس کو تبلیغ مذہب کے لیے بخارا بھیجا گیا۔ لیکن کسی وجہ سے بعد میں اسے اس خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس کی موت کلہاڑی کی ایک ضرب سے ہوئی۔ جو چودھری فتح محمد گواہ صفائی نمبر۲۱ نے لگائی۔ عدالت ماتحت نے اس معاملہ پر سرسری نگاہ ڈالی ہے۔ لیکن یہ زیادہ غور و توجہ کا محتاج ہے۔ محمد امین پر مرزا کا عتاب نازل ہوچکا تھا۔ اور اس لیے مرزائیوں کی نظر میں وہ موقر و مقتدر نہیں رہا تھا۔ اس کی موت کے واقعات خواہ کچھ ہوں۔ اس میں کلام نہیں کہ محمد امین تشدد کا شکار ہوا۔ اور کلہاڑی کی ضرب سے قتل کیا گیا۔ پولیس میں وقوعہ کی اطلاع پہنچی لیکن کوئی کارروائی عمل میں نہ آئی۔ اس بات پر زور دینا فضول ہے کہ قاتل نے حفاظت خود اختیاری میں محمد امین کو کلہاڑی کی ضرب لگائی۔ اور یہ فیصلہ کرنا اس عدالت کا کام ہے۔ جو مقدمہ قتل کی سماعت کرے۔ چودھری فتح محمد کا عدالت میں باقرارِ صالح یہ بیان کرنا تعجب انگیز ہے۔ کہ اس نے محمد امین کو قتل کیا مگر پولیس اس معاملہ میں کچھ نہ کر سکی۔ جس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مرزائیوں کی طاقت اس حد تک بڑھ گئی تھی۔ کہ گواہ سامنے آکر سچ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے سامنے عبدالکریم کے مکان کا واقعہ بھی ہے کہ عبدالکریم کو قادیان سے خارج کرنے کے بعد اس کا مکان نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اور قادیان کی سمال ٹاؤن کمیٹی سے حکم حاصل کر کے نیم قانونی طریق

پر اسے گرانے کی کوشش کی گئی۔

یہ افسوسناک واقعات اس بات کی منہ بولتی شہادت ہیں، کہ قادیان میں قانون کا احترام بالکل اُٹھ گیا تھا۔

آتشزنی اور قتل تک کے واقعات ہوتے تھے۔ مرزا نے کروڑوں مسلمانوں کو جو اس کے ہم عقیدہ نہ تھے۔ شدید دشنام طرازی کا نشانہ بنایا اس کی تصانیف ایک اسقف اعظم کے اخلاق کا انوکھا مظاہرہ ہیں۔ جو صرف نبوت کا مدعی نہ تھا۔ بلکہ خدا کا برگزیدہ انسان اور مسیح ثانی ہونے کا بھی مدعی تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ (قادیانیت کے مقابلے میں) حکام غیر معمولی حد تک مفلوج ہو چکے تھے۔ دینی و دنیوی معاملات میں مرزا کے حکم کے خلاف کبھی آواز بلند نہیں ہوئی۔ مقامی افسروں کے پاس کئی مرتبہ شکایت پیش ہوئی۔ لیکن وہ اس کے انسداد سے قاصر رہے۔ مسل پر کچھ اور شکایات بھی ہیں، لیکن یہاں ان کے مضمون کا حوالہ دینا غیر ضروری ہے۔ اس مقدمہ کے سلسلے میں صرف یہ بیان کر دینا کافی ہے۔ کہ قادیان میں جور و ستم رانی کا دَور دورہ ہونے کے متعلق نہایت واضح الزامات دیئے گئے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قطعاً کوئی توجہ نہ ہوئی۔ (تاریخ احرار صفحہ ۱۸۶ تا ۱۹۰)

یہ درست ہے کہ احمدیہ جماعت کے مظالم قادیان اور اس کے گرد و نواح میں بہت بڑھ گئے تھے۔ اور یہ مظالم کی زیادتی بذات خود احرار کی قادیان مخالف تحریک کی مقبولیت کی ایک وجہ بنی۔ قرائن یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس وقت قادیانیوں کی تنظیم نے ان میں ایک گونہ غرور اور بدمستی پیدا کر دی تھی، اور وہ اپنے کو قانون سے بالا سمجھنے لگ گئے تھے بالخصوص چودھری ظفر اللہ کی وائسرائے کی کونسل میں شمولیت نے طاقت کے اس نشے میں اور زیادہ اضافہ کیا۔ چنانچہ اس عمل نے خود حکومت کے اہلکاروں اور افسران میں بھی ایک گونہ ردِ عمل پیدا کیا ہوگا۔ اور نظم و نسق کی مشینری احمدیوں کی تمام وفاداریوں کے باوجود حرکت میں آنی شروع ہو گئی ہوگی کیونکہ اس زمانے کے امیر جماعت احمدیہ کے بعض خطبات اس دَور کی صورتحال

ظاہر کرتے ہیں :

"پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ احمدیوں کے ساتھ ہے۔ اس خیال کی وجہ سے کئی لوگ ہم پر ظلم کرنے سے رُکے ہوئے تھے۔ اور یہ صورت حالات اتنی واضح تھی، کہ حکومت پنجاب کے ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کے افسر نے چودھری ظفر اللہ خاں صاحب سے جب کہ وہ ابھی حکومت ہند میں نہیں گئے تھے کہا کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ حکومت آپ کی حمایت یا کسی قسم کی رعایت کرنے کے لیے تیار نہیں تو آپ کو اس سے کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے"۔

(الفضل قادیان نمبر ۳۱ جلد ۲۳۔ ۶ راگست ۱۹۳۵ء)

"دوسری بات جو پہلے نہ تھی وہ حکام وقت کا موجودہ رویہ ہے پہلے ہمارے دشمنوں کو کبھی کبھی سرکاری افسران کی طرف سے چشم نمائی بھی ہو جاتی تھی اور اس طرح وہ اپنی شرارتوں میں نہ حد سے گزرتے اور نہ شرارتوں کا سلسلہ کسی نظام میں زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکتا تھا لیکن اب مخالفت کی تنظیم سے گورنمنٹ بھی دب گئی ہے"۔ (ضمیمہ الفضل قادیان ۱۹ ستمبر ۱۹۳۵ء)

"گورنمنٹ نے ایک خفیہ سرکلر جاری کیا جو قریباً تمام ضلعوں کے ڈپٹی کمشنروں کے نام بھیجا گیا۔ کہ جماعت احمدیہ کی حالت گورنمنٹ کی نگاہ میں مشتبہ ہے۔ اس لیے اس کے افراد کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ سرکلر تمام ضلعوں کے ڈپٹی کمشنروں کو یا اکثر اضلاع کے "ڈپٹی کمشنرں کو بھیجا گیا۔ کیونکہ متفرق جگہوں سے اس سرکلر کی تصدیق ہوئی ہے۔ میں نام نہیں لے سکتا لیکن ایک جگہ سے تو اس سرکلر کے الفاظ تک ہمیں معلوم ہو گئے تھے' اب اگر گورنمنٹ کے بعض افسروں کے خیالات میں تبدیلی بھی ہو گئی ہے۔ تو چونکہ حکومت کی طرف سے سرکلر جاری ہو چکا ہے اس لیے بالعموم افسر اس سرکلر کا خیال رکھیں گے۔ اور ملازمتوں اور ٹھیکوں وغیرہ میں ہماری جماعت کے افراد کے حقوق کو پامال کیا جائے گا۔ چنانچہ بعض جگہ ایسا ہوا بھی ہے کہ بعض احمدی

جو اچھے قابل تھے، ان کے حقوق کو افسران بالا کی طرف سے نظر انداز کر دیا گیا۔ جو پہلے حالات کے لحاظ سے ناممکن تھا۔"

(الفضل قادیان ۱۳ نومبر ۱۹۳۵ء)

"اسی طرح مجھے شملہ سے ایک خط آیا ہے کہ ہماری جماعت کے ایک معزز رکن ایک ذمہ دار انگریز افسر سے ملنے گئے۔ اس افسر نے کہا آئیے کیسے آئے انہوں نے کہا آپ ہمارے دوست ہیں، اس لیے ملنے آگیا۔ اس افسر نے کہا کہ یہ صحیح ہے میں آپ کا دوست تھا۔ مگر معلوم نہیں آئندہ بھی ایسا رہ سکوں گا یا نہیں ۔۔۔۔۔ اسی طرح انگلستان سے خطوط آئے ہیں۔ ان میں ایسی رپورٹوں کا ذکر ہے جن میں بلا وجہ ہم پر الزام تراشے گئے ہیں۔"

(الفضل قادیان ۱۹ ستمبر ۱۹۳۵ء)

"اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ بات کھول دی کہ کسی انسان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے اور یہ کہ جن کی جانیں بچانے کے لیے ہم اپنی جانیں پچاس سال تک قربان کرتے رہے جن کی عزتیں بچانے کے لیے ہم پچاس سال تک اپنی عزتیں قربان کرتے رہے ان پر بھی ہمارا اعتماد کرنا سخت غلطی ہے ہمیں یہ جو اطمینان تھا کہ پُرامن حکومت ہے اور شریف لوگوں کی حکومت ہے گو ہمارا یہ خیال صحیح تھا۔ اور میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں۔ کہ صحیح ہے۔ مگر پھر بھی ہمارا یہ اطمینان صحیح نہ تھا۔" (الفضل قادیان ۱۲ جون ۱۹۳۵ء)

"روم کی حکومت نے حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر لٹکا دیا۔ مگر وہ مسیحیت کو نہ مٹا سکی۔ اسی طرح انگریز مجھے سولی پر لٹکا سکتے ہیں۔ تم میں سے ہر ایک کو لٹکا سکتے ہیں۔ ہم کو قید کر سکتے ہیں۔ مگر انگریزوں اور دنیا کی سب حکومتوں سے بھی یہ ممکن نہیں کہ احمدیت کو مٹا سکیں۔"

(الفضل قادیان ۱۲ جون ۱۹۳۵ء)

آگے چل کر خود میاں محمود احمد خلیفہ قادیان نے اس عوامی ابھار کا اچھا نقشہ کھینچا ہے

ملاحظہ ہو:

"اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے ماتحت اور جماعت احمدیہ کے مخلصین کے اخلاص کو اور بھی زیادہ ظاہر کرنے کے ارادے سے نئے نئے لوگوں کو ہمارے مخالفوں کی صف میں لا کر کھڑا کر رہا ہے۔ پہلے احراری اُٹھے اور انہوں نے یہ دعوےٰ کیا کہ وہ ایک منظم صورت میں جماعت احمدیہ کو کچلنا چاہتے ہیں، پھر امراء ان کی جماعت میں شامل ہو گئے اور ذاتی رسوخ اور ذاتی فوائد کے حصول کے لیے اور بعض افراد سے ذاتی بغض و عناد نکالنے کے لیے انہوں نے احرار کی مدد کرنی شروع کر دی، پھر پیروں، گدی نشینوں، اور اخبار نویسوں کی ایک جماعت ان کے اندر شامل ہو گئی انہوں نے اس جنگ کو اخباروں اور تقریروں کے ذریعے سے ملک کے ایسے گوشوں اور کونوں میں پہنچانا شروع کر دیا۔ جہاں تک اس کا پہنچنا پہلے محال نظر آتا تھا۔ اس جوش و خروش کو دیکھ کر وہ منافقین کی جماعت جو ہمیشہ سے انبیاء کی جماعتوں کے ساتھ اسی طرح لگی رہی ہے۔ جیسے کھیتوں میں چوہے، اس نے بھی اپنا سر نکالا اور خیال کیا کہ او ہو! آج خوب موقع ہے۔ آؤ ہم بھی انہیں بتائیں کہ ہم کچھ بہادری کر سکتے ہیں، پس وہ منافق بھی چوہوں کی طرح اِدھر اُدھر بِل کھودنے لگ گئے اور سر نکال کر اپنے وجود کا ثبوت دینے لگے۔

جمعیت العلماء اس وقت تک خاموش تھی۔ کیونکہ اس کے لیڈروں کو احراریوں کے سرگروہ لوگوں سے بغض و عناد ہے۔ مگر جب اس نے دیکھا۔ کہ یہ مسئلہ خاص طور پر اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد کی توجہ اس طرف ہے تو اس نے خیال کیا۔ ایسا نہ ہو جماعت احمدیہ کو کچلنے کا سہرا احراریوں کے سر رہے۔ پس اس نے بھی اعلان کر دیا کہ مسلمانان عالم کے سامنے اس وقت سب سے بڑا فتنہ جماعت احمدیہ کا ہے۔ اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس کا استیصال کریں۔ جب اس زور شور سے اغیار نے جماعت احمدیہ کا مقابلہ ہوتے دیکھا۔ تو ان میں سے آریہ سماج کے اخبار بھلا کہاں خاموش رہ سکتے تھے۔ وہ بھی اُٹھے اور ہماری جماعت کی مخالفت میں لگ گئے، قادیان کے آریہ اور سکھ بھی ان میں شامل ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔ ہندوستان کے سیاسی لیڈر ابھی تک خاموش تھے، بلکہ کہنا چاہیئے کہ ان کا معتدبہ حصہ یہ کہہ رہا تھا۔ کہ ہمیں فتنہ و فساد اور آپس کے تفرقہ سے بچنا چاہیئے۔ اسی طرح

اعلیٰ عہدہ دار خاموش تھے یا کم از کم ظاہر میں خاموش تھے' لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ طوفان مخالفت فرو ہونے میں نہیں آتا' اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم پیچھے کیوں رہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ سر مرزا ظفر علی صاحب نے ایک بیان شائع کر دیا۔ پھر ڈاکٹر سر اقبال کو خیال آ گیا کہ میں کیوں پیچھے رہوں۔ اور اب آخر میں علامہ عبد اللہ یوسف علی صاحب جو ہمیشہ ان باتوں سے الگ رہتے تھے' بول پڑے اور سمجھا کہ اسلامیہ کالج کا پرنسپل ایسی باتوں میں کیوں دخل نہ دے اور کس لیے جماعت احمدیہ کے خلاف اپنی رائے کا اظہار نہ کرے پھر اس موقعہ سے عیسائیوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور وہ بھی ہمارے مخالفین کی صف میں شامل ہو گئے۔ غرض ہر قوم نے آج چاہا کہ ہمیں کچل دے' ایک طرف دنیا کی تمام طاقتیں جمع ہیں۔ احراری بھی ہیں' پیرزادے بھی ہیں' جمعیت علماء بھی ہے' اہلحدیث بھی ہیں' دیوبندی بھی ہیں' قادیان کے منافق بھی ہیں۔ اور قادیان کے بعض آریہ سماجی اور سکھ بھی ہیں' پھر آریہ اخبارات بھی ہیں۔ پادری بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ شاعر اور فلاسفر بھی ان کے ساتھ ہیں' سیاستدان بھی ان کے ساتھ ہیں' اور حکومت بھی اپنا زور ان کی تائید میں خرچ کر رہی ہے۔ گویا دنیا اپنی تمام طاقتیں احمدیت کے کچلنے پر صرف کرنے کے لیے آمادہ ہو رہی ہے۔

ہمارے خیر خواہ مسلمانوں میں سے بعض اور دوسری قوموں میں سے کئی دفعہ کہلوا چکے ہیں کہ ان شدید مخالفت کے ایام میں میں' خاموش رہوں۔ مگر مجھے مداہنت کی ضرورت نہیں۔ میں تمام مخالفوں اور ان کے ہمنواؤں کو حضرت نوح علیہ السلام کے الفاظ میں ہی کہتا ہوں' تم سارے مل جاؤ اور اپنی تمام تدابیر احمدیت کو کچلنے کے لیے اختیار کرو' قادیان کے ان منافقوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لو۔ جو کھلم کھلا تمہاری تائید کر رہے ہیں۔ اور ان منافقوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لو' جو نمازیں پڑھتے روزے رکھتے اور جماعت کے دیگر کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ مگر اپنی پرائیویٹ مجلسوں میں (قادیانی) سلسلے کے نظام پر ہنسی اڑاتے ہیں۔ اور اس کی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں۔ تم سارے مل جاؤ اور دن اور رات منصوبے کرو' اور اپنے منصوبوں کو کمال تک پہنچا دو اور اپنی ساری طاقتیں جمع کر کے احمدیت کو مٹانے کے لیے تُل جاؤ۔ یاد رکھو تم سب کے سب ذلیل و رسوا ہو کر مٹی میں مل جاؤ گے۔"

(الفضل قادیان ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء)

خود قادیانی جماعت کے خود دار لوگ قادیانی استبداد سے بیزار ہو چلے تو خلیفہ صاحب نے منافقوں کے نام سے ان پر بھی خوب لے دے کی، چنانچہ ملاحظہ ہو:

"ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہاں کے بعض منافق بھی تیس مار خاں بننے لگے ہیں، کچھ تو علی الاعلان ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اور کچھ یہ طاقت تو نہیں رکھتے اس لیے علیحدہ علیحدہ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ کہ ہم سے کسی کو جماعت سے نکالیں تو سہی، ہم ایک جماعت ہیں۔۔۔۔۔ منافق دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ لوگ ہیں، جو روپیہ یا عزت کی خاطر افسروں کو جا کر غلط باتیں بتاتے ہیں۔ اور ایک وہ ہیں جو احرار سے ملتے ہیں۔ یہ بے غیرت اور بے شرم کہلاتے تو احمدی ہیں۔ مگر ملتے ان لوگوں سے ہیں۔ جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو گالیاں دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو گالیاں دینا کوئی بات ہی نہیں اور میری مخالفت کے لیے وہ اسے برداشت کرنے کو تیار ہیں۔۔۔۔۔ مجھے ایسے لوگوں کے نام بھی معلوم ہیں۔ لیکن جیسا کہ میرا اصول ہے میں چاہتا ہوں کہ ان کو اصلاح کا کافی موقعہ دیا جائے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب تک شہادت شرعی موجود نہ ہوئیں شرعی سزا نہیں دیا کرتا۔"

(الفضل قادیان ۱۲ جون ۱۹۳۵ء)

بالآخر خلیفہ صاحب قادیان نے حکومت کو مسلمانوں کو اور خود اپنے نام نہاد منافقوں کو کھلا چیلنج دے دیا۔ جو اعلان جنگ سے کم نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

"حکومت سے کہہ دو کہ ہم خیر خواہ اور امن پسند ضرور ہیں۔ مگر یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ سلسلہ کی عزت کو کم کیا جائے۔ ادب سے لیکن کھول کر حکومت کو یہ سنا دو کہ ہم سے یہ امید نہ رکھی جائے کہ ہم سلسلہ کی بے عزتی حکام کے ہاتھوں ہوتی دیکھیں اور پھر بھی جی ہاں جی ہاں کہتے ہوئے سر جھکائے رکھیں، ہم سے یہ کبھی نہ ہو سکے گا۔"

"مسلمانوں سے کہہ دو کہ تمہارے لیے ہم ہمیشہ قربانی کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ لیکن یہ کبھی نہ ہوگا۔ کہ احمدیت میں اس وجہ سے کوئی کمزوری آنے دیں، جس دن تم احمدیت کے خلاف تلوار اٹھاؤ گے۔ اسی دن بس دو ہی صورتیں ہمیں مطمئن کرسکیں گی یا تو تم ایمان لے آؤ یا پھر یہ کہ پیٹھ دکھا کر بھاگ جاؤ۔ منافقوں کو اچھی طرح سن لینا چاہیئے کہ ان کے بارے میں ہم کوئی نرمی یا کمزوری اختیار نہیں کریں گے۔ ان کا ہم سنگ دل انسان کی طرح مقابلہ کریں گے۔ اور ان کی تباہی ہمارے لیے عید کا دن ہوگا۔"

(الفضل قادیان ۱۲ جون ۱۹۳۵ء)

لیکن سب سے زیادہ قادیانی صاحبان جمعیت احرار سے ناراض ہیں، چنانچہ خلیفہ صاحب نے ان کو بھی چیلنج دیا۔ پیشگوئی کے اسباب تو جلد ظاہر ہو گئے۔ لیکن پیشگوئی کا مقصد حاصل نہ ہوسکا چنانچہ ملاحظہ ہو:

"آج ہمیں احرار سے بھی یہ کہہ دینا چاہیئے کہ ہم نرم طبائع رکھتے ہیں۔ فسادی نہیں ہیں۔ لیکن تمہاری ایک ایک قربانی کے مقابلہ میں ہم دس دس پیش کر کے بھی خوش نہیں ہوں گے۔ ہم اس وقت تک آرام کا سانس نہیں لیں گے۔ جب تک کہ تم لوگ یا تو یہ نہ کرلو اور یا پھر تمہارے نظام کو ہم دنیا سے فنا نہ کر دیں اور تمہاری پارٹی کو توڑ نہ دیں، ہمارے آرام کی اب دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم مومن بن جاؤ۔ اور دوسری یہ کہ تم پراگندہ ہو جاؤ۔"

(الفضل قادیان ۱۲ جون ۱۹۳۵ء)

یہ تھی ۱۹۳۴ء کے بعد سے صورت حال لیکن احمدیت کے مخالف یہ تحریک ۱۹۳۴ء میں اس شدت سے ابھری جیسے کئی دہائیوں کا رکا ہوا پانی سیلاب کی مانند موج در موج چاروں سمت سے پھیل رہا ہو۔ یہ ایسا سیلاب تھا۔ جو سالہا سال پہلے سے شروع ہوا لیکن اس کا زور آج بھی کم نہیں ہو رہا بلکہ وہ وقفوں کے بعد عام مسلمانوں کو ایک نہ ایک حد تک متاثر کرتا رہتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے، اس احمدیت کا کیا پس منظر ہے

کیوں اس تحریک نے جہاں چند لاکھ شیدائی پیدا کیے وہاں کروڑوں کو متنفر کیوں کیا۔ اور یہ نفرت کے سوتے خود مرزا غلام احمد کے زمانے میں اس شدت سے کیوں نہیں پھوٹے یہ نفرت کی شدت ایک عوامی تحریک کی صورت کیسے اختیار کر گئی؟ اور وہ بھی مرزا صاحب کی وفات کے ربع صدی بعد' ان سوالوں کے جواب ٹھنڈے دل سے سوچنے چاہئیں۔ ۱۹۵۳ء میں جسٹس منیر اور جسٹس کیانی پر مشتمل جو تحقیقاتی عدالت احمدیوں کے مخالف چلنے والی تحریک کے بارے میں اسباب و وجوہ تلاش کرنے کے لیے قائم ہوئی تھی اس نے بڑی جانفشانی سے مختلف اسباب و علل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود ایک تو اس عدالت کا دائرہ کار بہت محدود تھا۔ اس کو صرف ۱۹۵۳ء میں ہونے والے فسادات کا پس منظر تلاش کرنا تھا۔ اس کے ذمہ داروں کی نشاندہی کرنی تھی۔ ظاہر ہے پچھلے ۵۰ برس یا ۳۰ برس کے واقعات اور رجحانات کی چھان پھٹک اس کے دائرہ کار سے باہر تھی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ تحقیقاتی کمیٹی ایک حد تک اس قضیے کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے میں ناکام رہی' اور وہ اس پوری تحریک کو مجلس احرار کی تخلیق سمجھتی رہی۔ جس کے قائدین نے اپنی شعلہ بیانی سے اس چنگاری کو شعلہ جوالا بنا دیا۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتی کہ یہ چنگاری آئی کہاں سے؟ جس میں اتنی تاب تھی' کہ ایک معمولی جماعت نے اسے اپنے دامن سے ہوا دے کر ایسا شعلہ جوالا بنا دیا جو خرمن امن کو بار بار تباہ کرنے کا یارا رکھتی ہو۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ احمدیہ تحریک کو اس کے صحیح سیاسی و سماجی پس منظر میں دیکھا جائے۔

مرزا غلام احمد کا زمانہ

مرزا غلام احمد کی پیدائش کی تاریخ کے متعلق وثوق سے تو نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ بات طے ہے کہ وہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے آخری سالوں میں پیدا ہوئے' مرزا صاحب کے صاحبزادے مرزا بشیر احمد نے اپنے والد کی دستاویزات اور خاندانی حالات سے جو نتائج اخذ کیے ہیں اور جو تحقیق کی ہے اس کے مطابق مرزا غلام احمد کا سال پیدائش ۱۸۳۵ء ہے یعنی رنجیت سنگھ کی موت سے ۴ برس پہلے اور تاریخ پیدائش ۱۲ فروری بتائی جاتی ہے۔ بہرحال

کوئی بھی تاریخ ہو ایک بات طے ہے کہ مرزا صاحب کا بچپن سکھوں کے آخری دَور میں گزرا ہے۔ اور انہوں نے سکھوں کی حکومت کی آخری ہچکیوں کو محسوس کیا اور سکھوں کی حکومت کے آخری سالوں میں جو بدامنی اور بے یقینی کی فضا پیدا ہوئی اس کی چھاپ مرزا صاحب پر یقینی طور پر پڑی ہوگی اس لیے جب انگریزی حکومت پنجاب میں آئی اور پنجاب پوری طرح سرنگوں ہوگیا۔ تو اس وقت مرزا غلام احمد کی عمر ۱۴ برس کی تھی، چنانچہ اکثر مسلمانوں کی طرح مرزا صاحب کے خاندان نے بھی انگریزوں کو خوش آمدید کہا کیونکہ اس وقت حب الوطنی کے یہ تقاضے نہ تھے جو آج ہیں اس وقت سب سے بڑا معیار ایک مرکزی حکومت کا وجود تھا جو عامۃ الناس بالخصوص زمینداروں کے جان و مال کی حفاظت کرسکتی ہو۔ چنانچہ اس لحاظ سے پنجاب کو اور بالخصوص مسلمانوں کو ایک مدت ہائے مدید کے بعد ایک ایسی حکومت میسر آئی تھی جو مضبوط بھی تھی۔ اور جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دینے کے بھی قابل تھی۔

مرزا صاحب کو شروع دن سے ہی سکھوں کے مظالم کا پورا پورا احساس تھا اور غالباً ان کو اُن مظالم کے خلاف جذبہ اپنے خاندان سے ورثہ میں ملا ہوگا۔ کیونکہ بقول مرزا صاحب کے ان کے خاندان کو سکھوں کے ہاتھوں خاصے مظالم سہنے پڑے تھے، وہ اس ضمن میں اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں، یہ ابتدائی سوانح انہوں نے اپنی کتاب البریہ کے حاشیوں میں لکھی ہے، ان حاشیوں میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:

”سکھوں کے ابتدائی زمانے میں میرے دادا مرزا گل محمد ایک نامور اور مشہور رئیس اس نواح کے تھے، جن کے پاس اس وقت پچاسی گاؤں تھے۔ اور بہت سے گاؤں سکھوں کے متواتر حملوں کی وجہ سے ان کے قبضہ سے نکل گئے۔ تاہم ان کی جوانمردی اور فیاضی کی یہ حالت تھی، کہ اس قدر قلیل میں سے بھی کئی گاؤں انہوں نے مروّت کے طور پر بعض تفرقہ زدہ مسلمان رئیسوں کو دے دیتے تھے، جو اب تک ان کے پاس ہیں، غرض وہ اس طوائف الملوکی کے زمانے میں اپنے نواح میں ایک خودمختار رئیس تھے۔ ہمیشہ قریب پانچسو آدمی کے کبھی کم اور کبھی زیادہ ان کے دسترخوان پر روٹی کھاتے تھے اور ایک سو

کے قریب علما اور صلحا اور حافظ قرآن شریف کے ان کے پاس رہتے تھے، جن کے کافی وظیفے مقرر تھے۔ اور ان کے دربار میں اکثر قال اللہ اور قال الرسول کا ذکر بہت ہوتا تھا اور تمام ملازمین اور متعلقین میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو تارک نماز ہو۔ یہاں تک کہ چکی پیسنے والی عورتیں بھی پنجوقتہ نماز اور تہجد پڑھتی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ اس پر آشوب زمانہ میں ہر ایک مسلمان کے لیے یہ قصبہ مبارک پناہ کی جگہ تھی۔ اور دوسری اکثر جگہ میں کفر اور فسق اور ظلم نظر آتا تھا اور قادیان میں اسلام اور تقویٰ اور طہارت اور عدالت کی خوشبو آتی تھی، میں نے خود اس زمانہ سے قریب زمانہ پانے والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اس قدر قادیان کی عمدہ حالت بیان کرتے تھے۔ کہ گویا وہ اس زمانہ میں ایک باغ تھا جس میں حامیان دین اور صلحا اور علما اور نہایت شریف اور جوانمرد آدمیوں کے صدہا پودے پائے جاتے تھے۔ اور اس نواح میں یہ واقعات مشہور ہیں کہ مرزا گل محمد صاحب مرحوم مشائخ وقت کے بزرگ لوگوں میں سے اور صاحب خوارق و کرامات تھے، جن کی صحبت میں رہنے کے لیے بہت سے اہل اللہ اور صلحا اور فضلا قادیان میں جمع ہو گئے۔ غرض وہ علاوہ ریاست اور امارت کے اپنی دیانت اور تقویٰ اور مردانہ ہمت اور اولوالعزمی اور حمایت دین اور ہمدردی مسلماناں کی صفت میں نہایت مشہور تھے۔ میرے پردادا صاحب موصوف یعنی مرزا گل محمد نے ہچکی کی بیماری سے جس کے ساتھ اور عوارض بھی تھے وفات پائی۔ بیماری کے غلبہ کے وقت اطبا نے اتفاق کر کے کہا کہ اس مرض کے لیے اگر چند روز شراب کو استعمال کرایا جائے۔ تو غالباً اس سے فائدہ ہوگا۔ مگر جرأت نہیں رکھتے تھے کہ ان کی خدمت میں عرض کریں۔ آخر بعض نے ان میں سے ایک نرم تقریر میں عرض کر دیا۔ تب انہوں نے کہا کہ اگر خدا تعالےٰ کو شفا دینا منظور ہوگی۔ تو اس کی پیدا کردہ اور بھی بہت سی دوائیں ہیں، میں نہیں چاہتا کہ اس پلید چیز کو استعمال کروں اور میں خدا کے قضا و قدر پر راضی ہوں۔ آخر چند روز کے بعد اسی مرض سے انتقال فرما گئے۔ موت تو مقدر تھی، مگر ان کا یہ طریق تقویٰ ہمیشہ کے لیے یادگار رہا۔ کہ موت کو شراب پر اختیار کر لیا۔ موت سے بچنے کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ لیکن انہوں نے

معصیت کرنے سے موت کو بہتر سمجھا۔ اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب میرے پردادا صاحب فوت ہوئے تو بجائے ان کے میرے دادا صاحب یعنی مرزا عطا محمد فرزند رشید، ان کے گدی نشین ہوئے۔ ان کے وقت میں خدا تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت سے لڑائی میں سکھ غالب آئے دادا صاحب مرحوم نے اپنی ریاست کی حفاظت کے لیے بہت تدبیریں کیں۔ مگر جبکہ قضاو قدر ان کے ارادہ کے موافق نہ تھی، اس لیے ناکام رہے۔ اور کوئی تدبیر پیش نہ گئی۔ اور روز بروز سکھ لوگ ہماری ریاست کے دیہات پر قبضہ کرنے لگے یہاں تک کہ دادا صاحب مرحوم کے پاس صرف ایک قادیان رہ گیا اور قادیان اس وقت ایک قلعہ کی صورت پر قصبہ تھا۔ اور اس کے چار برج تھے۔ اور برجوں میں فوج کے آدمی رہتے تھے۔ اور چند توپیں تھیں، اور فصیل بائیس فیٹ کے قریب اونچی اور اس قدر چوڑی تھی کہ تین چھکڑے آسانی سے ایک دوسرے کے مقابل اس پر جا سکتے تھے۔ اور ایسا ہوا کہ ایک گروہ سکھوں کا جو رام گڑھیہ کہلاتا تھا۔ اوّل فریب کی راہ سے اجازت لے کر قادیان میں داخل ہوا اور پھر قبضہ کر لیا اس وقت ہمارے بزرگوں پر بڑی تباہی آئی، اور اسرائیلی قوم کی طرح وہ اسیروں کے مانند پکڑے گئے۔ اور ان کے مال و متاع سب لوٹی گئی۔ کئی مسجدیں اور عمدہ عمدہ مکانات مسمار کیے گئے اور جہالت اور تعصب سے باغوں کو کاٹ دیا گیا۔ اور بعض مسجدیں جن میں سے اب تک ایک مسجد سکھوں کے قبضے میں ہے دھرم سالہ یعنی سکھوں کا معبد بنایا گیا۔ اس دن ہمارے بزرگوں کا ایک کتب خانہ بھی جلایا گیا۔ جس میں پانچسو نسخہ قرآن شریف کا قلمی تھا۔ جو نہایت بے ادبی سے جلایا گیا۔ اور آخر سکھوں نے کچھ سوچ کر ہمارے بزرگوں کو نکل جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ تمام مرد و زن چھکڑوں میں بٹھا کر نکالے گئے اور وہ پنجاب کی ایک ریاست میں پناہ گزین ہوئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ان ہی دشمنوں کے منصوبے سے میرے دادا صاحب کو زہر دی گئی۔ پھر رنجیت سنگھ کی سلطنت کے آخری زمانہ میں میرے والد صاحب مرحوم مرزا غلام مرتضیٰ قادیان میں واپس آئے اور مرزا صاحب موصوف کو اپنے والد صاحب کے دیہات میں سے پانچ گاؤں واپس ملے۔ کیونکہ اس عرصہ میں رنجیت سنگھ نے دوسری اکثر چھوٹی

ریاستوں کو دبا کر ایک بڑی ریاست اپنی بنالی تھی۔ سو ہمارے تمام دیہات بھی رنجیت سنگھ کے قبضہ میں آگئے تھے، اور لاہور سے لے کر پشاور تک اور دوسری طرف لدھیانہ تک اس کی ملکداری کا سلسلہ پھیل گیا تھا۔ غرض ہماری پرانی ریاست خاک میں مل کر آخر پانچ گاؤں ہاتھ میں رہ گئے۔ پھر بھی بلحاظ پرانے خاندان کے میرے والد غلام مرتضیٰ اس نواح میں ایک مشہور رئیس تھے۔ گورنر جنرل کے دربار میں بزمرہ کرسی نشین رئیسوں کے ہمیشہ بلائے جاتے تھے، ۱۸۵۷ء میں انہوں نے سرکار انگریزی کی خدمت گزاری میں پچاس گھوڑے مع پچاس سواروں کے اپنی گرہ سے خرید کر دیئے تھے، اور آئندہ گورنمنٹ کو اس قسم کی مدد کا عند الضرورت وعدہ بھی دیا۔ اور سرکار انگریزی کے حکام وقت سے بجا آوری خدمات عمدہ عمدہ چھٹیات خوشنودی مزاج ان کو ملی تھیں، چنانچہ سر لیپل گرلفین صاحب نے اپنی کتاب "رئیسان پنجاب" میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ غرض وہ حکام کی نظر میں بہت ہر دلعزیز تھے اور بسا اوقات ان کی دلجوئی کے لیے حکام وقت ڈپٹی کمشنر ان کے مکان پر آکر ان کی ملاقات کرتے تھے۔" (البریہ حاشیہ صفحہ ۱۳۶)

اس سوانح سے مرزا صاحب کو اپنے دادا کی ریاست اور ان کے راج پاٹ کے ٹھاٹھ باٹھ کی یاد بہت ستاتی دکھائی دیتی ہے۔ نیز قادیان کی اہمیت ان کے سینے میں شدید طور پر جاگزیں ہے۔ اور وہ پوری شدت سے اپنا آبائی ٹھاٹھ باٹھ اور قادیان کی فوقیت کی بحالی کے لیے غیر شعوری طور پر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ درست کہ مرزا غلام احمد بچپن سے ہی دنیاوی جھمیلوں سے الگ تھلگ رہنے کے خواہشمند دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کے والد کا اصرار تھا کہ وہ موروثی جاگیروں کی واپسی کے لیے مقدمات جو دائر کیے گئے ہیں، ان کی پیروی کریں۔ لیکن مرزا صاحب بار بار اپنی سوانح میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں، کہ ان کو ان مقدمات اور دنیاوی امور سے ذرہ برابر لگاؤ نہیں تھا۔ اور وہ اپنا وقت عبادت، اور علوم دینی میں دسترس حاصل کرنے میں صرف کرتے تھے چنانچہ ایسی آرا موجود ہے جن سے مرزا صاحب کی علوم دین میں دسترس ثابت ہوتی ہے اور ایک زمانے میں ایک عالم مرزا صاحب کے علمی تبحر کا نہ صرف قائل تھا۔ بلکہ اس سے

متاثر بھی تھا۔ چنانچہ اپنی اس زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اب میرے ذاتی سوانح یہ ہیں، کہ میری پیدائش ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں سکھوں کے آخری وقت میں ہوئی، اور میں ۱۸۵۷ء میں سولہ برس کا سترھویں برس میں تھا ابھی ریش و بروت کا آغاز تھا۔ میری پیدائش سے پہلے میرے والد صاحب نے بڑے بڑے مصائب دیکھے، لیکن میری پیدائش کے دنوں میں ان کی تنگی کا زمانہ فراخی بدل گیا تھا۔

"بچپن کے زمانے میں میری تعلیم اس طرح پر ہوئی۔ کہ جب میں چھ سات سال کا تھا تو ایک فارسی خوان معلم میرے لیے نوکر رکھا گیا۔ جنہوں نے قرآن شریف اور چند فارسی کتابیں مجھے پڑھائیں اور اس بزرگ کا نام فضل الٰہی تھا۔ اور جب میری عمر قریباً دس برس کی ہوئی۔ تو ایک عربی خواں مولوی صاحب میری تربیت کے لیے مقرر کیے گئے۔ جن کا نام فضل احمد تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ چونکہ میری تعلیم خدائے تعالیٰ کے فضل کی ابتدائی تخم ریزی تھی، اس لیے ان استادوں کے نام کا پہلا لفظ بھی فضل ہی تھا۔ مولوی صاحب موصوف جو ایک دیندار اور بزرگوار آدمی تھے۔ وہ بہت توجہ اور محنت سے پڑھاتے رہے اور میں نے صَرف کی بعض کتابیں اور کچھ قواعدِ نحو' ان سے پڑھے' اور بعد اس کے جب میں سترہ یا اٹھارہ سال کا ہوا تو ایک مولوی صاحب سے چند سال پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کا نام گل علی شاہ تھا۔ ان کو بھی میرے والد نے نوکر رکھ کر قادیان میں پڑھانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ اور ان آخر الذکر مولوی صاحب سے میں نے نحو اور منطق اور حکمت وغیرہ علوم مروجہ کو جہاں تک خدائے تعالیٰ نے چاہا حاصل کیا اور بعض طبابت کی کتابیں میں نے اپنے والد صاحب سے پڑھیں اور وہ فن طبابت میں بڑے حاذق طبیب تھے' اور ان دنوں میں مجھے کتابوں کے دیکھنے کی طرف اس قدر توجہ تھی' کہ گویا میں دنیا میں نہ تھا۔"

"میرے والد صاحب مجھے بار بار یہی ہدایت کرتے تھے، کہ کتابوں کا مطالعہ کم کرنا چاہیئے کیونکہ وہ نہایت ہمدردی سے ڈرتے تھے کہ صحت میں فرق نہ آوے۔ اور نیز ان کا یہ بھی مطلب تھا کہ میں اس شغل سے الگ ہو کر ان کے غموم و ہموم میں شریک ہو جاؤں

آخر ایسا ہی ہوا۔ میرے والد صاحب اپنے بعض آباؤ اجداد کے دیہات کو دوبارہ لینے کے لیے انگریزی عدالتوں میں مقدمات کر رہے تھے انہوں نے ان ہی مقدمات میں مجھے بھی لگایا اور ایک زمانہ دراز تک میں ان کاموں میں مشغول رہا۔ مجھے افسوس ہے کہ بہت سا وقت عزیز میرا ان بیہودہ جھگڑوں میں ضائع گیا اور اس کے ساتھ ہی والد صاحب موصوف نے زمینداری امور کی نگرانی میں مجھے لگا دیا۔ میں اس طبیعت اور فطرت کا آدمی نہیں تھا۔ اس لیے اکثر والد صاحب کی ناراضگی کا نشانہ رہتا تھا۔"

"ایسا ہی ان کے زیر سایہ ہونے کے ایام میں چند سال تک میری عمر کراہت طبع کے ساتھ انگریزی ملازمت میں بسر ہوئی لیعنی سیالکوٹ کی کچہری میں (مبلغ ۱۵ ماہوار کے محرر تھے) آخر چونکہ میرا جدا رہنا میرے والد پر بہت گراں تھا۔ اس لیے ان کے حکم سے جو عین میری منشا کے موافق تھا۔ میں نے استعفیٰ دے کر اپنے تئیں اس نوکری سے جو میری طبیعت کے مخالف تھی سبکدوش کر دیا۔ اور پھر والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور جب میں حضرت والد صاحب مرحوم کی خدمت میں پھر حاضر ہوا تو بدستور ان ہی زمینداری کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ مگر اکثر حصہ وقت کا قرآن شریف کے تدبر اور تفسیروں اور حدیثوں کے دیکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ میری عمر قریباً ۳۴ یا ۳۵ برس کے ہو گی۔ جب حضرت والد صاحب کا انتقال ہوا مجھے ایک خواب میں بتلایا گیا کہ اب ان کے انتقال کا وقت قریب ہے میں اس وقت لاہور میں تھا۔ جب مجھے یہ خواب آیا تھا۔ بہت ہی جلدی قادیان پہنچا اور ان کو مرض پیچش میں مبتلا پایا۔ اور میرے والد صاحب اسی دن بعد غروب آفتاب فوت ہو گئے۔ غرض میری زندگی قریب قریب چالیس برس کے زیر سایہ والد بزرگوار کے گزری ایک طرف ان کا دنیا سے اٹھایا جانا تھا۔ اور ایک طرف بڑے زور شور سے سلسلہ مکالمات الٰہیہ کا مجھ سے شروع ہوا۔"

(کتاب البریہ صفحہ ۱۳۴ تا ۱۳۶ خلاصہ حاشیہ مرزا صاحب)

سرسید اور مرزا غلام احمد قادیانی

جس زمانے میں مرزا غلام احمد اسلامی علوم کے حصول اور عبادت وریاضت میں مصروف تھے وہ زمانہ ذہنی طور پر مسلمانوں اور اسلام کے لیے بڑے کرب کا زمانہ تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی تو اس صورت حال نے اس طبقے کو پریشان کیا جو مغل اور دیگر حکومتوں سے وابستہ تھے، جاگیردار تھے یا فوجی خدمات کے صلے میں ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اب نئی حکومت میں وہ پریشان حال ہو رہے تھے، ایک طرف یہ مادی زندگی کا کرب ان کو ستا رہا تھا تو دوسری طرف انگریز اپنی حکومت کی توسیع کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ پر بھی بہت مصر تھے، ایسی دستاویزی شہادتیں لاتعداد مصنفین نے جمع کی ہیں۔ جن سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں عیسائی پادریوں کی تبلیغ میں زبردست قسم کی جارحیت تھی اور انگریزی سرکار کے اہلکار کھلم کھلا ان پادریوں اور ان کے تبلیغی کارناموں کی سرپرستی فرماتے تھے۔ پنجاب میں اس امر کا شدت سے احساس انگریزی عملداری کے بعد ہونا شروع ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اس برصغیر کی سیاست میں کئی ایک پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ ان پیچیدگیوں نے مذہبی تحریکوں کو جنم دیا اور دینی احیاء کے ولولوں کو ہمیز لگائی۔ ایک طرف عیسائیت کے سیلاب کے خلاف مزاحمتی تحریکیں اٹھیں تو دوسری طرف اپنے دین کو سچا ثابت کرنے اور اس کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی دھن سوار ہوئی۔ یہ دھن اور یہ تحریکیں صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ خود ہندوؤں اور سکھوں میں بھی ابھریں۔ آریہ سماج، سنگھ سبھا، سرسید کی تحریک یہ سب اسی کرب کے دور کی پیداوار ہیں، اور اسی کرب کے دور میں ہی مرزا غلام احمد کی تحریک احمدیت نے جنم لیا۔

لطف یہ ہے کہ سرسید اور غلام احمد دونوں عیسائیت کی یلغار سے بہت بری طرح متاثر ہوئے اور اس کے خلاف مزاحمت کے طریقے ڈھونڈنے شروع کیے۔ خود سرسید اس زمانے کے کرب کی صورت حال کا نقشہ اپنے ایک خط میں اس طرح کھینچتے ہیں:-

"ایک عبرت خیز واقعہ کو، جس نے ایک شخص کے دل کو دین و دنیا دونوں سے مستغنی کر کے قوم کی محبت و ہمدردی میں محو کر لیا اور درحقیقت وہی اس کالج کے فاؤنڈیشن کا پہلا پتھر ہے۔ میں اپنے دل سے بھلا نہیں سکتا۔ اور گو میں اس کو کبھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب ظاہر کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ کمبخت زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کا ابھی لوگوں کی یاد سے بھولا نہیں ہے۔ اس زمانہ میں، میں بجنور میں تھا۔"

"غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا۔ نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا، اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شیکسپیر نے جن کی مصیبتوں میں بھی ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا۔ کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقدار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں۔ اور درحقیقت یہ بات بالکل سچی تھی، میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔"

"چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا۔ اور میرے بال سفید کر دیئے جب میں مرادآباد میں آیا جو ایک بڑا غمکدہ بربادی ہمارے قوم کے رئیسوں کا تھا۔ اس غم کو قدرتی ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔ میں نے پسند نہیں کیا۔ مگر میں نہیں جانتا کہ کس نے پسند اور کس نے آمادہ کیا۔"

"ہنوز سیاست ہائے ایام غدر جاری تھیں، کہ میں نے ایک رسالہ قوم کی بے گناہی کا لکھا جو "کازز آف انڈین ریولٹ" کے نام سے موسوم ہے میں بیان کرنا نہیں چاہتا کہ وہ کیا وقت تھا۔ اور میرے دوست کیا یقین کرتے تھے کہ اس جوش ہمدردی سے جس کو میں خود دیوانہ پن کہہ سکتا ہوں مجھ پر کیا گزرنے والا تھا۔ یہ میرا پہلا سبق قومی ہمدردی کا تھا۔ میرے غمخوار مجھ کو اس سے مانع آتے تھے، اور میرا دل ان سے یہ کہتا تھا۔"

حریف کاوشِ مژگانِ خون ریزم نہ ناصح
بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

"اسی زمانے میں، میں نے چند رسالے لکھے اور مشتہر کیے جو "لائل محمڈنز آف انڈیا" کے نام سے مشہور ہیں۔"

"مگر میں نے غور کیا کہ یہ سب فروعی باتیں ہیں، اصلی سبب سوچنا چاہیے کہ قوم پر یہ مصیبت کیوں پڑی اور کیونکر دور ہو سکتی ہے۔ اس کا یہ جواب ملا کہ قوم میں تعلیم و تربیت نہیں تھی، اور انگریزوں سے جن کو خدا نے ہم پر مسلط کیا میل جول اور اتحاد نہ تھا اور باہم ان دونوں میں مذہبی اور رسمی منافرت بلکہ مثل آب زیر کاہ عداوت کا ہونا تھا۔ میں نے یقین کیا کہ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو غدر واقع نہ ہوتا اور اگر ہوتا تو جو سخت مصیبت گورنمنٹ پر، ملک پر، ہماری قوم پر واقع ہوئی ہے اس قدر نہ ہوتی۔

پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ قوم کو اس زمانے کی صورت کے موافق تعلیم دینا اور یورپ کے علوم کا ان میں جاری کرنا آیا درحقیقت اسلام کے برخلاف ہے، مجھے جواب ملا کہ نہیں، پھر میں نے سوچا کہ انگریزوں سے جو ہمارے حاکم ہیں، اور عموماً عیسائیوں سے سچی دوستی اور بے ریا اتحاد اور دل کھول کر دوستانہ میل جول اور دوستانہ معاشرت اور آپس میں ایک دوسرے کی ہمدردی کیا اسلام کے برخلاف ہے جواب ملا کہ نہیں! پس انہی دونوں اصولوں پر جن کو میں کبھی نہیں چھوڑنے کا قومی بھلائی پر کمر باندھی۔ میں نے قومی بہتری کے دو اصول مستحکم قائم کر لیے۔ ایک تعلیم دوسرا انگریزوں سے اصلی اتحاد اور دوستی۔" (انتخاب مکاتیب سرسید شبلی اور اقبال صفحہ ۲-۳-۴)

بغاوت ہند کے اسباب میں بھی ایک سبب عیسائیت کی جارحانہ تبلیغ کو سمجھا جاتا ہے اس ضمن میں عیسائیت کی یلغار کی داستان بیان کرتے ہوئے سیّد ہاشمی فرید آبادی تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد دوم میں لکھتے ہیں:۔

"مداخلت مذہبی، کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے ہیں کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے۔ اور سب کو، کیا ہندو اور کیا مسلمان، عیسائی مذہب اور اپنے ملک کی رسم و رواج پر لا ڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی میں یہی ہے۔"

"ہر شخص دل سے جانتا تھا کہ ہماری گورنمنٹ کے احکام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں آتے ہیں، اور جو کام کرنا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں۔ اس واسطے دفعتہً اور جبراً مسلمانوں کی طرح دین بدلنے کو نہیں کہتے۔ مگر جتنا جتنا قابو پائے جائیں گے۔ اتنی اتنی مداخلت کرتے جائیں گے۔ اور جو باتیں رفتہ رفتہ ظہور میں آتی گئیں۔ جن کا بیان آگے آئے گا ان کے اس غلط شبہے کو زیادہ تر مستحکم اور مضبوط کرتی گئیں، سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبر مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی۔ بلکہ خفیہ تدبیریں کر کر مثل نابود کر دینے علم عربی سنسکرت کے اور مفلس اور محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو جو ان کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کر کر اور اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دیں گے۔ ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کیے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی و شمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح پر مفلس اور محتاج کر کر اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی، ہندوستان کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا۔ اور یہ بھی میں سچ کہتا ہوں کہ منشا اس رنج کا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ بجز اس کے کہ لوگ جانتے تھے کہ جوں جوں اختیار ہماری گورنمنٹ کا زیادہ ہوتا جائے گا اور کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلے

اور فساد کا اندیشہ نہ رہے گا۔ دوں' دوں ہمارے مذہب اور رسم و رواج میں زیادہ تر مداخلت کریں گے۔"

"ہماری گورنمنٹ کی ابتدائی حکومت ہندوستان میں گفتگو مذہب کی بہت کم تھی، روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس زمانے میں یہ درجۂ کمال پہنچ گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں، کہ ہماری گورنمنٹ کو ان امور میں کچھ مداخلت نہ تھی، مگر ہر شخص یہ سمجھتا تھا۔ کہ یہ سب معاملے بہ موجب حکم اور بہ موجب اشارہ اور مرضی گورنمنٹ ہوتے ہیں' سب جانتے تھے، کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ سے پادری صاحب تنخواہ پاتے ہیں' گورنمنٹ اور حکام انگریزی ولایت زا' جو اس ملک میں نوکر ہیں۔ وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں۔ اکثر حکام متعہد اور افسران فوج نے اپنے تابعین سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی، بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے، کہ ہماری کوٹھی پر آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرض کہ اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی، کہ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔"

"پادری صاحبوں کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی، تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال جواب چھپنی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں کی نسبت الفاظ اور مضامین رنجیدہ مندرج ہوتے۔ ہندوستان میں دستور وعظ اور کتھا کا یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں، جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو وہاں جا کر سنے۔ پادری صاحبوں کا طریقہ اس کے برخلاف تھا وہ خود غیر مذہب کے مجمع اور تیرت گاہ میلے میں جا کر وعظ کہتے تھے، اور کوئی شخص صرف حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا۔ بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپراسی جانے لگا۔ پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو

اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے۔ جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی، اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دل میں بویا جاتا تھا۔"

"مشنری سکول بہت جاری ہوئے۔ اور ان میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہد، ان اسکولوں میں جاتے تھے۔ اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا۔ اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون تمہارا نجات دینے والا کون، اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے، اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔ ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔"

"یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے لڑکوں کو کیوں داخل کرتے تھے؟ اس بات کو عدم ناراضی پر خیال کرنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ یہ ایک بڑی دلیل ہے ہندوستان کے کمال خراب حال اور مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہو جانے پر۔ یہ صرف ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے کہ ان اسکولوں میں داخل ہو کر ہماری اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہوگا۔ ایسی سخت بات جس سے بلاشبہ ان کو دلی رنج اور روحانی غم تھا۔ گوارا کرتے تھے، نہ رضامندی سے۔ دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے سب لوگ یقین سمجھتے تھے۔ کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوتے ہیں۔ پرگنہ، وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر جو ہر گاؤں اور قصبے میں لوگوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ لڑکوں کو مکتبوں میں داخل کرو، ہر ہر گاؤں میں کالا پادری ان کا نام تھا۔ جس گاؤں میں، پرگنہ، وزیٹر، یا ڈپٹی انسپکٹر پہنچا اور گنواروں نے آپس میں چرچا کیا کہ کالا پادری آیا۔ عوام الناس یوں خیال کرتے تھے، کہ یہ عیسائی مکتب ہیں۔ اور کرسٹان بنانے کو بٹھاتے ہیں۔ اور فہمیدہ آدمی اگرچہ یہ نہیں سمجھتے تھے، مگر یوں جانتے تھے کہ ان مکاتب میں صرف اردو کی تعلیم ہوتی ہے ہمارے

لڑکے اس میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہو جائیں گے۔ اور عیسائی بن جائیں گے۔ اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا یہی ارادہ ہے کہ ہندوستان کے مذہبی علوم کو معدوم کر دے۔ تاکہ آئندہ کو عیسائی مذہب پھیل جاتے۔ اکثر اضلاع مشرقی ہندوستان میں ان مکتبوں کا جاری ہونا۔ اور لڑکوں کا داخل ہونا صاف تحکماً ہوا۔ اور کہہ دیا کہ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ لڑکوں کو داخل کیا جائے"

"لڑکیوں کی تعلیم کا بہت چرچا ہندوستان میں تھا۔ اور سب بیقین جانتے تھے۔ کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں سکولوں میں آئیں۔ اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں۔ کہ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی، بعض بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا۔ ہر گنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم سعی کر کر لڑکیوں کے مکتب قائم کر دیں گے۔ تو ہماری بڑی نیک نامی گورنمنٹ میں ہوگی۔ اس سبب سے وہ ہر طرح پر بہ طریق جائز و ناجائز لوگوں کو واسطے قائم کرنے لڑکیوں کے مکتبوں کی فہمائش کرتے تھے۔ اور اس سبب سے زیادہ تر لوگوں کے دلوں کو ناراضی اور اپنے غلط خیالات کا ان کو یقین ہو جاتا تھا۔ بڑے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر تھے، اوّل اوّل گو ان سے بھی کچھ وحشت لوگوں کو ہوئی تھی۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز جو تمام ہندوستان میں نہایت نامی مولوی تھے۔ زندہ تھے، مسلمانوں نے ان سے فتویٰ پوچھا۔ انہوں نے صاف جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بہ موجب مذہب کے سب درست ہے۔ اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوتے۔ مگر اس زمانے میں کالجوں کا حال ایسا نہ تھا۔ بلکہ ان میں تعلیم کا سررشتہ بہت اچھا تھا۔ ہر قسم کے علوم فارسی اور عربی اور سنسکرت اور انگریزی پڑھائے جاتے تھے، فقہ اور حدیث اور علم ادب پڑھانے کی اجازت تھی۔ فقہ میں امتحان ہوتا تھا۔ سندیں ملتی تھیں کسی طرح کی ترغیب مذہبی نہ تھی۔ مدرس بہت ذی عزت اور معتبر اور مشہور اور ذی علم اور پرہیزگار مقرر ہوئے تھے۔ مگر آخر کو یہ بات نہ رہی۔ قدر عربی کی بہت کم ہو گئی اور فقہ اور حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی، فارسی بھی چنداں قابلِ لحاظ نہ رہی تعلیم کی صورت اور کتابوں کے رواج سے بالکلیہ تغیر پکڑا اردو اور انگریزی

کا رواج بہت زیادہ ہوا جس کے سبب سے وہی شبہ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مذہبی علوم کا معدوم کرنا منظور ہے قائم ہو گیا۔ مدرس لوگ معتبر اور ذی علم نہ رہے وہی مدرسہ کے طالب علم کہ جنہوں نے ابھی تک لوگوں کی آنکھوں میں اعتبار پیدا نہ کیا تھا۔ مدرس ہونے لگے۔ اس لیے ان مدرسوں کا بھی وہی حال ہو گیا۔"

"ادھر تو دیہاتی مکاتب اور کالجوں کا یہ حال تھا۔ کہ ان پر سب کو شبہ رواج دینے مذہب عیسائی کا ہو رہا تھا۔ کہ دفعتاً پیش گاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ جو شخص مدرسے کا تعلیم یافتہ ہو گا۔ اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہو گا وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ پر جن کو ابھی تک سب لوگ کالا پادری سمجھے جاتے تھے منحصر ہو گئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دل پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہو گئی۔ اور لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے۔ تاکہ مجبور ہو کر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدل ہو جائے۔

اسی زمانہ میں بعض اضلاع پر تجویز ہوئی کہ قیدی جیل خانوں میں ایک شخص کے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں۔ جس سے ہندوؤں کا مذہب بالکل جاتا رہتا تھا۔ مسلمانوں کے مذہب میں اگرچہ کچھ نقصان نہیں آتا تھا۔ مگر اس کا رنج سب کے دل پر تھا۔ کہ سرکار ہر ایک کا مذہب لینے پر آمادہ اور ہر طرح پر اس کی تدبیر میں ہے۔"

"یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں ہو رہی تھیں۔ کہ دفعتہً ۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہو گئی تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہو گئی مذہب بھی ایک چاہیئے۔ اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر

تھے، وہ وقت اب آگیا اب جتنے سرکاری نوکر ہیں، اوّل ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو۔ سب لوگ بے شک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔ آپس میں ہندوستانی لوگ اہلکاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بہ سبب لالچ نوکری کے کرسٹان ہو گئے، ان چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہلکاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی، لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آجائے گی کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو، اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں، چنانچہ انہوں نے کر دیا اور اس کے مٹانے کو کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔"

(تاریخ پاکستان و بھارت صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۹)

ان حالات میں مرزا غلام احمد نے اپنی مذہبی زندگی کی ابتدا بھی کچھ اسی انداز سے کی، مرزا صاحب کو عیسائیت کے خلاف صف آرا ہونے کا سب سے پہلا موقعہ اپنی ملازمت کے دوران سیالکوٹ میں ہی ملا۔ یہ واقعہ ہے کہ پنجاب کے عیسائی مشنوں میں سیالکوٹ کے مشن کو خاصی اہمیت حاصل تھی، اس زمانے کے حالات کے بارے میں مولانا سید میر حسن لکھتے ہیں:۔

"مرزا صاحب کو اس زمانہ میں مذہبی مباحثہ کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ پادری صاحبوں سے اکثر مباحثہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ پادری الائشہ صاحب سے جو دیسی عیسائی پادری تھے اور حاجی پورہ سے جانب جنوب کی کوٹھیوں میں ایک کوٹھی میں رہا کرتے تھے مباحثہ ہوا پادری صاحب نے کہا کہ عیسوی مذہب قبول کرنے کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی مرزا صاحب نے فرمایا۔ نجات کی تعریف کیا ہے؟ اور نجات سے آپ کیا مراد رکھتے ہیں۔ مفصل بیان کیجئے۔ پادری صاحب نے کچھ مفصل تقریر نہ کی، اور مباحثہ ختم کر بیٹھے اور کہا کہ میں اس قسم کی منطق نہیں پڑھا۔"

پادری بٹلر صاحب ایم اے سے جو بڑے فاضل اور محقق تھے، مرزا صاحب کا مباحثہ

بہت دفعہ ہوا یہ صاحب موضع گوہر پور کے قریب رہتے تھے۔ ایک دفعہ پادری صاحب فرماتے تھے کہ مسیح کو بے باپ پیدا کرنے میں یہ سر تھا کہ وہ کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے اور آدم کی شرکت سے جو گنہگار تھا بری رہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ مریم بھی تو آدم کی نسل سے ہے۔ پھر آدم کی شرکت سے بریت کیسے اور علاوہ ازیں عورت ہی نے تو آدم کو ترغیب دی، جس سے آدم نے درخت ممنوع کا پھل کھایا۔ اور گنہگار ہوا۔ پس چاہیئے تھا کہ مسیح عورت کی شرکت سے بھی بری رہتے۔ اس پر پادری صاحب خاموش ہو گئے۔

پادری بٹلر صاحب مرزا صاحب کی بہت عزت کرتے تھے، اور بڑے ادب سے ان سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ پادری صاحب کو مرزا صاحب سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ پادری صاحب ولایت جانے لگے۔ تو مرزا صاحب کی ملاقات کے لیے کچہری میں تشریف لائے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے پادری صاحب سے تشریف آوری کا سبب پوچھا تو پادری صاحب نے جواب دیا کہ میں مرزا صاحب سے ملاقات کرنے کو آیا تھا چونکہ میں وطن جانے والا ہوں۔ اس لیے ان سے آخری ملاقات کروں گا۔ چنانچہ جہاں مرزا صاحب بیٹھے تھے، وہیں چلے گئے اور فرش پر بیٹھے رہے اور ملاقات کر کے چلے گئے۔"

(حیات طیبہ صفحہ ۲۰-۲۱ مصنفہ عبدالقادر)

اسی مناظرانہ بحث و مباحثہ نے مرزا صاحب کو حیات مسیح کے مسئلے پر اپنا دعوے ترتیب دینے پر اکسایا ہوگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مرزا صاحب کے تمام دعاوی اگر سامنے رکھے جائیں تو پھر یہ جاننا آسان ہو جائے گا کہ کیوں یہ دعاوی اس دور میں جہاں مسلمانوں کے ایک گروہ اور ایک طبقے کے تقاضے پورے کرتے تھے، وہاں بہت حد تک انگریزی حکومت کی ضروریات بھی پوری کرتے تھے، اس لیے سب سے پہلے ان دعاوی کو مختصراً جان لینا چاہیئے۔ ان دعاوی اور اس تحریک کے بارے میں تحقیقاتی عدالت نے جو رپورٹ مرتب کی تھی، اس میں کہا گیا ہے:

"احمدیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو عقائدی اور معاشرتی اختلافات ہیں۔ ان کے متعلق ہم حصہ چہارم میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ یہاں ہمیں صرف

تحریک احمدیت کی مختصر کیفیت بیان کرنا ہے۔ اس تحریک کی بنیاد مرزا غلام احمد نے رکھی، جو سکھ دربار کے ایک جرنیل مرزا غلام مرتضیٰ کے پوتے تھے۔ مرزا غلام احمد ۱۳ فروری ۱۸۳۵ء کو بمقام قادیان پیدا ہوئے۔ یہ ضلع گورداسپور کا ایک گاؤں ہے۔ جس میں واحد مالک کی حیثیت اسی خاندان کو حاصل تھی، مرزا غلام احمد نے فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم گھر پر پائی۔ کسی قسم کی مغربی تعلیم کے حصول کا سراغ نہیں ملتا۔ ۱۸۶۴ء میں ان کو عدالت ضلع سیالکوٹ میں ایک نوکری مل گئی۔ جہاں وہ چار سال تک کام کرتے رہے جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ تو انہوں نے اپنے آپ کو از سر تا پا دینیات کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا۔ اور ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۴ء کے درمیان اپنی مشہور کتاب "براہین احمدیہ" چار جلدوں میں لکھی، کچھ مدت بعد چند اور کتابیں بھی تصنیف کیں، اس زمانے میں شدید مذہبی مناقشے اور مناظرے جاری تھے اسلام پر نہ صرف عیسائی مشنری ہی پے در پے حملے کر رہے تھے۔ بلکہ ہندوؤں کی مقبول عام تحریک آریہ سماج کے پرچارک بھی اسی مشغلے میں مصروف تھے"

مارچ ۱۸۸۲ء میں مرزا غلام احمد نے دعویٰ کیا کہ انہیں الہام ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص مقصد تفویض کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا "مامور من اللہ" ہیں ۱۸۸۸ء میں انہوں نے پھر ایک الہام کی بنا پر اپنے مویدین سے بیعت کا مطالبہ کیا ۱۸۹۰ء کے اواخر میں مرزا صاحب کو پھر الہام ہوا (پہلا دعویٰ) کہ یسوع ناصری (عیسیٰ ابن مریم) نہ صلیب پر فوت ہوئے نہ آسمان کی طرف اٹھائے گئے بلکہ جب وہ صلیب پر زخمی ہو گئے تو ان کے شاگردوں نے انہیں اسی مجروح حالت میں صلیب پر سے اتار لیا اور ان کے زخموں کا علاج کیا اس کے بعد وہ کشمیر چلے گئے اور وہاں طبعی موت مر گئے۔ یہ عقیدہ غلط ہے کہ وہ روز قیامت کے قریب اپنے اصلی جسم عنصری کے ساتھ دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ ان کے دوبارہ ظہور کے وعدے کا مطلب صرف یہ ہے کہ عیسیٰ ابن مریم کے صفات و اخلاق رکھنے والا ایک اور شخص امت محمدیہ میں پیدا ہو گا۔ یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے اور مرزا

غلام احمد ہی وہ مثیل عیسیٰ اور مسیح موعود واقع ہوتے ہیں۔ اس عقیدے کی اشاعت پر مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ کیونکہ یہ اس عام مسلّمہ عقیدے کے منافی تھا کہ عیسیٰ بن مریم جسم عنصری کے ساتھ آسمان سے اُتریں گے۔ چنانچہ علماء دین نے اس کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے (دوسرا دعویٰ) "مہدی معہود" ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ اور اعلان کیا کہ میں ایسا مہدی نہیں جو جنگ و خونریزی میں مصروف ہو جاؤں بلکہ میں "مہدی معقول" ہوں۔ اور دلائل و براہین کی قوّت سے اپنے مخالفین کو مغلوب کر دوں گا۔ اس نئے دعوے سے مرزا صاحب کی مخالفت زیادہ بھڑک اٹھی، اور علماء دین ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرنے لگے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں مرزا صاحب نے ایک اور عقیدے کا اظہار کیا کہ (تیسرا دعویٰ) آج کے بعد "جہاد بالسیف" کا قصہ ختم ہے اب جہاد اسی پر موقوف ہے کہ مخالف کو دلیل و برہان سے قائل کرنے کی کوشش کی جائے۔ سنہ ۱۹۰۱ء (چوتھا دعویٰ) میں مرزا صاحب نے "ظلّی نبی" ہونے کا دعوےٰ کیا۔ اور "ایک غلطی کا ازالہ" کے عنوان سے ایک اشتہار شائع کیا۔ جس میں بتایا کہ ختم نبوت کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلعم کے انتقال کے بعد کوئی ایسا نبی پیدا نہ ہوگا۔ جو کسی نئی شریعت کا حامل ہو۔ لیکن کسی غیر تشریعی نبی کا ظہور عقیدۂ ختم نبوت کے خلاف نہیں۔ نومبر سنہ ۱۹۰۴ء (پانچواں دعویٰ) میں مرزا صاحب نے سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں "مثیل کرشن" ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔

جماعت احمدیہ سنہ ۱۹۰۱ء میں قائم کی گئی اور مرزا صاحب کی استدعا پر اسی سال مردم شماری کے کاغذات پر اس جماعت کو ایک علیحدہ مسلم فرقہ ظاہر کیا گیا۔ جماعت کی موجودہ تعداد پاکستان میں دو لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے (سنہ ۱۹۵۳ء تک) اور احمدی دوسرے مسلم ممالک میں اور بھارت۔ یورپ اور امریکہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس نئی تحریک کو مرزا صاحب کی زندگی ہی میں خاصی تائید حاصل ہو گئی تھی۔ اور متعدد ممتاز اور ذی اثر لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ جب سنہ ۱۹۰۸ء میں مرزا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تو مولوی نور الدین جماعت احمدیہ کے خلیفہ اوّل مقرر ہوئے۔

۱۹۱۴ء میں خلیفہ نورالدین کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیرالدین محمود احمد خلیفہ ثانی قرار پائے۔ مرزا بشیرالدین محمود احمد کی مسند نشینی پر جماعت میں پھوٹ پڑ گئی۔ جماعت کا ایک حصہ خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی کی سرکردگی میں الگ ہوگیا۔ اور ایک علیحدہ پارٹی "لاہوری پارٹی" کے نام سے وجود میں آئی۔ دونوں پارٹیوں میں فرق یہ ہے کہ قادیانی پارٹی کے عقیدے میں مرزا غلام احمد نبی ہیں۔ لیکن لاہوری پارٹی مرزا صاحب کو یہ درجہ دینے پر آمادہ نہیں۔ اس کے نزدیک مرزا صاحب زیادہ سے زیادہ ایک مجدد یا محدث ہیں۔ ان الگ ہونے والوں نے لاہور میں اپنی ایک تنظیم قائم کرلی۔ جو "احمدیہ انجمن اشاعت اسلام" کہلاتی ہے۔ دونوں پارٹیاں غیر ممالک میں وسیع پیمانے پر تبلیغ و اشاعت کا کام کرنے میں مصروف ہیں۔"

(تحقیقاتی عدالت صفحہ نمبر ۸-۹-۱۰)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب کے یہ تمام دعاوی نئے ہوں تو ہوں، لیکن جہاں تک تعلیمات کا تعلق ہے یا عام مسلمانوں کے اس وقت کے مروجہ عقائد سے ہٹ کر بات کرنے اور ان کے ثبوت میں دلائل اور آیات و احادیث پیش کرنے کا عمل، تو یہ مرزا غلام احمد نے جب اس طرف توجہ کی، اس سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس کے متعلق خود مرزا صاحب کی جماعت کا سرکاری ترجمان الفضل اپنی ۱۹۱۶ء کی ایک اشاعت میں لکھتا ہے:۔

"سب سے بڑا مسئلہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے سرسید کی تقلید میں بیان کیا وہ وفات مسیح کا مسئلہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ سب سے پہلے سرسید نے اس کا اعلان کیا اور بعد میں مرزا صاحب نے اسی کو پیش کر دیا۔ لیکن اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سرسید نے جس رنگ اور جس طرز سے اس مسئلہ کا اقرار کیا ہے اس میں اور جس رنگ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو صاف کہا ہے۔ اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

الفضل قادیان۔ ۴ر مئی ۱۹۱۶ء

اس اقتباس کے درج کرنے سے مراد یہ نہیں کہ اولیت اور تتبع کے سہرے مختلف سروں پر باندھے جائیں۔ مجھے تو فقط یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ وہ دور تھا۔ جس میں سرسید یا ان کے رفقاء یا پھر مرزا غلام احمد کی تعلیمات کے لیے فضا ساز گار تھی، اور یہ فضا کی سازگاری ایک طبقے کی ضرورتیں ہی تو ہیں، جس نے ان تعلیمات کو جھجکتے جھجکتے قبول کیا کیونکہ یہ تعلیمات روایتی اور مسلّمہ تعلیمات کے منافی تھیں۔ اس وقت روایتی اور مسلّمہ تعلیمات کے حامل علماء کا ایک گروہ نئی ضرورتوں اور انگریزی حکومت کی یلغار سے پیدا ہونے والے مسائل کا کوئی ایسا حل نہیں بتاتا تھا۔ جس سے اس طبقے کا دین بھی سلامت رہے اور دنیا بھی محفوظ ہو۔ اور ان کی روحانی تشفی بھی ہو۔ چنانچہ خود سرسید کو اسی کرب کا شکار ہونا پڑا اور علماء کے ایک خانوادے کی ناپسندیدگی کا اس وقت نشانہ بننا پڑا جب سرسید نے انگریز کی نوکری کرلی۔ سرسید خاندانی طور پر شاہ ولی اللہ اور مرزا مظہر جانجاناں دونوں کے پیروکار تھے سرسید کی ننھیال شاہ ولی اللہ کے خانوادے کی نام لیوا تھی۔ جبکہ سرسید کے والد مرزا مظہر جانجاناں کے جانشین شاہ غلام علی کے معتقد تھے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی روایت ہے کہ جب سرسید نے انگریز کی نوکری اختیار کرلی۔ اور اس کے بعد شاہ غلام علی کے ہاں خانقاہ پر نذر لے کر گئے۔ تو وہاں کے سب بزرگوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا یہ واقعہ صرف سرسید پر ہی نہیں بیتا بلکہ اس دور کے مسلمان امراء کے طبقے کی ذہنی اور جسمانی کرب کی نشاندہی کر رہا ہے۔ کیونکہ عملاً صورت حال یہ تھی کہ مسلمان معاشی طور پر شدید بدحال تھے۔ یہ عام مسلمانوں کی بات نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کا وہ طبقہ تھا۔ جو مغلوں کے دور میں خوشحال اور صاحب ثروت تھا۔ لیکن اب زندگی گزارنے کے لیے تمام راہیں مسدود پا رہا تھا۔ اس طبقے کی زبوں حالی کی داستانوں کو کئی ایک مصنفین نے قلمبند کیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تفصیل سے خود ایک انگریز افسر "ولیم ہنٹر" نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں بیان کیا ہے "ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے یہ کتاب، لارڈ میو کے ایماء پر ۱۸۷۱ء میں لکھی تھی، اس زمانے میں سرحد پر شورش جاری تھی، اور ہندوستان سے بھی بعض مسلمان روپیہ اور آدمی سرحد پر بھیجتے تھے، لارڈ میو نے جنہیں مسلمانوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی تھی، یہ معلوم کرنا چاہا:

کہ مسلمان حکومت سے کیوں بددل ہیں۔ اور ان کی تسکین کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ کی توضیح کے لیے ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر نے یہ کتاب لکھی۔ کتاب کے چوتھے باب میں انہوں نے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور ان کی مشکلات پر بحث کی۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکومت سے بہت سی شکایات ہیں۔ ایک شکایت یہ ہے کہ حکومت نے ان کے لیے تمام اہم عہدوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ دوسرے ایک ایسا طریقہ تعلیم جاری کیا ہے۔ جس میں ان کی قوم کے لیے کوئی انتظام نہیں۔ تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے۔ بیکار اور محتاج کر دیا ہے۔ چوتھی شکایت یہ ہے کہ ان کے اوقاف کی آمدنی، جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہیئے تھی غلط مصرفوں پر خرچ ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے ان شکایات پر بالتفصیل بحث کی ہے اور مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے۔ بالخصوص مشرقی بنگال کے خاندانی مسلمانوں کی پستی اور افلاس کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں۔

"اگر کوئی سیاست دان دار العوام میں سنسنی پیدا کرنا چاہے تو اس کے لیے کافی ہے کہ وہ بنگال کے مسلمان خاندانوں کے سچے سچے حالات بیان کر دے یہی لوگ کسی زمانے میں محلوں میں رہتے تھے۔ گھوڑے گاڑیاں نوکر چاکر موجود تھے اب یہ حالت ہے کہ ان کے گھروں میں جوان بیٹے اور بیٹیاں پوتے اور پوتیاں، بھتیجے اور بھتیجیاں بھرے پڑے ہیں اور ان بھوکوں کے لیے ان میں سے کسی ایک کو زندگی میں کچھ کرنے کا موقع نہیں۔ وہ منہدم اور مرمت شدہ مکانوں اور خستہ برآمدوں میں قابل رحم زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں، اور روز بروز قرض کی دلدل میں زیادہ دھنسے جاتے ہیں، حتیٰ کہ کوئی ہمسایہ ہندو قرض خواہ ان پر نالش کرتا ہے اور مکان اور زمینیں جو باقی تھیں، ان کے قبضے سے نکل جاتی ہیں اور یہ قدیمی مسلمان خاندان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے"

اس کے بعد ڈاکٹر ہنٹر سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کا مقابلہ دوسری قوموں کے ساتھ کرتے ہیں۔ پہلے مال اور منصفی کے محکموں میں مسلمانوں کی حالت زار بتائی ہے

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی کا صحیح نقشہ ان محکموں میں دیکھا جا سکتا ہے جن میں ملازمتوں کی تقسیم پر لوگوں کی اتنی نظر نہیں ہوتی ۱۸۶۹ء میں ان محکموں کا یہ حال تھا کہ اسسٹنٹ انجنیئروں کے درجوں میں چودہ ہندو اور مسلمان صفر، امیدواروں میں چار ہندو، دو انگریز اور مسلمان صفر سب انجنیئروں اور سپروائزروں میں چوبیس ہندو اور ایک مسلمان، اوورسیئروں میں تریسٹھ ہندو اور دو مسلمان، اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں پچاس ہندو اور معدوم مسلمان!"

"سرکاری ملازمتوں کے علاوہ ہائی کورٹ کے وکیلوں کی فہرست بڑی عبرت آموز تھی، ایک زمانہ تھا کہ یہ پیشہ بالکل مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے بعد بھی ۱۸۵۱ء تک مسلمانوں کی حالت اچھی رہی اور مسلمان وکلا کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد سے کم نہ تھی۔ لیکن ۱۸۵۱ء سے تبدیلی شروع ہوئی۔ اب نئی طرز کے آدمی آنے شروع ہوئے اور امتحانات کا طریقہ بھی بدل دیا گیا۔ ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک جن ہندوستانیوں کو وکالت کے لائسنس ملے۔ ان میں ۲۳۹ ہندو تھے اور ایک مسلمان۔"

ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں: "اگلے دن ایک بڑے سرکاری محکمے میں دیکھا گیا کہ سارے ڈیپارٹمنٹ میں ایک بھی اہلکار ایسا نہ تھا۔ جو مسلمانی زبان سے واقف ہو (بنگال کے مسلمان جو زبان بولتے ہیں وہ عام بنگالی سے مختلف ہے اور مسلمانی کے نام سے یاد کی جاتی ہے) اور حقیقتاً اب کلکتہ میں شاید ہی کوئی سرکاری دفتر ایسا ہوگا۔ جس میں کسی مسلمان کو دربانی۔ چپڑاس یا دواتیں بھرنے، قلم درست کرنے کی نوکری سے زیادہ کچھ ملنے کی امید ہو سکتی ہو۔" چنانچہ انہوں نے کلکتے کے ایک اخبار کی شکایت نقل کی ہے۔ "تمام ملازمتیں اعلےٰ ہوں یا ادنےٰ آہستہ آہستہ مسلمانوں سے چھنتی جا رہی ہیں اور دوسری قوموں بالخصوص ہندوؤں کو بخشی جاتی ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ رعیت کے تمام طبقوں کو ایک نظر سے دیکھے۔ لیکن اب یہ حالت ہے کہ حکومت سرکاری گزٹ میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ رکھنے کا کھلم کھلا اعلان کرتی ہے۔ چند دن ہوئے کمشنر صاحب نے تصریح کر دی کہ یہ ملازمتیں ہندوؤں کے

سوا کسی کو نہ ملیں گی:"

ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں: "جب ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان سب قوموں سے بہتر تھے۔ نہ صرف وہ دوسروں سے زیادہ بہادر اور جسمانی حیثیت سے زیادہ توانا اور مضبوط تھے۔ بلکہ سیاسی اور انتظامی قابلیت کا ملکہ بھی ان میں زیادہ تھا۔ لیکن یہی مسلمان آج سرکاری ملازمتوں اور غیر سرکاری اسامیوں سے یکسر محروم ہیں۔"

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب بڑی مفصل ہے۔ اس کے مندرجہ بالا اقتباسات ہی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ۱۸۷۱ء کے قریب دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حالت کیا تھی؟ ملازمتوں میں وہ نہ ہونے کے برابر تھے اور چونکہ سرکاری ملازموں کے ہاتھ میں کئی طرح کا اختیار ہوتا ہے اس لیے یہ کمی انہیں مہنگی پڑ رہی تھی۔ شمالی ہند کے مسلمانوں نے تجارت میں کبھی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ اور زمینیں قرضے کی وجہ سے ان کے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھیں۔

جب یہ صورت احوال ہو تو ظاہر ہے کہ یا تو بغاوت کی راہیں ڈھونڈی جاتی ہے یا پھر نئے حالات سے نپٹنے کے لیے اس دور کے نئے طور طریقوں کو اپنانا پڑتا ہے۔ جہاں تک بغاوت کا تعلق ہے اس کو بھی ایک گروہ نے ۱۸۵۷ء میں کسی نہ کسی حد تک آزما دیکھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ گروہ انگریزی نوکری اور انگریزی تعلیم سے مستفید ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ لیکن ایک دوسرا گروہ ایسا بھی تھا۔ جو انگریزی کی نوکری کرنے پر مجبور تھا انگریزی تعلیم کا حصول بھی اسی طبقے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ ضرورتیں تھیں، جن کے لیے سرسید نے "جدید علم الکلام" کی بنیاد ڈالی۔ جس کے متعلق انہوں نے ایک مفصل تقریر میں کہا ہے۔

"اس زمانے میں۔۔۔ ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے۔ جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں یا مشتبہ ٹھہرا دیں۔ یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر کے دکھا دیں یہ تفسیر اب چھ سات جلدوں میں ملتی ہے اور اس کے مضامین کا ایک نہایت جامع خلاصہ حالی نے 'حیات جاوید' میں درج کیا ہے۔ اس تفسیر میں سرسید نے قرآن کے تمام اندراجات

کو عقل اور سائنس کے مطابق ثابت کیا ہے۔ اور جہاں کہیں سائنس کی معلومات اور کلام مجید کے درمیان اختلاف معلوم ہوتا ہے، وہاں معتزلہ طریقے کے مطابق آیات کی نئی تاویل اور تشریح کر کے اس اختلاف کو دور کیا ہے۔ سر سید نے معراج، و شق صدر کو رؤیا کا فعل مانا ہے۔ حساب کتاب، میزان جنت دوزخ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات کو بطریق مجاز و استعارہ و تمثیل قرار دیا ہے۔ ابلیس اور ملائکہ سے کوئی خارجی وجود مراد نہیں لیا۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق کہا ہے۔ کہ قرآن مجید کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے یا زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے، نسخ قرآنی کے نظریے سے قطعی انکار کیا ہے۔
یہ تو وہ مسائل تھے۔ جن کی اس طرز ترجمانی میں سرسید منفرد نہیں ہیں، بلکہ ہر ایک مسئلہ میں کم یا زیادہ لوگ اکابر علمائے اسلام کے ساتھ سرسید متفق الرائے ہیں۔ جیسے امام غزالی امام رازی شاہ ولی اللہ وغیرہم، ان کے علاوہ چند اختلاف سرسید نے علمائے سلف سے ایسے بھی کیے ہیں، جن میں ظاہراً وہ منفرد معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ خیال کہ سورۂ محمدؐ کی آیۃ فَاِمَّا مَنًّا "سے اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا۔ یا یہ کہ حضرت عیسیٰ کی نسبت جو یہودی کہتے ہیں کہ ہم نے ان کو سنگسار کر کے قتل کیا اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں نے ان کو صلیب پر قتل کیا تھا۔ یہ دونوں قول غلط ہیں۔ بلا شبہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے۔ مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی۔ یا یہ کہ قرآن میں جنّ و اجنہ کے الفاظ سے چھپے رہنے والے پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں۔ نہ کہ وہ وہمی مخلوق جو دیو اور بھوت کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے۔"

دوسری طرف انہوں نے عیسائی مشنریوں کے اعتراضات کو رد کرنے کے لیے اسلام کی ایسی توجیہہ کی جس پر عمل کے لیے عقل اور جدید فلسفے کی رو سے کوئی اعتراض نہ ہو سکے۔ اس کے مطابق مسلمانوں کو موجودہ زمانے میں بالخصوص اپنے عیسائی حاکموں سے ربط ضبط رکھنے اور بڑھانے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ رسالہ "طعام اہل کتاب" میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ عیسائی یا دوسرے اہل کتاب کا پکا ہوا کھانا مسلمان شرفا کھا سکتے ہیں۔ یہ تمام کوششیں بنیادی طور پر انگریزی حکومت اور مسلمان امرا کے درمیان خوشگوار تعلقات

پیدا کرنے پر منتج ہوئی تھیں۔ مذہب کی توجیہہ اور تاویل کی ضرورت اس لیے تھی، کہ مذہب کی بنیاد پر علماء کے ایک مقتدر گروہ نے تعلقات کی خوشگواری میں، جو روک کھڑی تھی، اسے دُور کیا جا سکے۔ چنانچہ یہی کام مرزا غلام احمد نے پنجاب میں کیا۔ لیکن دونوں کے طریق کار میں بنیادی فرق تھا۔ اس فرق کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سرسید کی تعلیمات ہوں یا مرزا غلام احمد کی، ان دونوں کی تعلیمات کا اثر عامۃ المسلمین سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ افراد پر ہوا۔ کیونکہ یہی وہ تعلیم یافتہ طبقہ تھا۔ جو عیسائی پادریوں کے پراپیگنڈے اور تبلیغ کی وجہ سے اسلام کے بعض عقائد کے متعلق شاکی ہو رہا تھا۔ جہاں تک "حیات مسیح" اور "مہدی موعود" جیسے مسائل کا تعلق ہے۔ یہ عام مسلمانوں کے اذہان و افکار سے ماورا تھے اور وہ اپنے کو کبھی ان مسائل کی نہ سلجھنے والی گتھیوں میں الجھا نہیں سکتے تھے۔ اسی لیے سرسید کو ان نہ سلجھنے والی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے علم الکلام کا سہارا لینا پڑا۔ اور مرزا غلام احمد کو مہدیت اور نبوت کے دعویٰ پر انحصار کرنا پڑا۔

سرسید اور مرزا غلام احمد کے طریق کار کا فرق

سرسید نے اپنی تعلیمات کے لیے علم الکلام کا سہارا لیا۔ اور عقل و دلیل کو اپنا ہتھیار بنایا۔ اور اس بات کو رد کر دیا جس کو وہ عقل اور دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے لیے ان کو بعض آیات کی دور از قیاس تاویلیں بھی کرنا پڑیں۔ اور ان ہی کوششوں کی وجہ سے ان کے حامیوں کے دل میں خلش پیدا ہوئی۔ کیونکہ صدیوں کے مروجہ مذہب اور اس کی تعلیمات کا ڈھانچہ، ان تاویلات کی زد میں آ گیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خود سرسید کے پیروکار اور ان کی تعلیمات اس مروجہ مذہب جس کو گرانے کے لیے علم الکلام ایجاد کیا گیا کے ملبے تلے دب گئیں۔ چنانچہ سرسید کے اس علم الکلام کی ناکامی کے بارے میں شیخ محمد اکرام اپنی کتاب 'موج کوثر' میں لکھتے ہیں۔

"جدید علم الکلام کی ناکامی کی ایک اصولی وجہ یہ ہے کہ متکلمین عقل کو ہر چیز پر مقدم رکھ کر دلائل اور قیاسات کے ذریعے سے اسلام کی حقیقت واضح کرتے ہیں۔ بظاہر تو یہ

طریق کار ٹھیک ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عقائد اور ایمان کی بنیاد عقل پہ اتنی نہیں ہوتی۔ جتنی قلبی مشاہدے اور ذاتی تجربے پر۔ جب آدمی اپنے تجربے اور مشاہدے کی مدد سے یا بقول غزالی باطن کی آنکھوں سے اللہ کی قدرت دیکھ لیتا ہے تو اسے خود بخود خدائے تعالٰے کی ہستی پر یقین آجاتا ہے۔ اس تیقن سے اسے مصائب میں تسکین ملتی ہے اور زندگی کی جدوجہد میں تقویت پہنچتی ہے۔ پھر اسے اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ جزوی مسائل کو سائنس یا عقل کے ترازو میں تولے۔ مذہبی زندگی کی بنا روحانی تجربہ اور مشاہدہ پر ہے عقل و قیاس پر نہیں۔ متکلمین خشتِ اول ہی ٹیڑھی رکھتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے دلائل خواہ کس قدر موثر ہوں۔ ان سے متشککین کی روحانی تسکین نہیں ہوتی۔ اور سرسید کی قابلیت، محبت اور مذہبی ہمدردی کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے علم کلام نے تعلیم یافتہ طبقے یا ارباب شک والحاد کو ایمان کی دولت بہم پہنچائی ہے۔

علم کلام کی سب سے بڑی کمزوری وہی ہے جسے ہم نے متکلمین سے اقبال کا مقابلہ کرتے ہوئے واضح کیا ہے۔ یعنی یہ لوگ انفرادی یا اجتماعی زندگی کی نشوونما کے مثبت اصول پر اتنی توجہ نہیں دیتے۔ جتنی معترضین کے اعتراضوں کے مطابق اپنے خیالات کی قطع و برید پر۔ اور اس طرح اصلاح و ترقی کا اصل راز ان کی نظروں سے چھپ جاتا ہے“

دانشں اندوختہ دل زکف انداختہ

وائے زاں گوہر بے مایہ کہ در باختہ

”حقیقت یہ ہے کہ کسی فرد یا کسی قوم کی ترقی کے لیے جزوی عقائد یا مسائل کو سائنس کے مطابق ناقابل اعتراض ثابت کرنے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی ایمان بالغیب، یقین کامل اور ان اخلاقی و روحانی خوبیوں کی جو مذہب حقہ کا عطیہ ہیں“

(موج کوثر صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۴)

اس علم الکلام نے سرسید کے پیروکاروں میں ایک گونہ تلخی پیدا کر دی تھی، کیونکہ ایک طرف وہ ان تعلیمات کو سچا بھی جانتے تھے۔ ان کی ضرورتوں کا بھی ان کو پورا پورا احساس تھا۔ دوسری طرف وہ روایتی مذہب پر بھی غیر شعوری طور پر دل و جان سے فریفتہ

تھے۔ چنانچہ سچ یہ ہے کہ اس دور میں جن لوگوں کو سرسید نے متاثر کیا۔ ساتھ ہی ان کو اپنی تعلیمات سے ایک گونہ آزردہ بھی کیا۔ ان ہی آزردہ دلوں کو بہت حد تک مرزا غلام احمد نے اپنے طور طریقوں سے سمیٹا۔

سرسید نے عقل کی بنیاد پر قرآنی آیات اور مذہبی تعلیمات وعبادات کی جتنی توجیہات اور تاویلات کی تھیں، مرزا غلام احمد نے ان کے پرخچے اڑا دیئے۔ سرسید نے رسول خدا کے معجزات کو رؤیا کا فعل بتا کر تاویل کرنے کی کوشش کی لیکن مرزا غلام احمد نے ان معجزات کو عقلی اور دلائل کی بنیاد پر درست ثابت کیا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد اپنی کتاب آئینہ کمالات میں لکھتے ہیں۔

"اور اس درجہ لقا میں بعض اوقات انسان سے امور صادر ہوتے ہیں کہ جو بشریت کی طاقتوں سے بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور الہی طاقت کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں جیسے ہمارے سید و مولیٰ سید الرسل حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں ایک سنگریزوں کی مٹھی کفار پر چلائی اور وہ مٹھی کسی دعا کے ذریعے سے نہیں بلکہ خود اپنی روحانی طاقت سے چلائی مگر اس مٹھی نے خدائی طاقت دکھلائی اور مخالف کی فوج پر ایسا خارق عادت اس کا اثر پڑا کہ کوئی ان میں سے ایسا نہ رہا کہ جس کی آنکھ پر اس کا اثر نہ پہنچا ہو اور وہ سب اندھوں کی طرح ہو گئے اور ایسی سراسیمگی اور پریشانی ان میں پیدا ہو گئی کہ مدہوشوں کی طرح بھاگنا شروع کیا۔ اس معجزہ کی طرف اللہ جل شانہ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے۔ وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ یعنی جب تو نے اس مٹھی کو پھینکا وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا تعالے نے پھینکا یعنی درپردہ الہی طاقت کام کر گئی، انسانی طاقت کا یہ کام نہ تھا۔

اور ایسا ہی دوسرا معجزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو شق القمر تھا۔ اس الہی طاقت سے ظہور میں آیا تھا۔ کوئی دعا اس کے ساتھ شامل نہ تھی۔ کیونکہ وہ صرف انگلی کے اشارے سے جو الہی طاقت سے بھری ہوئی تھی، وقوع میں آگیا تھا۔ اور اس قسم کے اور بھی بہت سے معجزات ہیں جو صرف ذاتی اقتدار کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھلائے

جن کے ساتھ کوئی دعا نہ تھی، کئی دفعہ تھوڑے سے پانی کو جو صرف ایک پیالہ میں تھا۔ اپنی انگلیوں کو اس پانی کے اندر داخل کرنے سے اس قدر زیادہ کر دیا کہ تمام لشکر اور اونٹوں اور گھوڑوں نے وہ پانی پیا اور پھر بھی وہ پانی ویسا ہی اتنی مقدار میں موجود تھا۔ اور کئی دفعہ دو چار روٹیوں پر ہاتھ رکھنے سے ہزار ہا بھوکوں پیاسوں کا ان سے شکم سیر کر دیا۔ اور بعض اوقات تھوڑے سے دودھ کو اپنی لبوں سے برکت دے کر ایک جماعت کا پیٹ اس سے بھر دیا۔ اور بعض اوقات شور آب کنویں میں اپنے منہ کا لعاب ڈال کر اس کو نہایت شیریں کر دیا اور بعض اوقات آنکھوں کو جن کے ڈیلے لڑائی کے صدمہ سے باہر جا پڑے تھے۔ اپنے ہاتھ کی برکت سے پھر درست کر دیا۔ ایسا اور بھی بہت سے کام اپنے ذاتی اقتدار سے کیے جن کے ساتھ ایک چھپی ہوئی طاقت الہٰی مخلوط تھی۔

حال کے برہمو اور فلسفی اور نیچری اگر ان معجزات سے انکار کریں تو وہ معذور ہیں وہ اس مرتبہ کو شناخت نہیں کر سکتے۔ جس میں ظلی طور پر الہٰی طاقت انسان کو ملتی ہے۔ پس اگر وہ ایسی باتوں پر ہنسیں تو وہ اپنے ہنسنے میں بھی معذور ہیں۔ کیونکہ انہوں نے بجز طفلانہ حالت کے اور کسی درجہ روحانی بلوغ کو طے نہیں کیا۔ اور نہ صرف اپنی حالت ناقص رکھتے ہیں بلکہ اس بات پر خوش ہیں، کہ اسی حالت ناقصہ میں مریں بھی۔"

اب مرزا غلام احمد کی ان تعبیرات نے ان کے حق میں فضا پیدا کی۔ اور ان کے علم و فضل زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت نے مل کر ان کا ایک حلقہ قائم کر دیا۔ ان کے حلقے کی توسیع میں دوسرا سبب سے بڑا عمل ان کا آریہ سماج کے حملوں کا منہ توڑ جواب ہے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف عیسائی پادریوں کی یورش ہو رہی تھی۔ تو دوسری طرف ہندوؤں کی ایک تحریک بھی حملہ آور ہو رہی تھی۔ کیونکہ ہندوؤں میں بھی ایک خاص قسم کا سیاسی و سماجی عمل جاری تھا۔

ہندوؤں میں ردّ عمل اور آریہ سماج کی تحریک

یہ علم الکلام کی تحریک مسلمانوں میں ہی نہیں ابھری، دراصل پرانے نظام کے تہس نہس ہونے اور نئے طبقات کے جنم لینے سے یہ مذہبی اور اخلاقی تحریکیں صورت پذیر ہوئیں۔

یہ مسلمانوں کی تحریکیں ہوں یا ہندوؤں کی یا سکھوں کی۔ اس وقت ان سب تحریکوں کا خول مذہبی ہی تھا۔ کیونکہ اس دور میں ابھی وہ طبقہ اتنا طاقتور ہی نہیں ہوا تھا اور بعض حالتوں میں تو اس نے جنم ہی لیا تھا۔ جو اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے سیاسی زبان استعمال کرتا۔ اور سیاسی سطح پر لڑائی کا اعلان کرتا۔ چنانچہ اس زمانے میں جب عیسائیت کی یلغار ہو رہی تھی، تو ہندوؤں میں بھی اس یلغار نے قریب قریب وہی ردِ عمل ظاہر کیا جو مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ یعنی ایک گروہ عیسائیت کے یلغار سے متاثر ہو کر اپنے عقائد میں عقلی اور سائنسی بنیادوں پر اصلاح کرنے کا عزم لے کر نکلا یہ ہندوؤں کے ہاں پہلی تحریک تھی، جس نے عقل و برہان پر تکیہ کیا اور مغرب سے اپنے مذہب اور عقائد کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ یہ تحریک برہمو سماج تھی، اس کے بانی رام موہن رائے تھے۔ رام موہن رائے نے ہندوؤں کو یہ راہ سرسید سے تقریباً نصف صدی پہلے دکھائی تھی، کیونکہ بنگال میں مغرب کی یلغار سرسید کے وطن (یوپی) سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی، اس کے بعد انیسویں صدی کے وسطی زمانے میں جب انگریزی حکومت کا دائرۂ اقتدار پورے برصغیر میں پھیل گیا اور جنوبی اور مغربی ہند کے علاقوں میں انگریزی تعلیم پھیلنے لگی۔ صنعتی دور کی بھی ابتدا ہونے لگی۔ اور تعلیم یافتہ حضرات سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانیوں یعنی ہندوؤں کا حصہ طلب کرنے لگے اور ساتھ ہی ہندوستان کی سب سے اعلیٰ ملازمت انڈین سول سروس میں ہندوستانیوں کی شمولیت اور اس کے امتحانات لندن کی بجائے ہندوستان میں لیے جانے کے مطالبات ہونے لگے تو اس زمانے میں ہندوؤں میں ایک نئی مذہبی تحریک "آریہ سماج" نے جنم لیا۔ اس تحریک کے بانی سوامی دیانند سرسوتی گجرات کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے۔ ان کو اردو، پنجابی نہ آتی تھی، ہندی سے بھی وہ نابلد تھے۔ وہ صرف سنسکرت جانتے تھے۔ یا پھر اپنی مادری زبان، لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود ان کی تحریک نے مہاراشٹر یا گجرات کاٹھیاواڑ سے زیادہ پنجاب کے ہندوؤں میں مقبولیت حاصل کی۔ یہ بذاتِ خود ایک بہت ہی اہم موضوع ہے اور اس پر عقلی اور سائنسی بنیادوں پر تحقیق ہونی چاہیئے اس تحریک کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب تلاش ہند میں یوں رقمطراز

ہیں۔" یہ تحریک آریہ سماجی تحریک کہلاتی تھی اور لوگوں کو ویدوں کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی تھی۔ اس کا مطلب دراصل یہ تھا۔ کہ ویدوں کے زمانے کے بعد سے آرین عقیدے میں جو کچھ تبدیلیاں ہوئیں ان کو یک قلم مسترد کر دیا جائے۔ ویدانت کا سارا فلسفہ جس نے آگے چل کر نشوونما پائی۔ وحدت وجود کا مرکزی تخیل اور ہمہ اوست کا نظریہ' اس کے نزدیک اتنا ہی قابل اعتراض تھا۔ جتنی وہ ادنٰے درجے کی تبدیلیاں جو عوام میں مقبول ہوئیں ویدوں کی تعبیر بھی اس نے ایک خاص انداز میں کی۔ آریہ سماج درحقیقت اسلام اور عیسائیت کے اثرات کا ردعمل تھا۔ خصوصاً اسلام کے اثرات کا ایک طرف یہ ایک اندرونی اصلاحی اور مجاہدانہ تحریک تھی' اور دوسری طرف بیرونی حملوں کے مقابلے میں ایک مدافعانہ تنظیم' آریہ سماج نے ہندومت میں تبلیغ کو رواج دیا۔ اور اس طرح اس میں اور دوسرے تبلیغ کرنے والے مذاہب میں تصادم پیدا ہوگیا۔ وہ اپنا یہ فرض سمجھتے تھے۔ کہ ہندوؤں کی زندگی کے ہر پہلو کو دوسرے مذاہب کی مداخلت سے محفوظ رکھیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ یہ تحریک زیادہ تر پنجاب اور صوبجات متحدہ کے متوسط طبقے کے ہندوؤں میں پھیلی' ایک زمانے میں حکومت اس کو ایک سیاسی انقلابی تحریک سمجھتی تھی' مگر چونکہ اس میں سرکاری ملازمین کی ایک بڑی تعداد شامل تھی' اس لیے یہ اندیشہ جاتا رہا۔ اس نے لڑکوں اور لڑکیوں میں تعلیم پھیلانے' عورتوں کی حالت کو سدھارنے اور پسماندہ طبقوں کو ابھارنے میں قابل قدر خدمت انجام دی۔" (تلاش ہند جلد دوم صفحہ ۱۰۰)

لیکن اس تحریک کی پنجاب میں مقبولیت کی وجہ اس زمانے کے پنجاب کے مخصوص حالات تھے۔ جن کا تفصیل سے ذکر آپ "ماسٹر سیوک سنگھ" متعلق باب میں پڑھ آتے ہیں۔

چنانچہ آریہ سماج کی تحریک کی یلغار نے بھی مسلمانوں کو بہت پریشان کیا۔ کیونکہ دیکھتے دیکھتے پنجاب کا تعلیم یافتہ ہندو اس تحریک کا نہ صرف گرویدہ نظر آنے لگا۔ بلکہ وہ ایک گونہ اس کا مبلغ بن گیا۔ اور پہلی دفعہ ہندوؤں میں ایک ایسی تحریک ابھری۔ جس نے اپنے مذہب کی تبلیغ کا بیڑا اٹھایا۔ اور اس تحریک نے پہلی بار عملی زندگی میں ہندوؤں

کے تقدس اور علم پر اجارہ داری کے خلاف آواز اٹھائی۔ دراصل ہندوؤں کے نئے اُبھرتے ہوئے تاجر طبقہ کو اس قسم کی تحریک کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ یہ تاجر اور پیشہ ور جن میں وکیل، ڈاکٹر، سرکاری ملازم سبھی شامل تھے، اس بات سے بہت ستائے ہوئے تھے کہ ان کے پاس علم بھی ہو۔ دولت بھی، لیکن اس کے باوجود معاشرے میں رعب و داب، اثر و رسوخ اور تقدس برہمنوں کو حاصل ہو، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب آریہ سماج نے ذات پات کی تمیز کے خلاف آواز اٹھائی تو کھتریوں نے سب سے زیادہ اس تحریک کو لبیک کہا۔

اب جبکہ آریہ سماج نے ہندو مت کو دلائل اور جدید رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تو اس کے لیے اس نے اسلام اور عیسائیت پر حملے بھی ضروری سمجھے، اور مذہبی تحریکوں کی توسیع اور ان میں شدت کرنے کے لیے دوسرے مذاہب اور اس کے پیروکاروں کو نشانہ بنایا جائے۔ چنانچہ آریہ سماج نے اس سلسلے میں مسلمانوں کو بہت حد تک چِڑایا اور اسلامی تعلیمات اور رسول خدا کا مضحکہ اڑایا۔ ان تعلیمات نے پنجاب کے ہندو کھتری اور پیشہ ور طبقے کو بہت مطمئن اور متاثر کیا۔ کیونکہ اسے مسلمان کاشت کار اور زمیندار کو لوٹنے کے لیے ایک مذہبی جواز کی بھی ضرورت تھی۔ جو آریہ سماج کی تعلیمات نے مہیا کیا۔ اس کا ردِ عمل مسلمانوں میں ہونا بھی لازمی تھا۔ چنانچہ اس ردِ عمل نے جو تقاضے مسلمانوں کے اندر پیدا کیے۔ ان کو مذہبی سطح پر مرزا غلام احمد نے آریہ سماج کی تعلیمات پر حملے کر کے پورا کیا۔ مرزا غلام احمد کے اس کارنامہ کے متعلق ان کے مشہور سوانح نگار ڈاکٹر بشارت احمد اپنی مشہور کتاب "مجددِ اعظم" میں یوں رقمطراز ہیں:

"آریہ سماج کی ان دنوں تعمیر ہو رہی تھی، پنڈت دیانند بانی آریہ سماج خود موجود تھے تعلیم یافتہ ہندوؤں کو اپنے مذہب سے متنفر دیکھ کر پنڈت جی جو اصلاحات کر رہے تھے اس کے لیے وہ نئے سے نئے عقائد اور اصول اختراع کر رہے تھے۔ جن میں بعض بنیادی عقائد اور اصول اساسی دراصل اس زمانہ کی مادیت اور دہریت کے خیالات تھے، جو مذہب اور روحانیت اور معرفت الٰہی کے اگرچہ سخت مخالف تھے مگر چونکہ اس وقت کے مادی تعلیم کے دلدادہ لوگوں میں مقبول تھے۔ اس لیے پنڈت جی انہیں کھینچ کر دیدوں میں سے

نکالنے کی کوشش کرتے اور آریہ سماج کا بنیادی پتھر انہیں قرار دے کر گویا اپنے مذہب کو ایک سائنٹفک رنگ دینا چاہتے تھے۔ انہی میں مادہ اور روحوں کا ازلی ابدی ہونا بھی ایک عقیدہ تھا جو اپنی ایجاد کے لیے ویدوں کی بجائے مادہ پرستی کا زیادہ تر رہین منت تھا۔ فرق اتنا تھا کہ مادہ کے ازلی ابدی ہونے کے ساتھ ارواح کا ازلی ابدی ہونا بھی پنڈت جی نے ساتھ جوڑ کر اسے بظاہر ایک مذہبی رنگ دے دیا۔ مگر حقیقت میں روح ہو یا مادہ وہ جب ازلی ابدی ہیں تو پھر خدا کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے۔ جب ارواح ازلی ابدی ہیں، اور پرمیشور نے ان کو پیدا ہی نہیں کیا۔ تو پھر ماننا پڑے گا۔ کہ کسی نامعلوم وجہ سے پرمیشور نے ان پر ناحق زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ اور ان کو تناسخ میں مبتلا کر رکھا ہے چنانچہ پنڈت دیانند جی نے اس اعتراض کو رفع کرنے کے لیے کہ تناسخ کے چکر سے آخر کار ایک دن سب ارواح رفتہ رفتہ نکل جائیں گے۔ تو پرمیشور کی خدائی کہاں باقی رہے گی۔ ایک اور عجیب و غریب عقیدہ اختراع کیا جو آریہ سماج کی طرف سے ۲ دسمبر ۱۸۷۷ء کے اخبار "وکیل" میں اس طرح شائع ہوا کہ:۔

"ارواح موجودہ بے انت ہیں، اور اس کثرت سے ہیں کہ پرمیشور کو بھی ان کی تعداد معلوم نہیں اس واسطے ہمیشہ مکتی پاتے رہیں گے اور کبھی ختم نہیں ہوں گے۔"

حضرت مرزا صاحب کی نظر سے جب یہ اعلان گزرا تو آپ نے اسے اللہ تعالےٰ کی عظمت و جبروت کے سخت خلاف اور اس کی صفات اور معرفت کے صد درجہ منافی پاکر ضروری سمجھا کہ اس کی لغویت کو طشت از بام کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے ۹ فروری ۱۸۷۸ء سے شروع کرکے ۹ مارچ ۱۸۷۸ء تک اخبار سفیر ہند امرتسر میں متعدد مضامین لکھ کر اس لغو عقیدہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اور آپ کو ان مضامین کی معقولیت اور قوت و صحت پر اتنا یقین تھا کہ ساتھ ہی پانچ سو روپے کا انعام اس شخص کے لیے شائع کر دیا۔ جو ان مضامین کا مدلل جواب دے۔"

(مجدد اعظم صفحہ ۸۴ - ۸۵)

ان تمام سرگرمیوں نے مرزا غلام احمد کو اپنے متشدد پیرو کاروں کا ایک مضبوط اور موثر حلقہ پیدا کرنے میں مدد دی، چنانچہ آریہ سماج کے خلاف مرزا غلام احمد نے جو تصنیف و تالیف کی، جو مناظرے اور مباحثے ترتیب دیئے۔ ان سبھی اقدام نے پڑھے لکھے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ اور ان میں اچھی خاصی تعداد میں چھوٹے موٹے سرکاری ملازمین بھی تھے۔ کیونکہ ہندوؤں میں بالعموم آریہ سماج کی تحریک پنجاب میں سرکاری ملازمین اور وکیل اور ڈاکٹروں میں ہی پھل پھول رہی تھی۔ اور ان سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے مسلمان بھی آریہ سماج کا مقابلہ کرنے کے لیے دلائل اور منطق کے متلاشی تھے۔ چنانچہ اس محاذ پر بھی مرزا غلام احمد نے ہی ان مسلمانوں کی تشفی کی۔

جہاد بالسیف اور مرزا غلام احمد

تیسرا اہم محاذ انگریز سے تعاون اور دوستی کا تھا۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ پنجاب میں پہلے دن سے ایسے مسلمانوں کا تھا۔ جو انگریزی راج کی اہمیت کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ ان کو سکھوں کے مظالم اور صدی ڈیڑھ صدی کی طویل بدامنی کے بعد ایک مرکزی حکومت نظر آئی تھی۔ جو ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضامن تھی جو روٹی روزگار کے وسائل مہیا کر رہی تھی۔ جو ریل اور تار برقی کے جال بچھا رہی تھی، جو نہریں کھود رہی تھی، اور اراضی زیر کاشت لا رہی تھی، غرضیکہ یہ وہ دور تھا۔ جس میں انگریزی راج کے مثبت پہلو زیادہ نمایاں تھے۔ چنانچہ مرزا غلام احمد نے سرسید اور ان کے رفقا کی مانند جہاد کے سلسلے میں بھی اپنا مسلک عام مسلمانوں سے مختلف ٹھہرایا اور اس ضمن میں بھی انہوں نے مسلمانوں کے اس طبقے کی روحانی اور دینی تشفی کی جو یہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اب جہاد بالسیف کا زمانہ لد گیا چنانچہ مرزا غلام احمد اپنے رسالے "گورنمنٹ انگریزی اور جہاد" میں لکھتے ہیں۔

> "ابھی بہتیرے ایسے لوگ زندہ ہیں جنہوں نے کسی قدر سکھوں کا زمانہ دیکھا ہوگا۔ اب وہی بتائیں کہ سکھوں کے عہد میں مسلمانوں اور اسلام کا کیا حال تھا۔

ایک ضروری شعارِ اسلام کا جو بانگ نماز ہے وہی ایک جرم کی صورت میں سمجھا گیا تھا۔ کیا مجال تھی کہ کوئی اونچی آواز سے بانگ کہتا اور پھر سکھوں کے نیزوں اور برچھوں سے بچ رہتا۔ تو اب کیا خدا نے یہ بُرا کام کیا جو سکھوں کی بیجا دست اندازیوں سے مسلمانوں کو چھڑایا اور گورنمنٹ انگریزی کی امن بخش حکومت میں داخل کیا۔ اور اس گورنمنٹ کے آتے ہی گویا نئے سرے سے پنجاب کے مسلمان مشرف بہ اسلام ہوئے۔ چونکہ احسان کا عوض احسان ہے۔ اس لیے نہیں چاہیئے کہ ہم اس خدا کی نعمت کو جو ہزاروں دعاؤں کے بعد سکھوں کے زمانے کے عوض ہم کو ملی ہے۔ یونہی رد کر دیں۔"

پھر ایک اور تقریر میں جو "الحکم" ۱۷ جون ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی فرماتے ہیں۔

"محسن کے احسانات کی شکر گزاری کے اصول سے ناواقف جاہل ہمارے اس قسم کے بیانات اور تحریروں کو خوشامد کہتے ہیں۔ مگر ہمارا خدا بہتر جانتا ہے کہ ہم دنیا میں کسی انسان کی خوشامد کر سکتے ہی نہیں یہ قوت ہی ہم میں نہیں ہے۔ ہاں احسان کی قدر کرنا ہماری سرشت میں ہے اور محسن کشی اور غداری کا ناپاک مادہ اس نے اپنے فضل سے ہم میں نہیں رکھا۔ ہم گورنمنٹ انگلشیہ کے احسانات کی قدر کرتے ہیں اور اس کو خدا کا فضل سمجھتے ہیں کہ اس نے ایک عادل گورنمنٹ کو سکھوں کے پُر جفا زمانہ سے نجات دلانے کے لیے ہم پر حکومت کرنے کو کئی ہزار کوس سے بھیج دیا۔ اگر اس سلطنت کا وجود نہ ہوتا۔ تو میں سچ کہتا ہوں کہ ہم مخالفین اسلام کے اعتراضوں کی بابت ذرا بھی نہ سوچ سکتے۔ چہ جائیکہ ہم ان کا جواب دے سکتے۔ اب ہم ان اعتراضوں کا جواب بڑی آزادی سے دے سکتے ہیں پھر اگر ہم اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر نہ کریں تو یقیناً سمجھ لو بڑے ناقدر شناس اور ناشکر گزار ہوں گے۔ مختصر یہ کہ یہ مقام دارالحرب ہے۔ پادریوں کے مقابلے میں۔ اس لیے ہم کو چاہیئے کہ ہم ہرگز بیکار نہ بیٹھیں۔ مگر یاد رکھو کہ ہماری حرب ان کے ہم رنگ ہو۔ جس قسم کے ہتھیار لے کر میدان میں وہ آتے ہیں۔ اسی طرز کے ہتھیار ہم کو لے کر نکلنا چاہیئے۔ اور وہ ہتھیار ہے قلم۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کا نام سلطان القلم رکھا اور میرے قلم کو ذوالفقار علی فرمایا۔

اس میں یہی سِر ہے کہ یہ زمانہ مذہب کی خاطر جنگ وجدال کا زمانہ نہیں ہے۔ بلکہ قلم کا زمانہ ہے۔ پھر جب یہ بات ہے تو یاد رکھو کہ حقائق اور معارف کے دروازوں کے کھلنے کے لیے ضرورت ہے تقویٰ کی۔ اس لیے تقویٰ اختیار کرو۔۔۔ فتح اسی کو ملتی ہے۔ جس سے خدا خوش ہو۔ اس لیے ضروری امر یہ ہے کہ اپنے اخلاق اور اعمال میں ترقی کریں اور تقویٰ اختیار کریں۔ تاکہ خدا تعالےٰ کی نصرت اور محبت کا فیض ہمیں ملے۔ پھر خدا کی مدد کو لے کر ہمارا فرض ہے اور ہر ایک ہم میں سے جو کچھ کر سکتا ہے اس کو لازم ہے کہ وہ ان حملوں کے جواب دینے میں کوئی کوتاہی نہ کرے ہاں جواب دیتے وقت نیت یہی ہو کہ خدا تعالیٰ کا جلال ظاہر ہو۔"

ان تعلیمات اور مرزا غلام احمد کے علم وفضل اور لاانداز تصانیف نے جہاں ان کے معتقدین کا ایک حلقہ پیدا کیا وہاں ان کے دعویٰ مسیحیت، مہدیت اور نبوت نے ان کے خلاف بھی ایک محاذ قائم کر دیا۔ اس حمایت ومخالفت کی کش مکش میں مرزا صاحب نے اپنے حلقہ کو ٹھوس بنیادوں پر منظم کیا۔ اب ذرا اس تنظیمی ڈھانچے کو ملاحظہ فرمایا جائے۔ تو اس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

اوّل : مرزا غلام احمد نے اپنا ہیڈ کوارٹر شہر سے دُور ایک قصبے میں قائم کیا۔

دوم : یہ قصبہ ایسا تھا۔ جس پر خود مرزا صاحب کی بحیثیت رئیس کے بالادستی قائم تھی۔

سوم : اپنی بے پناہ تصانیف سے انہوں نے مختلف بنیادوں پر مسلمانوں کے بڑے طبقوں کو متاثر کیا۔

چہارم : دعویٰ مسیحیت، نبوت اور مہدیت کی وجہ سے جو حلقہ قائم ہوا اس میں بلا کی مذہبی شیفتگی پیدا ہو گئی۔ اور وہ واقعی قادیان کو مقام مقدس تصور کرنے لگے۔

پنجم : مرزا صاحب نے اپنے حلقہ کی اس شیفتگی کو اور آگے بڑھایا۔ اور اپنے پیروؤں اور اہم مریدوں کو قادیان میں آباد ہونے کا شوق دلایا۔

ششم : ابتدا میں علما کی مخالفت اور کفر کے فتووں نے مرزا صاحب کو اگر ایک طرف خاصی اہمیت بہم پہنچائی تو دوسری طرف ان کے پیروؤں میں ہم آہنگی، یگانگت اور بھائی چارہ کا کہیں زیادہ اضافہ کر دیا۔ اور وہ پہلے دن سے ہی ایک الگ حیثیت میں مسلمانوں سے ممیز فرقہ قائم ہوتا چلا گیا۔ جس کا تمام ڈھانچہ اور نظام سوچ سمجھ کر قائم کیا گیا تھا۔ اور

علامہ کی اس تعریف سے یہ مراد نہیں لی جا سکتی کہ انہوں نے مرزا صاحب کی تعلیمات کی صداقت کو تسلیم کیا۔ بلکہ وہ صرف اس تحریک کے ظاہری خول اور ان کے کاموں سے متاثر ہوئے تھے لیکن ۱۹۳۵ء میں جب صورت حال مختلف ہوئی۔ اور ایک عمومی سامراج دشمن تحریک مسلمانوں میں اُبھرنے لگی۔ تو اس وقت خلاف توقع مسلمانوں کی قیادت کے لیے مرزا بشیر الدین محمود کا ہاتھ پاؤں مارنا ایک طوفان کو دعوت دینے کے مترادف ہو گیا اور اس طوفان بلا کی کھیون ہار ایک طرف اگر مجلس احرار قرار پائی تو دوسری طرف علامہ اقبال نے نظری طور پر اس تحریک کا تجزیہ کر کے تعلیم یافتہ افراد میں احمدیت کے سیلاب کو بند باندھنے کا کام کیا۔ انہوں نے اپنی ۱۹۱۱ء کی تقریر کی بھی وضاحت کی اور کہا:-

"جہاں تک مجھے یاد ہے' یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء میں یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی' اس سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے' جو مسلمانوں میں کافی سر برآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ بانی تحریک کے ساتھ تعاون کیا۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ کتاب موسومہ براہین احمدیہ میں انہوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی۔ لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں۔ کہ خود ان لوگوں کو جو بانی تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے۔ معلوم نہ تھا۔ کہ تحریک آگے چل کر کس راستے پر پڑ جائے گی۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے اگر میرے موجودہ رویے میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے۔ کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول "ایمرسن" صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔"

جب ڈاکٹر اقبال جیسا عظیم مفکر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ تو دوسرے لوگوں کا ایسا سمجھ لینا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ علامہ اقبال نے مرزا صاحب کے پیروؤں کے بارے میں اور خود مرزا صاحب کی نسبت ہمدردانہ رویہ قائم رکھا۔ چنانچہ انہوں نے احمدیہ تحریک کے اسباب کی نسبت اپنا خیال ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

"اسلام کے رخساروں پر اس وقت احمدیت کی جو زردی نظر آرہی ہے۔ وہ مسلمانانِ ہند کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں کوئی ناگہانی واقعہ نہیں ہے۔ وہ خیالات جو بالآخر اس تحریک میں رونما ہوئے ہیں۔ بانیٔ احمدیت کی ولادت سے پہلے دینیاتی مباحث میں نمایاں رہ چکے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ بانیٔ احمدیت اور اس کے رفقاء نے سوچ سمجھ کر اپنا پروگرام تیار کیا ہے۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ بانیٔ احمدیت نے ایک آواز سنی، لیکن اس امر کا تصفیہ کہ یہ آواز اس خدا کی طرف سے تھی، جس کے ہاتھ میں زندگی اور طاقت ہے یا یہ لوگوں کے روحانی افلاس سے پیدا ہوئی۔ اس تحریک کی نوعیت پر منحصر ہونا چاہیے۔ جو اس آواز کی آفریدہ ہے اور ان افکار و جذبات پر بھی جو اس آواز نے اپنے سننے والوں میں پیدا کیے ہیں۔ میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنہوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا ہے۔ زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔"

لیکن علامہ اقبال کی نظری مخالفت ہو یا مجلس احرار کی قادیان مخالف عوامی تحریک کا جزبہ سب فکر و عمل سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۵ء کے درمیان کیوں ظہور پذیر ہوا۔ ؟ قادیانی تو اس سے پہلے بھی تھے اور مختلف مساجد، خانقاہوں اور دینی مدارس میں مرزا غلام احمد اور ان کے پیروؤں کی تعلیمات کے خلاف فتوے اور درس بھی دیئے جاتے رہے ہوں گے۔ لیکن عوامی غیض و غضب اس سے پہلے اس شدت سے کیوں نہ ابھرا؟ اس سوال کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے لیکن ایک اہم وجہ اس دور کی سامراج دشمن تحریک کی تندرستی و توانائی تھی۔ اس تندرستی و توانائی کا تذکرہ میں نے قدرے تفصیل سے راشٹریہ سیوک سنگھ کی تحریک

کی داستان بیان کرتے ہوئے تحریر کر دیا ہے۔ اس دور میں نوجوان بھارت سبھا کا قیام، بھگت سنگھ اور ان کے گروہ کی دہشت پسندی، اقتصادی بحران کی گہرائی، سوویت روس کی صنعتی ترقی اور عالمی اقتصادی بحران سے نجات یہ تمام عناصر انگریزی سامراج کی گرفت کو ہندوستان پر کمزور کر رہے تھے، چنانچہ یہی فضا تھی، جس میں اگر ایک طرف کانگریس نے تحریک کا اجراء کیا تو دوسری طرف برطانوی سامراج نے عوامی تحریک کو انقلابی راہوں سے ہٹانے کے لیے گول میز کانفرنسوں کا انعقاد شروع کیا۔ یہی دور تھا جس میں مرزا بشیر الدین محمود نے کشمیر کمیٹی کے ذریعے مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کی کوشش کی۔ مجلس احرار نے جب یہ دیکھا تو ان کی سامراج دشمن حس نے فوراً بھانپ لیا۔ کہ ہو نہ ہو اس میں برطانوی سامراج کی شعوری اور غیر شعوری کوششیں شامل ہیں۔ اسی فضا نے علامہ اقبال کو متاثر کیا کیونکہ قادیانیوں کی گھٹی میں انگریز دوستی اور سامراج پرستی پڑی ہوئی تھی۔ اور ایسے لوگوں کے خلاف سامراج دشمن فضا میں نفرت اور عوامی غیظ و غضب کا بڑھ جانا اور عوام کے صبر و شکیب کے پیمانے کا لبریز ہو جانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ اس کے بعد قادیانیوں کے خلاف تحریک کبھی بھی سرد نہ پڑ سکی۔ اس کی بنیادی وجہ قادیانیوں کی طرف سے عامۃ المسلمین کی سامراج دشمن تحریکوں کی مخالفت تھی، جب بھی اس خطے میں مروجہ نظام اور سامراج کے خلاف مسلم عوام نے جدوجہد کی تو ان کو کسی نہ کسی طرح یہ باور ہو گیا کہ قادیانی ہر اس طاقت کے ساتھ ہیں، جو عوام کو کچل رہی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں یہ عقیدہ بہت حد تک راسخ ہو گیا۔ کہ سامراجیوں کی سازشوں پر نگاہ رکھنے کے لیے قادیانیوں پر نگاہ رکھنی ضروری ہے۔ ویسے ایک اقلیتی فرقہ، جس نے مسلمانوں کے اکثریتی فرقے کے غیظ و غضب کو للکارا ہو۔ اس کے لیے ہمیشہ حکومت وقت کا سہارا لینا لازمی ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا عمل تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے یہ فرقہ ایک بوسیدہ نظام اور اس کے محافظوں کی پناہ ڈھونڈتا گیا، عوام جو اس بوسیدہ نظام کے تلے پس رہے تھے، وہ ان پناہ ڈھونڈنے والوں اور بوسیدہ نظام کے دونوں ہی کے مخالف ہوتے گئے۔ یہ احمدیہ تحریک کی مخالفت اور اس کے زوال کا ایک غیر دینی (سیکولر) پہلو ہے جس کو ہمارے بہت سے مفکرین اور سیاست دان بھی اپنے دلی گروہی تعصب میں نہیں پاتے اور جب

احرار نے جب اس تحریک کا پرچم بلند کیا۔ تو وہ ان کی عمومی روایت کے مطابق تھا۔ کہ مذہب کو سامراج دشمن تحریکوں کے لیے استعمال کرنا ضروری ہے۔ یہی طریقہ ان کو کبھی مقبولیت کی بلندیوں پر لے جاتا اور بالآخر اسی نے ان کو محرومیوں اور عوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بنا دیا۔ کیونکہ سامراج دشمنی کے لیے معاشی، اقتصادی اور سماجی عوامل پر نگاہ رکھے ہوئے جس سیاسی عملی پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے، مجلس احرار اس سے تہی داماں رہی۔

خاکسار تحریک

۱۹ مارچ

قرارداد پاکستان کو ایک زمانہ بیت رہا ہے۔ لیکن بعض قراردادیں تاریخ ساز ہوتی ہیں، ان کو زمانے کی رفتار، وقت کا گزران اور ایام کی گرد بھی نہیں چھپا سکتی؛ ان کو تاریخ محفوظ رکھتی، زمانہ خود ان کی یادوں کو جلا دیتا ہے۔ اور وقت خود ان قراردادوں سے متعلق یادوں کی چنگاریوں کو ہوا دیتا رہتا ہے۔ اور یہ شعلۂ جوالہ بن کر لوگوں کے سینوں کو حرارت بخشتی ہیں۔ اور یہی حرارت زندگی کہلاتی ہے۔

یہ ۱۹۴۰ء کی بات تھی، اس گزرے ہوئے زمانے کی یادوں کو بہت سوں نے محفوظ کیا ہے اور یہ داستان ہر انداز سے دلچسپ بھی ہے اور عبرتناک بھی۔ لیکن اس داستان سے متعلق اور منسلک ایک اور داستان بھی ہے اور مجھے آج یہی دوسری داستان بیان کرنا ہے۔

اس داستان سے کچھ تلخ یادیں بھی وابستہ ہیں؛ اور جب بھی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا ذکر چھڑتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ۱۹ مارچ کے واقعات بھی ذہن میں ابھر آتے ہیں، ۱۹ مارچ کو جب مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کے انعقاد میں صرف ۳۶ گھنٹے رہ گئے تھے، تو پنڈال سے چند سو گز کے فاصلے پر پولیس اور خاکساروں کے درمیان زبردست تصادم ہو گیا۔ یہ تصادم ۱۹ مارچ کو شاہی مسجد

کے پہلو میں دوپہر کو گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ہوا تھا۔ شام تک شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہو چکی تھی۔ کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ گھروں سے نکلنا ممنوع ہو چکا تھا۔ اخبارات پر سنسر بٹھا دیا گیا تھا۔ اور چاروں طرف مسلح فوج اور پولیس گشت کر رہی تھی۔ چھتیس گھنٹے بعد کل ہند مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح کو لاہور پہنچنا تھا۔ اور ۲۱ مارچ کی صبح کو ان کے لیے ایک عظیم الشان جلوس نکلنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس کی تیاریاں مکمل تھیں۔ دُور دراز سے رضاکاروں کی ٹولیاں پہنچ چکی تھیں، شہر کے محلے محلے کی اپنی اپنی الگ الگ ٹولیاں منظم ہو رہی تھیں۔ اور رضاکار اپنی وردیوں کو رنگوانے اور جوتوں کو پالش کرنے میں مصروف تھے۔ غرضیکہ اچھا خاصا ہنگامہ تھا۔ مگر اس واقعہ نے تمام شہر کی توجہ اس تاریخی جلسے سے ہٹا کر تڑپتی ہوئی لاشوں اور شہداء کے بیوی بچوں کے نالہ و شیون کی طرف مبذول کر دی۔ اب ہر طرف اسی واقعہ کا تذکرہ اور اسی ظلم کا رونا تھا۔ اس تصادم کو بھی سالہا سال گزر چکے ہیں مگر آج بھی یہ سوال جواب طلب ہے کہ یہ تصادم کیوں ہوا؟ اس کا جواب آسان بھی ہے اور قابل یقین بھی کہ ہر ملک میں اس قسم کے تصادم ہو ہی جاتے ہیں پولیس اور مظاہرین آپس میں دست و گریبان ہوا ہی کرتے ہیں۔ جذبات کی برانگیختگی ہمیشہ نظم و نسق اور امن و قانون کے محافظوں کے ماتھے پر بل ڈالنے کا موجب ہوتی ہے۔ چلیے یہ بھی تسلیم لیکن ایک سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ اس مظاہرے کے لیے مسلم لیگ کے اجلاس سے ۳۶ گھنٹے پہلے کا وقت کیوں منتخب کیا گیا تھا؟ یہی مظاہرے اور قانون کی خلاف ورزی اس اجلاس سے دو ہفتے پہلے کیوں نہ ہوئی تھی؟ یا اجلاس کے ایک ہفتہ بعد اس مظاہرے اور خلاف ورزی کا اقدام کیوں نہ کیا گیا تھا؟

یہ سوال آج بھی تشنۂ جواب ہیں، اور ان کا جواب ڈھونڈنا ضروری ہے۔ کیونکہ تاریخ مرتب کرتے وقت یہ سوالات لازماً پیدا ہوں گے اور ان کے جوابات ناگزیر ہوں گے! پھر اگر آج جواب تلاش کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس موضوع پر کبھی روشنی ڈالی نہ جاسکے گی۔ کیونکہ ابھی اس دور کے وہ نمائندے موجود ہیں، جن کے ہاتھوں میں اس وقت سیاسیات کا دھارا تھا۔ یا وہ اپنے افعال سے سیاست کے دھارے کو موڑنے یا متاثر کرنے کی قدرت رکھتے تھے! اور ان میں سے بھی کئی ایک بقید حیات ہیں۔ جو سارے واقعات کے عینی شاہد اور راز درون پردہ سے واقف ہیں۔ یہ لوگ

مورخ کے لیے آسانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی اتنے برس گزرنے کے بعد اب ان واقعات پر رائے زنی کی جا سکتی ہے۔ ٹھنڈے دل سے سوچا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اب اضطرابی اور ہیجانی کیفیت کا دور نہیں ہے۔ گو ممکن ہے آج بھی اس سلسلے میں کسی رائے سے بعض لوگوں کو اختلاف ہو لیکن یہ اختلاف اور اس کا اظہار مزید روشنی کا ہی باعث بنے گا۔ یہ سوال جن کے جوابات معلوم کرنے کے لیے یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ اس زمانہ میں بھی پوچھے گئے تھے، مجلس دستور ساز کے ایوانوں، عام جلسوں اور جلوسوں میں انہیں دہرایا گیا تھا۔ اور ان کے جوابات دیئے گئے تھے، اخبارات کی فائلیں ان کی گواہ ہیں، لیکن اس وقت جو سوال ہوئے یا جواب ملے، ان میں کوئی اطمینان بخش نہیں ہے۔ کیونکہ سوالوں کے پیچھے بھی سیاسی جذبہ اور رائے عامہ کی خوشنودی یا رائے عامہ سے خوف کی جھلک موجود تھی۔ اس زمانہ میں خاکسار جانبازوں نے اپنے سروں پر کفن باندھ کر سینے تان کر پولیس کی گولیاں کھائی تھیں، ان کی بہادری اور قربانی بے مثال تھی۔ آج بیس برس بعد اس خون کی یاد تازہ ہے، ان جیالے نوجوانوں کا خون آج بھی قابل احترام ہے لیکن آج جذبات سے مغلوب ہوتے بغیر ان واقعات کو جانچا جا سکتا ہے۔ اور آج یہ مسئلہ بھی زیر بحث آ سکتا ہے کہ کون سی تحریک بحیثیت مجموعی فائدہ مند رہی اور کون سی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس میں بھی اختلاف رائے ہوگا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اختلاف سے بے نیاز ہو کر ان تحریکوں کو جانچا جائے اور اگلی پود تک ان تحریکوں کے مجموعی تاثر اور نتائج کو پہنچایا جائے۔

خاکسار تحریک کا پس منظر

خاکسار تحریک کے عروج کی داستان ۱۹۳۰ء کی دہائی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ زمانہ بڑی بڑی تبدیلیوں کا دور تھا۔ اور صرف برِ‌صغیر اور اس میں بسنے والی مختلف قومیں ہی ان تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہو رہی تھیں، بلکہ بین الاقوامی فضا بھی ان سے بیگانہ نہیں تھی، یہ زمانہ اور دور بڑے کرب کا دور تھا۔ اس برِ‌صغیر میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں زبردست معاشی بحران اپنی پرچھائیاں ڈال رہا تھا۔ یہ معاشی بحران سرمایہ داری نظام کا ایک زبردست خاصہ ہے۔ اس پر سرمایہ داری نظام

کے ماہرین نے صفحات کے صفحات قلم بند کیئے ہیں۔

سرمایہ داری نظام کے حامیوں اور محافظوں نے ان بحرانوں کی روک تھام کے لیے بڑے بڑے جتن کیئے ہیں۔ لیکن یہ بحران رکنے نہیں پاتے۔ معاشی بحران کیا ہوتا ہے۔ اقتصادی ماہرین اس پہ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ لیکن اس بحران کے بعض پہلو ہر ایک کے سامنے ہوتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں پیداوار اور اس کی کھپت میں ایک زبردست تضاد پیدا ہو جاتا ہے اور یہ تضاد بڑھتے بڑھتے پوری سرمایہ دار دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ کارخانوں میں بنی ہوئی اشیا پڑی رہتی ہیں۔ اور ان کو خریدنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کیونکہ سرمایہ داری نظام کی لوٹ کھسوٹ عوام کی قوت خرید کو اس حد تک متاثر کر دیتی ہے کہ وہ بے بس ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً ایک طرف کارخانے بند ہونے لگتے ہیں مزدوروں کی چھانٹی شروع ہو جاتی ہے، اجرتوں میں کمی روز مرہ کا معمول ہو جاتا ہے پھر بے روزگاروں کے ہجوم سڑکوں پر نکلنے لگتے ہیں۔ عوام اس نظام کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور سرمایہ داری کے محافظ گولی لاٹھی لے کر باہر آجاتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں بھی اس قسم کے بحران نے سر نکالا تھا۔ یورپ، امریکہ، ایشیا سبھی جگہ پر اس بحران کے اثرات نمایاں ہو رہے تھے لیکن اس دفعہ کے بحران میں شدت اور بھی پیدا ہو گئی تھی اس لیے کہ اس روئے زمین پر ایک ٹکڑہ ارضی ایسا بھی تھا جہاں یہ بحران نہیں تھا وہاں اور قسم کی غلطیاں اور زیادتیاں ہو رہی ہوں تو ہوں لیکن معاشی بحران کم از کم نہیں تھا۔ وہاں بے روزگاری نہیں تھی، ہڑتالیں نہیں تھیں، غریبوں اور فاقہ کشوں کے جلوس نہیں تھے، یہ پہلا اشتراکی ملک روس تھا کیونکہ وہاں کی معیشت میں سرمایہ داری کو ختم کر دیا گیا تھا۔ اس لیے وہاں کی پیداوار اور عوام کی ضروریات میں تناسب برقرار تھا۔ اور پہلی بار اشتراکی دنیا کی منصوبہ بندی کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ چنانچہ سرمایہ دار دنیا میں بحران نے اشتراکی دنیا کی کامیاب منصوبہ بندی کو اور بھی اہمیت عطا کر دی۔ چنانچہ یورپ کے ہر ملک کے مزدور، بے روزگار اور فاقہ کش کی نظریں سوویت روس کی طرف اٹھنے لگیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب دنیا میں بالعموم اور یورپ میں بالخصوص انقلابی اور سوشلسٹ دوست تحریکیں زیادہ ابھریں اور انہوں نے زبردست ترقی کی۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب ان بڑھتی ہوئی سوشلسٹ دوست تحریکوں کو دبانے کے لیے مختلف ممالک میں فاشزم کی تحریکیں بھی ابھریں دونوں تحریکوں کی بنیاد عوام کی زبوں حالی

پر کھڑی ہوئی لیکن ایک تحریک یعنی فاشزم کی تحریک ایک کٹر اور متعصب قوم پرستی کی تحریک بن گئی۔ اس تحریک کو خود سرمایہ داروں نے اپنا لیا اور اس طرح سے یہ تحریک جو جرمن اور اطالوی عوام کی زبوں حالی کے نام پر شروع ہوئی وہ دنیا میں بدترین آمرانہ تحریکوں کی شکل اختیار کر گئی۔

یہ تھے حالات جب خاکسار تحریک ابھری۔ لیکن اس زمانے میں صرف خاکسار تحریک ہی نہیں ابھری۔ بلکہ پورے ہندوستان میں کئی تحریکیں اور نئے ولولے دیکھنے میں آئے۔ ہندوستان کا نیم براعظم بھی زبردست اقتصادی بحران کا شکار تھا۔ یہاں بھی عوام بے روزگاری کا شکار ہو رہے تھے۔ چنانچہ شمالی ہند میں مسلمانوں میں اسی زمانے میں ایک طرف احرار کا قیام عمل میں آیا۔ دوسری طرف خاکسار نے چپ راست کا نعرہ لگایا۔ یہ دونوں تحریکیں شہروں کے نچلے طبقے کے بے روزگاروں، نیم بے روزگاروں اور غریب عوام کی نمائندگی کرتی تھیں۔ لیکن احرار سیاسی زبان استعمال کرتے تھے وہ سیاسی اسلوب سے سوچتے تھے۔ وہ رائے عامہ کو منظم کرنے کے حامی تھے۔ وہ عدم تشدد کو سیاست میں ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن دوسری طرف خاکسار تحریک میں شدت تھی۔ نفرت کی چنگاریاں، عوام کی مجبوری و بے بسی کے خلاف شدید احتجاج تھا۔ اور اس احتجاج کے لیے جب عام بے روزگار نوجوان فوجی وردی میں ملبوس اور بیلچہ کندھے پر رکھتا تو اسے ایک گونہ تسلی ہوتی کہ وہ بے بس نہیں ہے۔ وہ بے آسرا نہیں۔ اس کے ہاتھ میں ہتھیار ہے۔ اور وہ ایک جماعت کا رکن ہے۔ وہ عدم تشدد کی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ خدمت ضرور کرتا تھا۔ لیکن خدمت کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار مولوی کے خلاف کر لیتا تھا۔ اس نفرت اور غیض و غضب کی تشفی دوسری جماعتوں کے خلاف نعرے لگا کر کر لیتا تھا۔ وہ ہٹلر کی تصویروں کی بھی پرستش کرتا تھا۔ وہ جرمن فاشسٹوں کے کیمپوں سے بھی متاثر ہوتا تھا۔ غلبۂ اسلام کے نام پر مسلمان غریبوں کی آسوں پیاسوں، خواہشوں اور تمناؤں کو متشددانہ طور پر منظم کیا جا رہا تھا۔ اس دور میں شمالی ہندوستان میں کم از کم مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کے سامنے ٹھہرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ احرار پر چاروں طرف سے یلغار ہو رہی تھی۔ شہید گنج کے ملبے تلے سے وہ ابھی نکلی نہ تھی کہ چپ راست نے ان کی زندگی اور بھی اجیرن کر دی۔ چنانچہ ان کو بہر حال چپ راست کے مقابلے میں یمین و یسار کے نعرے لگاتے ہوئے اپنے رضا کاروں کو گلی کوچوں میں بھیجنا پڑا۔

یہ درست ہے کہ خاکسار جس طبقے کو متاثر کر رہے تھے ان میں اعلیٰ سطح کا سرکاری ملازم یا اوپری طبقے کا زمیندار نہیں تھا۔ بلکہ وہ شہروں کے بیکار نوجوان یا پھر بہت ہی چھوٹے دکاندار، چھابڑی لگانے والے قصبوں کے آڑھتیوں کی دکانوں پر کام کرنے والے نیم پڑھے لکھے اور منشی اور بعض چھوٹے زمیندار جن میں جوانی کا خون جوش مار رہا تھا۔ ان میں بعض متمول اور کھاتے پیتے زمیندار بھی تھے اور انھوں نے غلبۂ اسلام کے لیے اپنی اراضی اور جائیدادیں بھی بیت المال کو دے ڈالیں۔ لیکن اس جماعت کی موثر اپیل ان شہری بے روزگار جاہل نوجوانوں میں زیادہ تھی۔ یہ علم سے بے بہرہ نوجوانوں کی علم کی تشنگی تھی جو مشرقی صاحب کی علمیت کو مینارۂ نور بنا دیتی تھی، اور جب یہ عالم "ولایت پلٹ" دو ہزار روپیہ تنخواہ لینے والا سرکاری افسر تمام آسائشوں کو تج کر خاکی وردی پہننے لگا کوچوں میں عام خاکساروں کے ساتھ گھلتا ملتا دکھائی دیتا تو یہ ان غریب ان پڑھ بے سہارا نوجوانوں کو امید کی شعاع دکھائی دیتا ہے۔ اور ان کے چھوٹے چھوٹے خوابوں کی تعبیر بن جاتا ہے۔ وہ خدمت خلق اور اخوت و مساوات کے نعروں میں اپنی غریبی کے غموں کو بھول جاتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ کل جب یہ تحریک کامیاب ہوگی تو ان کے تمام دکھوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

خاکساروں نے جن لوگوں کو متاثر کیا، اکثر و بیشتر یہی وہ طبقہ تھا جو مجلس احرار کی تحریکوں کی جان بنا رہا۔ لیکن شہید گنج تحریک میں مجلس احرار کی عدم شرکت نے اس کو جب غیر مقبول بنایا تو ان نوجوانوں کو فوراً "چپ راست" کے نعرے میں پناہ مل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں یعنی جنگ سے پہلے کے دور میں سب سے زیادہ تصادم احرار اور خاکساروں کے مابین ہی تھا۔ اور مسلم لیگ کی مخالفت یا حمایت قطعاً نہ تھی کیوں کہ اس زمانے میں مسلم لیگ تو عوامی اثر و رسوخ کی حامل ہی نہ تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جنگ کے شروع ہونے کے بعد جب مجلس احرار نے جنگ کو شہنشاہی جنگ قرار دیا اور فوجی بھرتی کے خلاف قرارداد پاس کر دی تو احرار کے تمام زعماء ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت نظر بند کر لیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نچلے طبقوں کے نوجوانوں کو مسخر کرنے کے لیے میدان خالی ہو گیا اور خاکساروں کی مقبولیت میں زبردست اضافہ ہونے لگا۔

یہی وہ دور تھا جب یورپ میں نمودار ہونے والا معاشی بحران بالآخر دنیا کو جنگ کی طرف لے گیا۔ جیسے جیسے یورپ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے ویسے ہی ہندوستان کی تحریکیں بھی ان

نئے حالات سے دوچار ہونے کے لیے تیاری کرنے لگیں۔ یہاں بھی یہ تاثر عام تھا کہ برطانیہ بالآخر جنگ میں الجھنے پر مجبور ہوگا۔ اس لیے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس سے آزادی چھینی جا سکتی ہے۔ یا آزادی کا پختہ وعدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس تاثر یا یقین کی فضا میں ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت انتخابات ہونے والے تھے۔ ہر جماعت اور ہر قوم ہندوستان میں اپنے لیے واضح مقام اور حقوق کا تعین چاہتی تھی۔ لہٰذا کانگرس کی صدارت جواہر لال نہرو کے سپرد ہوئی اس صدارت نے ہندوستانی کانگرس کے اس گروہ کو کامیاب بنایا جو آزادی کے لیے براہ راست جد وجہد کرنے کا حامی تھا۔ دوسری طرف مسلم لیگ نے لکھنؤ میں اپنا اجلاس منعقد کر کے اپنے پروگرام میں نمایاں تبدیلی کی۔ اس تبدیلی کا اہم نشان مکمل آزادی قرار پائی۔ اس سے پہلے مسلم لیگ مکمل آزادی کی حامی نہیں تھی۔ بلکہ ڈومینین سٹیٹس کی طلب گار تھی۔ اس اجلاس میں کسانوں اور مزدوروں کے مطالبات کو بھی اپنایا گیا۔ اور اسے ایک عوامی جماعت بنانے کی جد وجہد کا آغاز کیا۔

پنجاب کا سیاسی نقشہ

اس فضا کو ذہن میں رکھیئے اور پنجاب کے اس وقت کے سیاسی نقشے کے خدوخال سمجھنے کی کوشش کیجئے تو چند واقعات ابھرتے ہیں۔ یہاں پر مسلم لیگ موجود نہیں تھی حکومت یونینسٹ پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ جو بڑے بڑے زمینداروں کی نمائندہ تھی۔ ہندو شہری کانگرس میں منظم تھے۔ مسلمان شہری کچھ یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تھے۔ لیکن اکثریت جن کو ووٹ حاصل نہیں تھا وہ مجلس احرار کے حامی تھے۔ لیکن انتخاب سے پہلے شہید گنج نے مجلس احرار کے اثر و رسوخ کو بہت حد تک زائل کر دیا تھا۔ عام لوگ تنظیم اور جد وجہد کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن کوئی تحریک نہ تھی، کوئی جماعت نہ تھی جو سیاسی خلا کو پُر کرتی۔ چنانچہ اس زمانہ میں چپ راست کرنے والے نوجوانوں کی ٹولیوں نے عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ یہ زمانہ اور خاکسار تحریک کے نمایاں خدوخال بڑے دلچسپ تھے۔

فوجی وردی، اعتبار کے لیے بیلچہ، بازو پر خدمت خلق کا نشان، کوئی چندہ نہیں، سادگی اختیار کرو، اپنی خوراک پر اڑھائی آنے سے زیادہ صرف نہ کرو۔ مولوی کا اعتبار نہ کرو۔ اس کے

کہنے پر نہ چلو۔ بلکہ ایک امیر مقرر کرو۔ اور اس کا ہر حکم بجالاؤ۔ اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے رضاکار کا کام اس کا حکم بجالانا ہے۔ یہ نعرے اور اصول عوام کے ابتدائی جذبات کی تسکین کا خاصا سامان تھے۔ چنانچہ خاکسار تحریک اور اس کے امیر علامہ عنایت اللہ خان المشرقی نے انہیں اپنا لیا۔ یہ بظاہر غیر سیاسی تحریک تھی۔ صرف خدمت خلق اس کا کام تھا۔ چنانچہ اس تحریک نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ اور کم از کم پنجاب کے شہروں کے متعلق تو لوگوں کو یاد ہوگا۔ کہ اس تحریک کی مخالفت میں لب کشائی بھی مشکل ہو گئی تھی۔

ایک طرف یہ غیر سیاسی شکل کی تحریک تھی۔ دوسری طرف یہ نعرہ تھا کہ خدمت خلق کے ذریعے ہی اسلامی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہٹلر کی نازی جماعت کی عسکری فوج کی پریڈ کی تصویریں شائع کی گئیں۔ ان کے تتبع میں خاکساروں کے کیمپوں کی بڑی بڑی تصویریں بھی خاکساروں میں تقسیم ہوئیں۔ خاکسار تحریک کا سرکاری ترجمان "الاصلاح" بھی جذباتی اداریوں کے ذریعے خاکساروں کا خون گرماتا۔ نازی جماعت کے پراپیگنڈے سے یہ تاثر دیا جاتا کہ جس طرح ہٹلر نے جرمنی کو جنم دیا ہے اسی طرح یہاں پہ اسلامی حکومت کے لیے خاکسار تحریک کام کر رہی ہے۔ برطانیہ کے خلاف عوام میں جو نفرت تھی، اس نے ہٹلر کو عام لوگوں کا محبوب بنا دیا تھا۔ خاکسار قائد نے اس محبت سے استفادہ کرنے کے لیے خاکسار اور نازی پارٹی میں مماثلت پیدا کی۔ بلکہ ہٹلر کے ساتھ علامہ مشرقی کی ایک تصویر بھی ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے زمانے میں تقسیم کی گئی۔ ان تمام اقدامات نے عوام میں خاکسار تحریک کے لیے زبردست کشش پیدا کر دی۔

مسلم لیگ اور خاکسار

تحریکوں کی بقا کے لیے نعروں کے ساتھ مثبت نقطۂ نظر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بالآخر عوام کا کثیر طبقہ سیاسی مستقبل کے متعلق بھی سوچنے لگتا ہے۔ چنانچہ جس وقت جنگ کے بادل امڈنے لگے اور ہندوستان کی آزادی کی باتیں زیادہ واضح ہونے لگیں، مسلم لیگ کی کامیابی اور مقبولیت بڑھنے لگی کیوں کہ ہر مسلمان کی زبان پہ یہ سوال تھا کہ آزاد ہندوستان میں

ہمارا کیا مقام ہوگا۔ یہ آئین کی بات تھی، یہ سوال ایک طرف برطانوی حکومت سے جواب چاہتا تھا۔ تو دوسری طرف کانگرس سے، چنانچہ دونوں محاذوں پر لڑائی جاری تھی۔ اسی کے نتیجے میں مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ مسلم لیگ کی طرف مائل ہونے لگا۔ اسے اپنی روزمرہ زندگی میں ہندو اکثریت کے ظلم و ستم سہنے پڑتے تھے۔ یہ خواہ سیکرٹریٹ کی ملازمت کے دوران ہو، خواہ کالج کی پروفیسری کے سلسلے میں اور خواہ انارکلی میں تجارت کے میدان میں، اس لیے جب لیگی رہنما اکثریت کے مظالم کی داستان بیان کرتے اور مسلمانوں کو الگ قوم بتاتے تو پڑھے لکھے مسلمانوں کو اپنے تجربے کی بنا پر بھی یہ بات اپیل کرتی وہ اس بات پر متفق تھے کہ کانگرس اور برطانیہ سے نپٹنے کے لیے ایک منظم اور متحدہ مسلم جماعت ضروری ہے اور یہ ضرورت صرف مسلم لیگ پوری کر سکتی ہے۔ چنانچہ روز بروز مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھنے لگی اور یہ مقبولیت خاکساروں کے امیر کو ایک نظر نہ بھائی۔

جنگ اور خاکسار

ادھر خاکساروں کی تنظیم اور چپ راست نے غیر مسلموں کے دل میں تشویش پیدا کر دی اور وہ اس سے خائف نظر آنے لگے۔ ان کی دشمنیاں بھی ابھرنے لگیں۔ دوسری طرف ۱۹۳۹ء میں جنگ کے اعلان نے سیاسی نقشہ ہی بدل دیا۔ برطانوی حکومت ہندوستان میں رضاکاروں کی جماعتوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، بالخصوص پنجاب میں جہاں پر فوجی بھرتی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ اس فضا میں خاکساروں کے امیر نے بھی اپنے انداز اور نعرے بدل دیئے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی طرح خاکساروں کو فوج میں بھرتی کروا کے برطانوی حکومت کو ایک طرف ممنون کر کے قابو میں کیا جائے، دوسری طرف ان رضاکاروں کی فوجی خدمات کے بل پر حکومت کو مرعوب کر کے اختیارات حاصل کر لیے جائیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ وہ مسلم لیگ کے اثر سے اپنے پیروؤں کو محفوظ رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اکثریت اور اقلیت کے نظریے کو ایک مختلف رنگ میں پیش کیا۔ مسلم لیگ دلائل کی بنا پر یہ مطالبہ

کرتی تھی کہ مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اس لیے ان کو آزاد ہندوستان میں صحیح مقام جو ان کا جائز حق ہے لنا چاہیے۔ لیکن مشرقی صاحب کا خیال تھا کہ اس سے بڑھ کر مطالبہ کیا جائے تو ان کا مطالبہ مسلمانوں کو زیادہ اپیل کرے گا۔ اور مسلم لیگ کا بڑھتا ہوا اثر زائل ہو جائے گا۔ اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے یو پی کی کانگرس وزارت کے خلاف تحریک چلائی اور گرفتار ہو گئے۔ مگر وہاں معذرت کر دی۔ لیکن جب معذرت نامے کی تشہیر ہوئی تو اس سے انکار کر دیا اور پھر یو پی پہنچ گئے۔ وہ جیل ہی میں تھے۔ جب جنگ شروع ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے لکھنؤ جیل سے وائسرائے کو تار بھیجنے کی کوشش کی۔ اس تار میں مادر وطن کی حفاظت کے لیے پچاس ہزار سپاہیوں کی بلا شرط پیش کش کی گئی تھی۔ اس پیش کش کو بعد میں پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس پمفلٹ کا عنوان رکھا گیا "اکثریت یا خراج" اس کا پہلا صفحہ ملاحظہ کے قابل ہے:۔

"فیقتلون و یقتلون (قرآن حکیم)

پس ایمان والے وہ لوگ ہیں جو قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں

یعنی جنگ یورپ کے موقعہ پر حکومت ہند کو پچاس ہزار خاکسار سپاہیوں کی پیش کش کے ضمن میں علامہ مشرقی کے اس نئے سیاسی فارمولے کا اعلان جس کی رو سے حکومت صرف اس قوم کی ہے جو خون بہائے اور چونکہ پچھلے دو سو برس میں ایک ہندو کے بالمقابل ایک سو پچیس مسلمانوں نے ہندوستان کی حفاظت کے لیے خون بہایا۔ اس لیے حکومت کا حق صرف مسلمانوں کو ہے ادارۂ علیہ ہندیہ اچھرہ۔ لاہور"

اس پمفلٹ میں بعض دلچسپ چیزیں اور بھی ہیں ان میں مختلف اخباروں کے حوالے سے یہ بتایا گیا تھا کہ حکومت ہند اس پیش کش کو قبول کرنے کے حق میں ہے۔ ایک اور خبر بھی "ہمدم" اخبار کے حوالے سے دی گئی ہے کہ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات بھی حکومت ہند پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ کہ وہ خاکساروں کی اس پیش کش کو قبول کرے اور ان کو علاقائی فوج میں شامل کر لیا جائے۔ یہ پمفلٹ اکتوبر ۳۹ء کے آخری دنوں میں شائع ہوا تھا۔ اس کی اشاعت

سے غیر مسلموں اور ان کی فرقہ وارانہ جماعتوں میں اچھی خاصی تشویش پیدا ہوگئی۔ چنانچہ اس کا پنجاب میں خاصا اثر ہوا۔ اور دیکھتے دیکھتے کئی ایک عسکری تنظیمیں ابھرنی شروع ہوگئیں۔ اور پنجاب کے اکثر شہروں میں مختلف فرقوں اور قوموں کے جوان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر فوجی طرز کی پریڈ وں میں مارچ کرتے نظر آنے لگے۔ چنانچہ پنجاب اسمبلی میں خاکساروں کی سرگرمیوں کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔

۴ دسمبر ۳۹ء کو سردار انوپ سنگھ نے جو پنجاب اسمبلی میں سکھ زمینداروں کے نمائندہ تھے ایک قلیل المہلت سوال پوچھا۔ سوال یہ تھا "کیا وزیر اعظم اس امر پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ پنجاب میں فوجی طرز کی کئی ایک تنظیمیں قائم ہو رہی ہیں۔ ان تنظیموں کے نام کیا ہیں اور ان کی سرگرمیوں کے متعلق حکومت کی پالیسی کیا ہے۔"

اس سوال کے جواب میں وزیر اعظم نے مندرجہ ذیل عسکری تنظیموں کے نام بتائے:۔

۱۔ خاکسار، ۲۔ جیش احرار اسلام، ۳۔ اتحاد ملت، ۴۔ اکالی سینا، ۵۔ اکالی فوج، ۶۔ شکتی دل، ۷۔ اگنی دل، ۸۔ راشٹریہ ایکتا دل، ۹۔ گینتی دل، ۱۰۔ مہابیر دل پنجاب، ۱۱۔ پراونشل مہابیر دل، ۱۲۔ مرکزی مہابیر دل، ۱۳۔ بجرنگ اکھاڑ، ۱۴۔ غازی فوج۔

پالیسی کے متعلق وزیر اعظم سر سکندر حیات نے ایوان اسمبلی میں اعلان کیا کہ حکومت پنجاب ان تنظیموں کی سرگرمیوں کا بنظر غائر مطالعہ کر رہی ہے اور وقت آنے پر اس کے متعلق اعلان کر دیا جائے گا۔ یہ جواب ۴ دسمبر ۳۹ء کو دیا گیا۔

اس کے بعد ہندو پریس میں خاکساروں کے خلاف پراپیگنڈہ اور تیز ہوگیا اور یہ جنگ ایک طرح سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی معلوم ہونے لگی۔ اس میں سب سے زیادہ ذکر اکثریت یا خون کے پمفلٹ کا ہوتا تھا۔

سکندر مشرقی ملاقات

جس وقت پنجاب میں ہندو پریس میں خاکساروں کے خلاف مہم زوروں پر تھی تو کہا جاتا

ہے کہ سر سکندر حیات نے خاکساروں کے قائد علامہ عنایت اللہ المشرقی کو ملاقات کی دعوت دی اور ان سے خاکساروں کے متعلق گفتگو کی اور انہیں بتایا کہ حکومت پنجاب تمام فوجی طرز کی تنظیموں پر پابندی لگانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس لیے کہ ہندوؤں اور سکھوں کی فوجی تنظیمیں روز بروز ابھر رہی ہیں اور اس سے صوبے میں صورت حال قابو سے باہر ہونے کا احتمال ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ علامہ مشرقی نے اس بات پر اصرار کیا کہ اگر ان کی وردی اور اخوت کا نشان برقرار رہنے دیا جاتے تو وہ بیلچہ پریڈ پر پابندی کو قبول کر لیں گے اور کسی قسم کی خلاف ورزی نہیں کرینگے۔

اس ملاقات کی طرف اشارہ اس زمانہ میں بھی بعض اخبارات میں ہوا تھا۔ اور اس سلسلہ میں جن لوگوں کی ایوان حکومت میں رسائی تھی انہوں نے بھی تصدیق کی تھی، چنانچہ وزیر اعظم کو اس سے یک گونہ اطمینان ہو گیا۔ تو انہوں نے ہندو پریس کی مہم کو روکنے کے لیے "اکثریت یا خون" نامی پمفلٹ ضبط کر لیا۔ اس ضبطی کے احکام نے ایک طرف اگر ہندو پریس کو مطمئن کیا تو دوسری طرف عام خاکساروں کو مشتعل کر دیا۔ اور خود علامہ مشرقی کے لیے ان خاکساروں کو قابو میں رکھنا محال ہو گیا۔ مزید برآں اس وقت صورت حال سے سکندر وزارت کے اندر اور باہر کے مخالف گروپ نے بھی فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور خاکساروں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا۔ کہ سکندر وزارت اگر خاکساروں پر ہاتھ ڈالے گی تو مسلمانوں میں اس کی ساکھ ختم ہو جائے گی اور اگر ہاتھ نہ ڈالے گی تو ہندو اور سکھ اراکین اسمبلی سکندر وزارت کا تختہ الٹ دیں گے۔

اس رسالے کی ضبطی کے خلاف احتجاج کے طور پر خاکساروں نے یہاں مظاہرہ کیا اور اس مظاہرے کے دوران یہ رسالہ فروخت کیا گیا۔ تقریباً ۵ ہزار کاپیاں دو گھنٹے میں تقسیم ہو گئیں پولیس نے مظاہرین کو منتشر کر دیا اور تین دوکانوں پر چھاپہ مار کر رسالے کی کاپیاں قبضے میں لے لیں

پنجاب کی پارلیمانی سیاست

ادھر یہ دقت تھی، دوسری طرف آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہو رہا تھا مسلم لیگ اور سر سکندر کے تعلقات میں عجیب و غریب قسم کی پیچیدگیاں تھیں۔ سکندر حیات مرحوم

آل انڈیا مسلم لیگ کو ہندوستان کے پیمانے پر استعمال کرنا چاہتے تھے اور کسی حد تک اس بات کے لیے بھی آمادہ تھے کہ مسلم لیگ بوقت ضرورت کانگرس سے گفتگو کرتے ہوئے سکندر وزارت کو استعمال کرے لیکن جہاں تک پنجاب کے وزارتی اور سیاسی معاملات کا تعلق تھا اس میں سر سکندر مسلم لیگ کی مداخلت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس ضمن میں ملک برکت علی مرحوم اور ان کے ہمنواؤں کی جو اسمبلی کے اندر بہت ہی اقلیت میں تھے۔ خواہش یہ تھی کہ یا تو سکندر حیات مسلم لیگ کے ڈسپلن کو صوبے کے اندر اور باہر تسلیم کریں ورنہ یہاں پر ایسی وزارت ہو جو مسلم لیگ کے تابع ہو۔ چنانچہ جب مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہونا قرار پایا تو ایک قسم کی کش مکش جاری تھی۔ ملک صاحب اور ان کے حامیوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ ہائی کمان پر یہ واضح کیا جائے کہ سر سکندر مسلمانان پنجاب میں مقبول نہیں ہیں۔ اور مسلم لیگ سے ان کی وابستگی پنجاب میں مسلم لیگ کو مقبول بنانے کی بجائے غیر مقبول بنانے کی موجب ہوگی۔ اس کے علاوہ اسمبلی کے اندر کچھ ممبروں کی بھی یہ خواہش تھی، کہ پارلیمانی بحران پیدا کیا جائے۔ تاکہ سر سکندر سے مراعات حاصل کی جاسکیں اس میں کانگرس اور اکالی اور کچھ یونینسٹ مسلم اور غیر مسلم ممبر بھی شامل تھے

پابندی

اس بحران کی فضا میں خاکساروں اور دوسری فوجی طرز کی جماعتوں پر پابندی کا اعلان کر دیا گیا۔ چنانچہ ۲۸ فروری کو حکومت پنجاب کے پارلیمانی سیکرٹری میر مقبول محمود نے اعلان کیا کہ حکومت پنجاب نے تمام فرقہ وارانہ رضاکار جماعتوں کے خلاف قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ جنگ چھڑ جانے اور صوبہ کے موجودہ حالات کے پیش نظر اس قسم کی جماعتوں کو اتنی آزادی نہیں دی جاسکتی جتنی اس سے پہلے ان کو حاصل تھی' اس لیے حکومت اعلان کرتی ہے کہ

۱۔ لاہور' امرتسر اور راولپنڈی کے اضلاع کی حدود کے اندر دس یا دس سے زائد اشخاص پر مشتمل جلوس میں کوئی شخص کوئی ہتھیار سوائے تلوار کے جو نیام میں ہو یا کوئی ایسی چیز لے کر شریک نہیں ہو سکے گا۔ جو ہتھیار کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہو۔

۲۔ صوبہ پنجاب میں کوئی شخص اسلحہ یا ایسی چیز جو بطور اسلحہ استعمال کی جا سکتی ہو لے کر فوجی نوعیت کی کسی ورزش، تحریک یا ڈرل میں حصہ نہیں لے سکتا۔

ان اعلانات کا اطلاق ان تمام چیزوں پر ہوگا جن کی فہرست وزیر اعظم پنجاب نے ۴؍ دسمبر کو سردار انوپ سنگھ کے سوال کے جواب میں پیش کی تھی۔ یہ پابندی ۲۸؍ فروری ۱۹۴۰ء کو نافذ کی گئی۔

علامہ مشرقی کی دہلی کو روانگی

اس پابندی کے چند روز کے اندر ہی علامہ مشرقی خود دہلی روانہ ہو گئے اور اغلب یہی تھا کہ دوسری جماعتوں کی طرح خاکسار بھی اس پابندی کو وقتی طور پر برداشت کر لیں گے۔ لیکن ایک ہفتہ بعد جب "الاصلاح" کا پرچہ شائع ہوا تو اس میں اس پابندی کے خلاف کئی مضامین موجود تھے۔ اس پر سر سکندر کے حامیوں نے علامہ مشرقی سے بھی رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا کہ وہ اس قسم کی اشتعال انگیز تحریروں کو روکیں۔ ان سے حالات خراب ہو جائیں گے۔ ادھر سکندر کے مخالفین نے بھی علامہ مشرقی سے میل جول بڑھایا اور خاکساروں کے دوسرے لیڈروں کی حمیت کو بھی للکارا۔ اب خود علامہ مشرقی کے لیے سوچنے کا مرحلہ آ گیا تھا۔ لیکن انہیں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اگر اس وقت انہوں نے ٹکر لے لی تو وہ ایک طرف سکندر کی وزارت کو الٹ دیں گے اور دوسری طرف مسلم لیگ کو یا تو ان کے پیچھے چلنا پڑے گا یا پھر مسلمانوں میں اپنی مقبولیت کھونا ہوگی۔ چنانچہ ۱۹؍ مارچ کو ۳۱۳ خاکساروں کے جیش نکالنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس جیش میں پنجاب اور صوبہ سرحد کے چیدہ چیدہ جانباز جمع کیے گئے۔ جب یہ خبریں شائع ہونے لگیں کہ خاکسار لاہور میں جمع ہو رہے ہیں تو حکومت کی تشویش بڑھی اور اس نے علامہ مشرقی کو دہلی سے بلانے کی کوشش کی۔ سکندر وزارت کے حامی اخباروں نے اس سلسلے میں مشرقی صاحب سے اپیلیں بھی کیں۔ چنانچہ روزنامہ انقلاب نے جو اس دور کی وزارت کا زبردست مؤید تھا۔ ایڈیٹوریل میں مشرقی صاحب سے درخواست کی کہ وہ لاہور پہنچ کر صورت حال پر قابو پانے کی کوشش میں

حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ اس اداریے میں لکھا گیا تھا:" کچھ مدت سے ہمارے خاکسار بھائی کثیر تعداد میں لاہور کے اندر جمع ہو رہے ہیں اور ان کے ارادوں کے متعلق عجیب و غریب شر انگیز افواہیں پھیل رہی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ خاکساروں کے امیر علامہ مشرقی دہلی جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی ان کی توجہ اس طرف دلائی تھی، کہ ایسے موقعہ پر انہیں لاہور میں موجود رہنا چاہیئے۔ اب پھر توجہ دلاتے ہیں کہ مسلم لیگ کا اجلاس سر پر آ گیا ہے۔ اور خاکساروں کے ارادوں کے متعلق غیر مناسب افواہیں تشویش زا ہیں۔ ان حالات میں ان کے ذمہ دار رہنما کو لاہور میں موجود رہنا چاہیئے۔

ہم تمام مسلمانوں سے عموماً اور خاکساروں اور ان کے رہنماؤں سے خصوصاً دردمندانہ التماس کرتے ہیں کہ اگر خاکساروں نے مسلم لیگ کے قائد اعظم کے جلوس یا مسلم لیگ کے اجلاس کے موقعہ پر کوئی غیر مناسب حرکت کی تو اس کے جو کچھ بھی نتائج ہوں گے۔ اس کی ذمہ داری خاکسار رہنماؤں پر عائد ہو گی"۔ یہ اداریہ ۱۹ مارچ سے دو روز پہلے قلم بند کیا گیا تھا۔ ۱۹ مارچ کو تصادم ہو گیا۔ ایسا تصادم تاریخ میں شاذ ہی ملے گا۔

تصادم کی کہانی

۱۹ مارچ کو دن کے گیارہ بجے کے قریب تین سو تیرہ (۳۱۳) خاکساروں کا ایک دستہ بھاٹی دروازے کے اندر اونچی مسجد سے چپ راست کرتا نکلا۔ ان کے سروں پر کفن بندھے ہوئے تھے۔ ان کی خاکی وردیاں دیدہ زیب تھیں۔ جوتے چمک رہے تھے، اور بیلچوں کو اتنا چمکایا گیا تھا جیسے ان پر چاندی کا پانی پھیر اگیا ہو۔ تین سو تیرہ کا دستہ ایک مجاہدانہ شان سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس دستے کی قیادت منصور ضیغم نامی نوجوان کر رہا تھا۔ یہ نوجوان موضع بھدم ضلع جالندھر کا رہنے والا تھا۔ اور اس تصادم میں اس نے سب سے پہلے گولی کھائی تھی۔ جب یہ دستہ ہیرا منڈی کی طرف بڑھنے لگا۔ تو چند قدم پر پولیس افسران اور چند سپاہیوں نے انہیں روکنا چاہا اس وقت وہاں پولیس کی کوئی بڑی جمعیت نہ تھی پولیس کے روکنے سے یہ دستہ رکا۔ اور سالار

نے بلند آواز سے کہا: "نماز پر دنیا کی کوئی طاقت پابندی نہیں لگا سکتی۔ ہم آپ سے لڑنے کے لیے نہیں آئے۔ بلکہ نماز پڑھنے جا رہے ہیں"۔ چنانچہ اس پر پولیس کی جمعیت بھاگ کر تھانہ ٹبی میں پہنچ گئی۔ خاکساروں کا دستہ جس وقت تھانہ ٹبی کے قریب پہنچا تو آگے راستہ بند تھا اور پولیس کی بھاری جمعیت جس کی رہنمائی گھوڑوں پر سوار پولیس کر رہی تھی، راستہ روکے کھڑی تھی، سڑک کے دو رویہ ڈنڈا پولیس موجود تھی، جیسے ہی خاکسار مجاہدین ان کے درمیان پہنچے تو پولیس کا ایک دستہ خاکساروں کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس طرح یہ دستہ محصور ہو گیا۔ اور اس کے بعد فائرنگ کی آواز نے پوری آبادی کو دہشت زدہ بنا دیا۔ ابتدا کس نے کی اس کے متعلق مختلف روائتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ خود خاکساروں نے پولیس پر بیلچوں سے حملہ کر دیا۔ اور اس کے جواب میں پولیس نے گولی چلا دی۔ اور پھر اندھا دھند گولی چلتی رہی اور چن چن کر جوانوں کو بندوق کے سامنے لایا گیا۔ اس واقعہ کے بعد شہر میں ہڑتال ہو گئی۔ حکومت نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی کرفیو لگا دیا۔ اخبارات پر سنسر بٹھا دیا گیا۔ پورے شہر میں فوج گشت کرتی دکھائی دینے لگی۔ چاروں طرف دہشت کا سماں تھا۔

عینی شاہد

اس تصادم کے بارے میں آغا خادم حسین ٹبالوی نے اپنی یادداشت مرتب کی ہے اس یادداشت کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے، اس لیے کہ وہ بحیثیت پولیس افسر کے اس تصادم میں شریک تھے؛ اور ایک حد تک احکام صادر کرنے کے بھی ذمہ دار تھے۔ اس لیے کم از کم پولیس کی طرف سے یہ یادداشت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"سن ۱۹۴۰ء کی ابتداء میں مجھے تھانہ ٹبی لاہور کا انچارج لگایا گیا۔ اس وقت ان پابندیوں کی وجہ سے شہر کی فضا میں ایک قسم کا سیاسی کھنچاؤ موجود تھا۔ خاکسار بہت پرجوش تھے۔ کچھ عرصہ تک علامہ مشرقی اور حکومت کے درمیان مذاکرات ہوتے رہے لیکن جب انکا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تو "الاصلاح" کے ۱۶ مارچ کے شمارے میں علامہ مشرقی کا یہ اعلان شائع ہوا۔

"میں جانبازوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ لاہور پہنچ کر اپنی لاشیں سر سکندر کی چارپائی کے چاروں طرف بچھا دیں"۔

بس پھر کیا تھا، خاکسار جانباز لاہور میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔

یہ صورت حال دیکھ کر ایس ایس پی لاہور نے پولیس افسران کی میٹنگ بلائی میں بھی اس میں شامل تھا۔ میٹنگ کے دوران چودھری عبدالمجید سب انسپکٹر پولیس اچھرہ نے ایس ایس پی مسٹر گینس فورڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اگر خاکساروں نے عاید کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی کی اور پولیس کا سامنا ہوا، تو خاکسار تشدد سے کام لیں گے"۔

یہ سن کر ایس ایس پی نے نیم خواندہ کوتوال شہر کی طرف دیکھا۔ اس شریف آدمی نے خندۂ استہزا کے ساتھ سب انسپکٹر اچھرہ کے قیاس کو بے بنیاد قرار دے دیا۔ چنانچہ یہ میٹنگ کوئی قطعی لائحۂ عمل مرتب کیے بغیر ختم ہو گئی۔

۱۹ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کی صبح کو مجھے اطلاع ملی کہ خاکسار اسی روز نماز ظہر کے وقت پابندیوں کو توڑنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ اور اس غرض کے لیے وہ اونچی مسجد اندرون بھاٹی گیٹ کے سامنے ایک مکان میں جمع ہوں گے۔ میں نے اسی وقت کوتوال شہر کو ٹیلیفون کے ذریعے یہ خبر دے دی۔

خاکساروں کا مارچ

۱۰ بجے کے قریب مجھے ایس ایس پی مسٹر گینس فورڈ نے ٹیلیفون کر کے دریافت کیا اور جب میں نے اپنی سابقہ اطلاع کی تصدیق کی تو کہا:

"اچھا میں آ رہا ہوں"۔

نصف گھنٹہ کے بعد مسٹر گینس فورڈ، ایس ایس پی، ڈپٹی کمشنر لاہور، مسٹر بورن، ڈی آئی جی پولیس مسٹر ولیسی میرے پاس تھانہ ٹبی میں پہنچ گئے۔

ایس ایس پی نے پھر مجھ سے خاکساروں کا پروگرام دریافت کیا۔ تو میں نے کہا کہ:

"خاکسار سڑکوں پر مارچ کرتے ہوئے شاہی مسجد میں جائیں گے۔ وہاں نماز ظہر ادا کرینگے۔ اس کے بعد خاکسار منٹو پارک میں باقاعدہ پریڈ کریں گے۔"

یہ سن کر مسٹر گنیس فورڈ نے مجھ سے کہا۔ "تمہاری کیا تجویز ہے۔"

میں نے کہا۔ "جب خاکسار منٹو پارک میں پریڈ کے لیے جمع ہوں تو کافی جمعیت کے ساتھ ان کا محاصرہ کر کے گرفتار کر لیا جائے۔"

مسٹر گینس فورڈ نے میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے پہلے مسٹر مارگن سپرنٹنڈنٹ ایڈیشنل پولیس کو شاہی قلعہ میں اور پھر مسٹر بیٹی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کو ٹیلیفون کیا کہ:

"وہ دونوں اڑھائی اڑھائی سو پولیس کے جوان جن میں کچھ آتشیں اسلحہ سے مسلح ہوں لے کر تھانہ ٹبی پہنچ جائیں۔"

پھر اے ایس پی لاہور مسٹر اولیور (OLIVER) کو ٹیلیفون پر ہدایت کی کہ وہ ڈیڑھ دو سو جوان لے کر بھاٹی دروازہ کو روک لے۔ اس کے بعد یہ تینوں افسر مجھے لے کر اونچی مسجد کے قریب پہنچے خاکساروں کو ہماری آمد کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی؛ چنانچہ سینکڑوں کی تعداد میں خاکسار چار چار کی قطاروں میں بازار میں کھڑے تھے۔ ہر ایک خاکسار نے کندھے پر بیلچہ اٹھایا ہوا تھا۔ اور سر پر کفن باندھا ہوا تھا۔ سب سے آگے جھنڈا اٹھائے جوانان مرگ یونیورسٹی کا گریجویٹ جوان رعنا، مردانہ وجاہت کا حسین پیکر ضیغم مرحوم تھا۔

اطاعت امیر

"آپ کیا کر رہے ہیں؟"

مسٹر لوبرن (ڈی۔ سی) لاہور نے ضیغم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ضیغم نے بغیر جواب دیئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مسٹر لوبرن نے پھر وہی سوال کیا۔ جواب وہی بے نیازانہ خاموشی۔

"علم بردار پیچھے آ جاؤ۔"

یہ سالار جیش فرمان شاہ کی آواز تھی، قدرے پست قد، گٹھا ہوا جسم، انور پاشا (مرحوم)

قسم کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں سر پر آہنی خود پہنے سالار جیش صفیں درست کر رہا تھا۔

اب مسٹر لوبرن فرمان شاہ کے پاس پہنچے اور پوچھا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں" ؟

سالار جیش کا جواب نہایت مختصر تھا۔

" اطاعت امیر"

آئندہ گفتگو بے سود تھی، لہٰذا تینوں افسران نے علیحدگی میں کوئی مشورہ کیا اور پھر ایس ایس پی مجھے لے کر تھانہ کی طرف گویا بھاگ پڑا۔ تھانہ میں پہنچے تو کسی جگہ سے کمک موصول نہیں ہوئی تھی۔ مسٹر گینس فورڈ نے مجھے تھانہ کے ملازمان کو فراہم کرنے کی ہدایت کی۔ میں نے تعمیل کی تو کل اکیس ملازمان تھے۔ جن کے پاس صرف لاٹھیاں تھیں۔ مسٹر گینس فورڈ نے اور میں نے اپنے اپنے ریوالوروں میں گولیاں بھر لیں۔

اب ایس ایس پی نے مجھے کہا کہ تھانے کی سامنے والی سڑک روک لی جائے۔ میں نے اپنے اکیس آدمیوں کو دو قطاروں میں کھڑا کر دیا۔ سڑک فراخ نہ تھی۔ چنانچہ اس طرح راستہ بالکل رُک گیا۔ میں اپنے ملازمان کو آخری ہدایات دے رہا تھا۔ کہ بازار حکیماں کی جانب سے بھاگتے ہوئے تین سو تیرہ (۳۱۳) خاکسار نمودار ہوئے۔ ہم سے تقریباً تیرہ گز کے فاصلے پر تھے کہ سالار جیش کی آواز بلند ہوئی۔

" فید ربدست "

خاکساروں نے بیلچے کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں تھام لیے ہمارے قریب پہنچے تو مسٹر گینس فورڈ نے (جو سڑک کے کنارے کھڑا تھا) مجھے حکم دیا۔

"خادم حسین! ان کو روک لو"

اس پر خاکساروں نے پولیس کی رکاوٹ توڑنے کے لیے زور لگایا۔ لیکن جگہ تنگ تھی اس لیے وہ کامیاب نہ ہو سکے ایک دو مرتبہ انہوں نے یہ کوشش کی مگر وہ پھر بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

اب فرمان شاہ سالار جیش کی آواز پھر بلند ہوئی۔

" فید ربزن "

بس پھر کیا تھا۔ ۳۱۲ بیلچے چمکے، ہوا میں لہرائے اور پولیس پر برسنا شروع ہوئے۔ ہم اس غیر متوقع حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔

مسٹر گنیس فورڈ نے خول میں سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی تو اس پر بیک وقت تین چار خاکساروں نے حملہ کر دیا۔ وہ شدید مجروح ہو کر زمین پر گر گیا۔

مجھ پر تین چار دفعہ حملہ ہوا لیکن خوش قسمتی سے معمولی ضربات تھیں اور میں بچ گیا۔ اب میں خود کو بچاتا ہوا تھانہ کی دیوار سے ٹکرایا اور گر گیا۔ اٹھ رہا تھا کہ ایک خاکسار نے پورے زور سے بیلچہ میرے بائیں پہلو پر مارا میں پھر گر گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے بیلچہ چپٹی طرف سے لگا تھا۔ لیٹے لیٹے میں نے جسم پر ہاتھ پھیرا کہیں خون نہ تھا۔ چند سیکنڈ میں میرا ایک سپاہی نیت رام مر چکا تھا۔ اکیس آدمیوں میں سے سولہ زخمی ہو کر زمین پر گرے پڑے تھے۔ اور خاکسار پولیس کی رکاوٹ توڑ کر بازار ہیرا منڈی کی طرف بھاگ رہے تھے۔

میں اٹھا مسٹر گنیس فورڈ کو گھسیٹ کر تھانہ کی طرف جانے والی سڑک پر ڈالا اور خود موٹر کے انتظام میں لگ گیا۔ ڈی سی لاہور کا ڈرائیور (جو سکھ تھا) اتفاق سے مل گیا۔ اس کو پکڑا۔ مسٹر گنیس فورڈ کو موٹر میں ڈالا اور ہسپتال کی طرف چل دیا۔

جب موٹر گیٹی تھیٹر کی طرف مڑی تو سامنے سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے وہیں سے موٹر موڑی۔ اور چیت رام روڈ سے ہوتے ہوئے میو ہسپتال پہنچ گئے۔ مسٹر گنیس فورڈ کو سٹریچر پر ڈال کر میں نے اور ایک اور شخص نے اٹھایا۔ اور اپریشن تھیٹر میں (اوپر کی منزل) لے گئے۔ جہاں کرنل میراج کر سرجن، گنیس فورڈ کے زخم سینے میں لگ گیا۔ میں پاس ہی کھڑا تھا کہ بائیں پہلو میں شدید درد اٹھا۔ نڈھال ہو کر ایک کرسی پر گر گیا۔ ایک نرس بھاگ کر کافی کی پیالی لے آئی اور پھر ایک نوجوان ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔

میرے بائیں پہلو کی کچھ پسلیاں ٹوٹ چکی تھیں!

چنانچہ اسی وقت مجھے ایک سٹریچر پر ڈال کر فیملی وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ اسی اثناء میں مسٹر بٹی بری طرح مضروب ہو کر ہسپتال میں پہنچ گیا۔ ہم پر حملہ ہونے کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ یہ تھے۔

بعد کے حالات

مسٹر بیٹی، مسٹر گینیس فورڈ کی ہدایت کے مطابق ۲۵۰ آدمی لے کر جب ہیرا منڈی پہنچے تو ہم پر حملہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آدمیوں کو لے کر تھانہ کی طرف بڑھے راستے میں خاکساروں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ جنہوں نے مسٹر بیٹی پر بھی حملہ کر کے اسے شدید مضروب کیا۔

اب بیٹی کے ہمراہی پولیس کے جوان بغیر کسی افسر کے تھے۔ ان کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا کیا جائے۔ ساتھ ہی خاکساروں نے ان پر بھی حملہ کر دیا۔ پولیس والوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ جب شاہدرہ کے اڈہ ٹانگہ کے قریب آئے تو ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار سپاہی نے اپنے ساتھیوں کو للکارا اور پلٹ کر خاکساروں پر گولی چلانا شروع کر دی۔ اس کی تقلید میں باقی سپاہیوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔

اس مرحلہ پر مسٹر مارگن ایڈیشنل پولیس کے اڑھائی سو جوان اور ڈی ہیوم ڈی آئی جی پولیس پہنچ گئے۔

گولی چلتی دیکھ کر خاکساروں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ جلیش کے عقب میں لاہور کے خاکسار تھے۔ جو لاہور کی گلیوں سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ وہ ان میں گم ہو گئے۔ لیکن جیش کی اگلی قطاروں میں پشاور اور پنڈی کے خاکسار تھے؛ ان کو کوئی جائے پناہ نہ مل سکی تو وہ رنڈیوں کے کوٹھوں پر چڑھ گئے۔

لرزہ خیز انتقام

مارگن اور ڈی ہیوم نے اس مرحلہ پر جس درندگی کا ثبوت دیا۔ اور جس بے رحمی سے انہوں نے اپنے دو سفید فام بھائیوں کا انتقام لیا۔ وہ لرزہ خیز تھا۔ انہوں نے رنڈیوں کے کوٹھوں پر چڑھ کر خاکساروں کو گولیوں کا نشانہ بنایا اور پھر سیڑھیوں سے دھکیل دیا۔

اس خونی کھیل کے دوران میں لاہور کے ایک پڑھے لکھے مسلمان آنریری مجسٹریٹ ہیرا منڈی پہنچے۔ بڑی شان سے مسٹر مارگن ایس پی کے پاس گئے جو اس وقت نہتے خاکساروں پر گولی چلا رہا تھا۔ اور دریافت کیا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟"

مارگن نے سوال کیا۔

"آپ کون ہیں"؟

"آنریری مجسٹریٹ درجہ اوّل"۔

"اوہ"۔ مارگن نے جواب دیا۔ اور پھر اپنا ریوالور خول میں ڈالا، اٹینشن ہوا۔ آنریری مجسٹریٹ کو باقاعدہ سلام کیا اور پھر پستول نکال کر آنریری مجسٹریٹ کے سامنے ایک نوجوان خاکسار کے سینے میں گولی پیوست کر دی۔

مسلمان مجسٹریٹ کھسیانہ ہو کر وہاں سے کھسک گیا۔ تحقیقاتی کمیشن کے روبرو مسٹر مارگن پر اس واقعہ کی نسبت سوال کیا گیا" کیا یہ حقیقت ہے کہ جب آپ نہتے خاکساروں پر فائرنگ کر رہے تھے۔ تو ایک آنریری مجسٹریٹ نے آپ سے سوال کیا تھا۔ آپ کیا کر رہے ہیں تو آپ نے اس کو نہایت طنز سے سلوٹ کیا اور پھر اس کے سامنے ایک خاکسار کو گولی سے ہلاک کر دیا؟ مارگن نے جواب دیا۔ "۸۵" (نہیں) مگر اس نیک بخت فرنگی پرست آنریری مجسٹریٹ کو یہ توفیق نہ ہوئی۔ کہ وہ کمیشن کے روبرو جا کر حقیقت حال سے نقاب کشائی کرتا۔

اس خونی تصادم میں حکومت نے ۳۶ خاکساروں کی موت کا اعلان کیا لیکن میرے اندازے کے مطابق یہ تعداد پچاس سے کم نہ تھی۔ پولیس کی طرف سے ایک سپاہی نیت رام اور مسٹر بیٹی ڈی ایس پی ہلاک ہوئے۔

کشت و خون کی ذمّہ داری

اس خوفناک تصادم کے بعد (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) اس کشت و خون کی تمام ذمہ داری

پولیس پر ڈال دی گئی اور عوام میں خاکساروں سے عام ہمدردی پیدا ہوگئی۔ پولیس والوں کا نام "امام دین" رکھ دیا گیا۔ جہاں کوئی پولیس افسر گزرتا "امام دین" "امام دین" کا نعرہ بلند ہوتا۔

تصادم کے بعد فوراً خاکسار جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ چل نکلا۔ ۱۸۴ خاکسار اس تصادم کے سلسلے میں گرفتار کیے گئے جن کے خلاف چند ماہ بعد مسٹر فالشن (FALSHAN) سیشن جج کی عدالت میں مقدمہ چلا اور کئی ماہ بعد انیس خاکساروں کو (جو زخمی تھے) حبس دوام بعبور شور کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا۔ جو شاید ہائی کورٹ کے ایک جج پر مشتمل تھا۔ کمیشن نے فائرنگ کے متعلق تحقیقات کرنے کے بعد لکھا کہ:۔ فائرنگ۔" "EXTENSIVE INTENSIVE UNCONTROLLED بڑے پیمانے پر۔ شدید اور بے تحاشا تھی، لیکن کسی خاص افسر پر اس کی ذمہ داری ثابت نہیں ہو سکی"

میں ۲۷ دن ہسپتال میں رہنے کے بعد نکلا تو ڈاکٹر نے دو مہینے کے آرام کی سفارش کی۔ چنانچہ میں رخصت پر چلا گیا۔ جون کے آخری ہفتہ میں رخصت سے واپس آیا۔ تو اس وقت لاہور کی عجیب کیفیت تھی۔

"ادارہ علیّہ" یعنی خاکسار ہیڈ کوارٹر زیر حکومت کا قبضہ تھا۔ علّامہ مشرقی جو خونی تصادم سے چند روز پہلے نامعلوم وجوہ کی بنا پر کراچی چلے گئے تھے، گرفتار ہو کر واپس لائے جا چکے تھے۔ لاہور کی تمام قابل ذکر مسجدوں میں خاکساروں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ان کا صدر مقام شہری مسجد اور کشمیری بازار تھا۔ جہاں ایک آتش بیان مقرر خاکسار عبدالجبار تمام دن لاؤڈ سپیکر پر حکومت کے خلاف زہر اگلتا رہتا تھا۔

مسجدوں میں مقیم خاکساروں کو کھانے کی کوئی تکلیف نہ تھی۔ محلہ والے باقاعدہ ان کو کھانا پہنچا دیتے تھے۔ جب کبھی حکومت ان لوگوں کا محاسبہ کرتی، عورتیں میدان میں آجاتیں۔ اور برقعوں میں چھپا کر کھانا خاکساروں کو پہنچا دیا جاتا۔

یہ صورت حال حکومت کے لیے پریشان کن تھی، غیر مسلم لیڈر اور پریس حکومت سے نہایت سخت قدم اٹھانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

کبھی کبھی کوئی خاکسار جیش اچانک کسی محلے میں یا بازار میں نمودار ہو جاتا اور پریڈ کرتا

شروع کر دیا۔

ایسے ہی ایک جیش کا آمنا سامنا انار کلی میں مجھ سے ہو گیا۔ سات آٹھ بالکل نوجوان خاکسار انار کلی میں پریڈ کر رہے تھے۔ میں نے ان کا محاصرہ کر کے کہا کہ وہ خود کو میرے حوالے کر دیں۔ اس کے جواب میں خاکسار سالار جیش نے نماز کی مہلت مانگی میں نے اجازت دیدی' جیش نے انار کلی کی سڑک پر نماز پڑھی اور پھر خود کو پر امن طریق پر میرے سپرد کر دیا۔ میں ان کو لے کر تھانہ نئی انار کلی میں پہنچا۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے خاکساروں کو حوالات میں دینے کی بجائے باہر تھانے کے صحن میں، چارپائیاں دے دیں۔ ہتھکڑیاں پہلے ہی نہیں لگائی گئی تھیں سالار جیش نے غسل کی درخواست کی میں نے جواباً کہا۔ کہ تھانہ کا غسل خانہ باہر میدان میں ہے اگر سالار جیش یہ وعدہ کرے کہ کوئی خاکسار بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ تو میں ان کو بغیر نگرانی کے نہانے کی اجازت دے دوں گا۔ سالار جیش نے وعدہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے ۲ دو ۲ دو خاکساروں کو بغیر نگرانی کے غسل خانوں میں جا کر نہانے کی اجازت دے دی۔

کسی خاکسار نے بھاگنے کی کوشش نہ کی۔

شام ہوئی تو کھانا کھلا کر میں نے مجبوراً خاکساروں کو حوالات میں بند کر دیا۔ تین چار روز بعد ان کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ میں شہادت کے لیے کمرۂ عدالت میں داخل ہوا۔ تو ملزم خاکسار ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے تھے۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی سالار جیش نے میری طرف منہ کر کے جیش کو حکم دیا۔

"اسلم"

اس پر زیر حراست خاکساروں نے سلام کیا اور میں نے جواب دیا۔

یہ اظہار تشکر تھا۔ اس برتاؤ کا جو میں نے خاکساروں سے عرصہ حراست میں روا رکھا تھا۔

مسجدیں خالی کرانے کا فیصلہ

آخر کار حکومت نے خاکساروں سے مسجدیں خالی کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۴۰ء

میں مسٹر بینٹ ڈی آئی جی کی سرکردگی میں مسجدوں پر نصف شب کے قریب چھاپے مارے گئے۔

اسکا طریق کار یہ تھا کہ پولیس کی کافی جمعیت مسلح ہوکر مسجد کے سامنے نصف شب کے قریب پہنچتی باہر سے اشک آور گیس کے بم مسجد میں پھینکے جاتے۔ جب خاکسار نڈھال ہوجاتے تو پولیس والے دیواریں پھاند کر اندر داخل ہوتے اور موجود خاکساروں کو گرفتار کر لیتے۔

محلہ کندیگراں میں پولیس کو خاصی مشکل پیش آئی۔ یہ مسجد ایک گلی میں ہے جہاں چاروں طرف مکان پھیلے ہوئے ہیں۔ جب نصف شب کے وقت وہاں پولیس پہنچی تو محلے والوں نے پتھراؤ شروع کر دیا۔ بہرحال پولیس نے کافی پریشانی کے بعد مسجد کو خالی کرا لیا۔

اس شب خون میں کئی لوگ ایسے بھی مسجدوں سے گرفتار ہوتے جو باضابطہ تو خاکسار جماعت کے ممبر نہ تھے۔ محض ہمدردی کی وجہ سے ہی مسجدوں میں رہنے لگ گئے تھے۔ ان لوگوں کو خاکساروں سے علیحدہ کر کے رہا کر دیا گیا۔ اس کام کے لیے میرے چند شریکِ کار افسران کو منتخب کیا گیا۔

ہم لوگ خاکساروں کے بیان لینے کے لیے جیل میں پہنچے۔ لیکن وہاں کوئی خاکسار ہم سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم سالار جیش محمد شریف خاں سے ملے۔ سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ ہماری غرض معلوم کر کے اس نے خاکساروں کو ہدایت کی کہ وہ بے کم و کاست واقعات بتلا دیں۔ اور غیر خاکساروں کی خاص طور پر نشاندہی کر دیں۔

نماز جمعہ کو جیل میں عدالت لگتی تھی، اور قاضی صاحب امام مسجد ہوتے تھے، نماز پڑھ کر امام مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا۔ سالار جیش کسی خاکسار کی شکایت کرتے، منصف فریقین کی شہادت سنتا اور پھر اپنا فیصلہ سنا دیتا۔

سزا جسمانی دی جاتی تھی، مجرم ہاتھ شانوں کے برابر سیدھے کر کے ذرا آگے کے قریب جھک جاتا تھا اور جلاد مقررہ تعداد میں چمڑے کی ایک پٹی کو دُرّہ بنا کر مجرم کو سزا دیتا۔

تصادم اور مسلم لیگ

اس المیے نے پورے پنجاب کی فضا کو شدید طور پر متاثر کیا۔ صوبائی دارالحکومت میں پورا غصہ اور غیض و غضب کا اظہار سر سکندر کی ذات کے خلاف تھا۔ اور ان دنوں تو واقعی عوام کی نفرت کا کوئی نشانہ تھا تو وہ سکندر حیات تھے۔ ان حالات میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد کرنا آسان کام نہیں تھا۔ کیونکہ سکندر حیات بھی مسلم لیگی زعماء میں شامل تھے۔ چنانچہ قائد اعظم محمد علی جناح نے اس نازک صورت حال کو بھانپ لیا۔ جس دن وہ یہاں پہنچے تو انہوں نے سب سے پہلے خاکسار زخمیوں کی ہسپتال میں عیادت کی ۲۱ مارچ کو پرچم کشائی کی رسم ادا کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"میں ابھی ابھی ان زخمیوں اور بیماروں کو میو ہسپتال میں دیکھ کر آ رہا ہوں۔ یہ لوگ ایک رنجیدہ واقعہ کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ واقعہ حقیقتاً بہت ہی افسوس ناک ہے۔ جس کے نتیجہ میں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ان زخمیوں اور ان کے لواحقین سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ اور ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں"۔

اس تقریر سے بھی یہ بات واضح ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شامل ہونے والے قائدین محسوس کرتے تھے کہ عوام کو قابو میں رکھنا خاصا مشکل ہے۔ اجلاس میں اس سانحہ کی بڑی گہری چھاپ تھی۔ قائدین کو یہ بھی احساس تھا کہ لوگ سر سکندر کا نام بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔ اور مسلم لیگ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ وہ ایک صوبے کی حکومت کو گو وہ برائے نام ہی سہی ہاتھ سے چھوڑ دے۔ اور کانگرس کے سامنے اپنے آپ کو کمزور ثابت کرے۔ اس حالت میں ملک برکت علی اور ان کے ہم خیال مسلم لیگی سر سکندر کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کی غالباً خواہش یہی تھی کہ یا تو مسلم لیگ سر سکندر کو نکال دے یا سر سکندر کو اس قدر مشتعل کیا جائے کہ وہ خود ہی الگ ہو جائے۔ چنانچہ مجلس مضامین کے اجلاس میں مختلف صوبوں کے نمائندوں کی طرف سے کافی لے دے ہوئی۔ اس مجلس کا اجلاس رات کو گیارہ بجے شروع ہوا تھا۔ اور سر سکندر حیات موقع شناس آدمی تھے۔ وہ چھپتے چھپاتے پچھلے دروازے سے مجلس کے پنڈال میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنے

خلاف مظاہرے کا شدید خوف تھا۔ اور واقعی عوام اس قدر مشتعل تھے کہ اگر وہ سکندر حیات کو دیکھ پاتے تو یقینی طور پر ہنگامے پر آمادہ ہو جاتے۔ اس مجلس میں سب سے زیادہ سکندر مخالف تقریر بدایوں کے مولانا عبدالحامد نے کی تھی، اور آخر میں خود سر سکندر تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور انہوں نے پورے سانحے کے واقعات پیش کیے، کہا جاتا ہے کہ وہ اس تقریر میں اس قدر جذبات سے مغلوب ہو گئے کہ دھاڑیں مار کر رونے لگے اس نے مجلس مضامین کا پورا نقشہ بدل دیا۔ چنانچہ جو قرارداد پاس ہوئی اس میں حکومت پنجاب پر اس سانحہ کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی۔ بلکہ یہ اپیل کی گئی تھی، کہ حکومت پنجاب صورت حال کے بہتر ہوتے ہی خاکساروں کے خلاف پابندی واپس لے لے۔ یہ قرارداد سر سکندر کی کامیابی تھی۔

پنجاب اسمبلی کے اندر کی صورت حال

مسلم لیگ سیشن میں تو سر سکندر حیات کامیاب ہو گئے۔ اب اس کے بعد اسمبلی میں ہنگامہ باقی تھا۔ کیونکہ ابھی تک اسمبلی کے اندر کچھ تو اس امید میں تھے۔ کہ سکندر حیات کو ایوان میں زچ کیا جا سکتا ہے اور ان کی پوزیشن کمزور کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس سانحہ کے ایک ہفتہ بعد ۲۶ مارچ کو اسمبلی کے اندر اس سانحہ کے متعلق تحریک التوا پیش کی گئی۔ یہ تحریک خالد لطیف گابا نے پیش کی۔ اس میں پوری ذمہ داری حکومت پر ڈالی گئی تھی، اس تحریک التوا کی مخالفت شیخ کرامت علی مرحوم جو بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن نامزد ہوئے تھے نے کی تھی، اس تحریک کی تائید حزب مخالف کے قائد اور کانگرس پارلیمانی پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر گوپی چند بھارگو نے کی۔ انہوں نے گو اس سانحہ کی مذمت کی لیکن ساتھ ہی حکومت سے اپیل کی کہ وہ خاکساروں پر سے پابندی نہ اٹھائے۔ اس تحریک التوا کے جواب میں وزیر اعظم سر سکندر حیات نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"خاکساروں کو اشتعال دلایا جا رہا ہے اور اس المناک سانحہ سے پہلے ہی اشتعال نہیں دلایا گیا بلکہ اشتعال انگیزی اب بھی جاری ہے۔ چنانچہ اطلاعات کے مطابق خاکساروں

کے اجلاس اسمبلی کے ایک رکن کے مکان پر منعقد ہو رہے ہیں۔ یہ دکھ کی بات ہے کہ بعض اشخاص اس سانحہ سے اقتدار حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں"۔

دیوان چمن لال اور دلیش بندھو گپتا نے اس کو حزب مخالف پر حملہ قرار دیا۔ اور وزیر اعظم سے مطالبہ کیا کہ وہ اسمبلی کے اس رکن کا نام لیں۔ لیکن اسپیکر نے اس امر کی اجازت نہیں دی۔

وزیر اعظم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: "مجھے اس امر کی اطلاعات موصول ہو چکی تھیں کہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کو ناکام بنانے کے لیے ہر قسم کے اقدام کیے جائیں گے اور جب مسلم لیگ کا ۲۱ مارچ کو جلوس نکلے گا۔ تو اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالی جائے گی۔ خاکساروں پر پابندی ۲۸ فروری کو لگائی گئی تھی، لیکن مسلم لیگ اور صوبے کے دشمنوں نے جب دیکھا کہ خاکسار اس پابندی کی خلاف ورزی پر تلے ہوئے ہیں۔ تو انہوں نے جلتی پر تیل ڈالنے کا کام کیا۔

جناب والا! اب میں اس سلسلے میں ایک خط کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے متعلق یہ الزام لگایا گیا ہے کہ یہ میرے دوست ملک برکت علی نے لکھا ہے۔

ملک برکت علی: یہ بالکل غلط ہے۔ (قہقہہ)

میرے دوست ہنس رہے ہیں۔ لیکن یہ ہنسنے کا مقام نہیں،

میں نے بھی یہی کہا تھا کہ یہ الزام لگایا گیا ہے۔ کہ ملک برکت علی نے کوئی خط لکھا ہے لیکن اس خط کو اسمبلی کے ممبروں میں تقسیم کیا گیا۔ جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ سکندر وزارت سے لاتعلقی کا اعلان کر دیں۔ لیکن جیسے ہی ملک برکت علی کو اس جعلی خط سے متعلق آگاہ کیا گیا۔ انہوں نے مجھے لکھا۔ کہ یہ خط ان کا نہیں ہے۔ اب آپ اندازہ لگا لیجیے۔ کہ جو لوگ جعلی خط ممبروں کو بھیج سکتے ہیں۔ وہی خاکساروں کو اشتعال نہیں دلا سکتے۔ کیوں کہ ان کا کھیل ہی یہ تھا۔ کہ یہ صورت حال پیدا کر کے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور آج وہ عوام کے مشتعل جذبات سے فائدہ اٹھانے کے منصوبے بنا کر آئے ہیں۔ ان لوگوں کے اس اشتعال انگیزی سے دو گونہ مقاصد تھے ایک تو مسلم لیگ کے اجلاس کو ناکام بنانا دوسرے حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنا۔

جناب والا! اس سانحہ کی تین وجوہ ہو سکتی ہیں

اولاً خاکساروں کے قائدین نے اس پابندی کی خلاف ورزی کے احکام جاری کیے ہوں۔

اس صورت میں اس سانحے کی ذمہ داری ان قائدین پر ہے۔

دوم: قائدین نے کوئی حکم نہ دیا ہو اور خود ہی بعض خاکساروں نے اشتعال میں آکر پابندی کی خلاف ورزی کر ڈالی ہو۔ اور یہ سانحہ رونما ہوگیا ہو۔ اور

سوم: یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ خاکساروں کو بعض مفاد پرستوں نے سیاسی مفادات کے لیے اشتعال دلایا ہو۔ اور ان کو اس تشدد انگیزی پر مجبور کیا ہو۔

اس تقریر کے بعد جب اس تحریک التوا پر رائے شماری ہوئی تو اس کے حق میں ۴۳ آرا تھیں، اور اس کے خلاف ۹۳ آرا تھیں۔ چنانچہ یہ تحریک مسترد ہوگئی اور اس طرح سے پارلیمانی ہنگامہ بھی ختم ہوگیا۔ لیکن اس تمام ہنگامے میں یہ واضح ہوگیا، کہ اس سانحہ کی پشت پر مختلف قسم کے مفادات کارفرما تھے۔ جن میں خود تحریک کے قائد کی مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر تشویش بھی شامل تھی، اور آنے والے سالوں نے ان کی اس تشویش کو عجیب و غریب رنگوں میں پیش کیا۔ کبھی اسلامیہ کالج کے میدان میں قائد اعظم کے خطاب کے موقعہ پر مداخلت کی صورت میں۔ کبھی آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ امپریل ہوٹل دہلی میں خاکساروں کے دستے کے ساتھ مداخلت اور کبھی قائد اعظم پر حملہ کی صورت میں اس جذبے کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ بہر حال۔ موضوع تفصیل طلب ہے اور یہاں اس سے بحث کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تحریک اور اس کے قائد پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔

لیکن اس خاکسار اور مسلم لیگ کے مابین تلخی کی بعض دوسری کڑیاں آنکھوں سے بالکل اوجھل ہیں ان پر روشنی ڈالنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک طرف عام تاثر یہ دیا گیا ہے کہ مسلم لیگ اور اس کے قائدین نے خاکساروں کی ۱۹۴۰ء کے المناک حادثہ کے بعد پوری امداد کی۔ لیکن واقعات اس امر کی پوری تصدیق نہیں کرتے کیونکہ بہر حال مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت تھی، وہ مقابلے میں کسی سیاسی یا سماجی تنظیم کو جو اس کی مدمقابل بن سکے۔ گوارا نہیں کر سکتی تھی، سیاسی جوڑ توڑ میں بعض باتیں جو گوارا نہیں ہوتیں۔ ان کا برملا اظہار نہیں ہوتا، اور نہ ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن چپکے چپکے تحریکوں کو میدان سے بے دخل کیا جاتا ہے۔

مسلم لیگ اور اس کے قائدین کی خاکسار تحریک سے نفرت بلا تفاقی بھی تھی، یہ درست ہے کہ

اس تحریک میں ابہام تھا۔ اس کے طور طریقے مروجہ سیاسی طور طریقوں سے بھی مختلف تھے۔ اس پر فسطائیت کے اثرات بھی تھے، لیکن بنیادی طور پر یہ تحریک نچلے درمیانے طبقے کے نوجوانوں کی تحریک تھی۔ جن کی محرومیاں ان کو چپ راست کی راہ سے سامراج دشمنی کی راہ پر لیے جا رہی تھیں، لیکن اس دور میں جو خاکساروں کے عروج کا دور تھا۔ وہ مسلم لیگ کی نیم بلوغت کا دور تھا اس لیے وہ اس تندرست و توانا اور مقبول تحریک کو للکار نہیں سکتی تھی۔ اس کو اور طرح سے زک دے سکتی تھی۔ سکندر حیات اور خاکساروں کے مقابلے میں مسلم لیگ کے قائدین کے لیے سکندر زیادہ قبول تھا۔ کیونکہ ایک تو طبقاتی ہم آہنگی تھی، دوسری طرف مسلم لیگ جن طور طریقوں سے مسلمانوں کے لیے بھلائی چاہتی تھی، اس میں سکندر حیات اور اس کے حامی مسلم لیگ کے لیے زیادہ مفید ہو سکتے تھے۔ چنانچہ خاکسار رہنما اور مورخ، جناب شمشیر سلیمی "خاکسار تحریک" میں لکھتے ہیں:

میرٹھ کا اجتماع

"خاکسار اگر چاہتے تو یوپی کی طرح پنجاب کے مسئلہ کو بھی اپنی قوت بازو کے زور پر سلجھا سکتے تھے۔ سر سکندر کو بتایا جا سکتا تھا کہ ۱۹ مارچ کے انسانیت سوز مظالم اور بربریت کے مقابلے میں غیرت ایمانی کیا کچھ کر سکتی ہے۔ لیکن مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی ظاہری طور پر ہمدردانہ روش نے خاکساروں کو مجبور کر دیا کہ وہ سب کچھ مسٹر جناح کے حوالے کر دیں۔ انہوں نے مبتلائے فریب ہو کر مسٹر جناح پر اعتماد کر لیا۔ حالات نے ثابت کر دیا کہ اس اعتماد کا انتہائی طور پر ناجائز اور افسوسناک فائدہ اٹھایا گیا۔ یہ اعتماد خاکساروں کے لیے زہر قاتل ثابت ہوا۔ اور محترم جناح نے سر سکندر سے اپنی محبت بھری چشمک جاری رکھی، خاکسار تحریک کے تمام مخلص سردار جیلوں میں بند تھے لیکن افسران تحریک کا ایک حصہ جن کو حکومت استعمال میں لانا چاہتی تھی، عمداً آزاد رکھا گیا تھا۔ ۲ اپریل کو نواب بہادر یار جنگ، کی اپیل پر افسران تحریک کا ایک اجتماع میرٹھ میں بلایا گیا۔ اس اجتماع نے ثابت کر دیا کہ حکومت اور سر سکندر کی سازش میں کس طرح مسلم لیگ کے صدر، دکن کے نواب، بلند شہر کے ایڈووکیٹ اور میرٹھ کے پروفیسر برابر شریک تھے۔ تحریک کی مظلومی اور غریب الدیار قائد تحریک کی نظر بندی کا فائدہ اٹھا کر تحریک کی بیخ و بنیاد اکھاڑنے کی شرمناک سازش ہوئی۔

ریک کی روح یعنی امارت پر کاری ضرب لگانے کا پروگرام نواب بہادر یار جنگ نے وضع
یا۔ لیکن سرحد کے دو غیور خاکساروں نے ان ارادوں کو پروان چڑھنے سے قبل ہی بزور ختم کر دیا۔
ب اسمٰعیل خاں صدر یوپی مسلم لیگ کے دولتکدہ پر اس اجتماع کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا۔
ائد تحریک کی نظر بندی میں نواب بہادر یار جنگ کو تحریک کا امیر بنا کر اسے مسلم لیگ کے
ہی نشین خان بہادروں اور نوابوں کے قدموں پر ڈال دیا جائے۔ اور عظمت اسلام کا یہ برقی
غ ہمیشہ کے لیے گل ہو کر رہ جائے۔"

"۔ میرٹھ کے اجتماع، سر سکندر کی دعوت، مسٹر جناح کے ۲۸ جون کے اعلان، اور بلند شہر کے
ڈوکیٹ کے منافقانہ بیان نے ثابت کر دیا کہ لاہور کا ریزولیشن اور ہمدردی کے زبانی دعوے
ے میٹھا زہر تھے اور اگر تحریک کی دس برس کی روحانیت آڑے نہ آتی تو دشمن اپنی سازش
کامیاب ہو چکا تھا۔ اسلامی عظمت کے آخری نشان کو ملیا میٹ کرنے کے لیے علی بابا اور اس
چالیس چور انگریز کے اشارے پر وہ خطرناک بیج بو چکے تھے کہ اگر تعمیر کا سیمنٹ جگروں کے خون
نسوؤں کے زار و قطار پانی سے گوندھا گیا نہ ہوتا تو اس برج مشیدہ کی بنیادیں چند مہینوں
کھوکھلی ہو کر رہ جاتیں، ہاں یہ سازش اکوڑہ کے خون آشام ڈرامے، بلند شہر کی بربریت اور لاہو
مت سے زیادہ ہلاکت خیز تھی۔ تاریخ کا مورخ جب محبت، پھر ہمدردی، پھر منافقت
آخر لرزہ فگن ظلم کی رنگینیوں کو دیکھے گا تو اس کی عقابی نگاہیں پردہ زنگاری کے معشوق کی
ہ خیز چشم ناز سے بے نیازی کا پہلو اختیار نہیں کریں گی۔ اور دنیا صاف صاف دیکھ لے گی
ردی اور دوستی کے پردوں میں کیسے کیسے ہوشربا ڈرامے کھیلے جا سکتے ہیں۔"

(خاکسار تحریک صفحہ ۲۲۳ تا ۲۲۵)

صفدر سلیمی کے اس تجزیے کی روشنی میں خاکسار تحریک کے قائدین اور مسلم لیگ کے قائد
جناح اور سر سکندر وغیرہ کے درمیان اس عرصے میں جو خط و کتابت ہوئی۔ اس پر نگاہ
ائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلم لیگ، خاکسار تحریک سے کوئی زیادہ ہمدردی نہ رکھتی
ور مسلم لیگ کے زعما نہایت تدبر سے اس تحریک کو مسلم لیگ کے حق میں سیاسی
ے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ خاکساروں کے مدار المہام نے قائد اعظم کو جب پہلا

خط لکھا تھا یہ اپریل ۱۹۴۰ء کے ابتدائی ہفتہ میں لکھا گیا تھا۔ اس پر ولیسے تاریخ درج وہ یوں ہے

مدار النظام کا پہلا خط مسٹر جناح کے نام

مائی ڈیئر مسٹر جناح!

حکومتِ پنجاب سے خاکساروں کے متعلق آپ جو گفت و شنید کر رہے ہیں، اس کے نتائج کا میں بڑی بے صبری سے منتظر ہوں۔ امید ہے کہ آپ کی گفتگو کا نتیجہ خاکساروں کے حق میں ہوگا۔ دیر ہو جانے کی صورت میں خاکساروں کا نوجوان طبقہ ڈائرکٹ ایکشن پر مُصر ہے۔ اس سے میری پوزیشن ایک حد تک مشکل ہو جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس وقت خاکسار تحریک ایک ایسے دور سے گزر رہی ہے جو بے حد توجہ کا مستحق ہے۔ اسلامی وحدت کے مخالف بڑی شدت سے حکومت پنجاب کی حمایت کر رہے ہیں۔ قومیت متحدہ کا پیغامبر مسٹر گاندھی اپنے اصلی خدوخال میں دنیا پر ظاہر ہو چکا ہے۔ "ہریجن" میں ایک مقالہ سپردِ قلم کرتے ہوئے یہ ہندو رہنما حکومت پنجاب کو مشورہ دیتا ہے کہ خاکساروں سے پابندیاں نہ ہٹائی جائیں، امید ہے کہ آپ کی نظر سے یہ مضمون ضرور گزرا ہوگا۔ ہمیں اب اچھی طرح معلوم ہو رہا ہے کہ جبکہ آل انڈیا مسلم لیگ آپ کی قیادت میں خاکساروں پر سے پابندیاں اٹھانے کی سعی کر رہی ہے، ہندو کانگرس اس سعیٔ بلیغ کے خلاف لیگ سے الجھنا چاہتی ہے۔ چند روز ہوئے کہ ایک گمراہ کن خبر تمام اخبارات میں شائع ہوئی۔ کہ خاکساروں نے آخری اور حتمی گفتگو کے لیے میاں احمد شاہ، نواب بہادر یار جنگ اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کو مقرر کر دیا ہے۔ اور اگر پندرہ اپریل تک فیصلہ نہ ہوا تو براہِ راست کارروائی شروع کر دی جائے گی۔ میں نے اس بیان کی تردید کر دی ہے۔

اللہ تعالےٰ سے دست بدعا ہوں کہ آپ کی مساعی جمیلہ کو کامیاب کرے۔

آپ کا مخلص

دستخط :- مدار النظام ہند

مسٹر جناح کو تار

۱۹ راپریل کو حسب ذیل تار مدار النظام ہند کی طرف سے مسٹر جناح کو ارسال کیا گیا :

" میں آپ کی گفتگو کے نتائج کا انتظار کر رہا ہوں ۔ اگر ضرورت ہو تو میاں احمد شاہ اور نواب بہادر یار جنگ کو بھیجدوں ۔"

اس کے بعد صوبہ سرحد کے مشہور خاکسار لیڈر میاں احمد شاہ نے مسلم لیگ کے صدر محمد علی ناح سے بمبئی میں ملاقات کی ۔ یہ ملاقات ۲۹ راپریل ۱۹۴۰ء کو ہوئی ۔ اس ملاقات کے متعلق صفدر سلیمی لکھتے ہیں :

میاں احمد شاہ بیرسٹر بمبئی روانہ ہو گئے اور آپ نے ۲۹ راپریل کو مسٹر جناح سے ملاقات کی ، ٹر جناح سے سوال کیا کہ آپ نے اپنے وعدوں کو کس حد تک عملی جامہ پہنایا : مسٹر جناح کوئی لی بخش جواب نہ دے سکے اور لاجواب ہو کر فرمایا " بہتر ہو گا کہ خاکسار تحریک مسلم لیگ کے جھنڈے تلے آ جائے " ۔ سرحد کا جہاندیدہ بیرسٹر سب کچھ بھانپ گیا ۔ نگاہوں کے سامنے سے تماد کے تمام نقاب اٹھ گئے ۔ آہستہ سے دل میں کہا کہ ع من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال رساتھ ہی بکمال خندہ پیشانی اس ضرب کاری کا جواب دیتے ہوئے تیر نشانے کی طرف چھوڑ یا " مسٹر جناح میں آپ کو خاکسار تحریک میں شمولیت کی جوابی دعوت پیش کرتا ہوں آپ کے ے یہی بہتر ہو گا " ایک شکست خوردہ مسکراہٹ کے سوا مسٹر جناح اس دعوت کا کوئی جواب نہ ے سکا ۔ انہوں نے واضح طور پر ثابت کر دیا کہ وہ خاکساروں کے لیے کچھ بھی نہ کر سکیں گے ، بلکہ موقع ملا تو اپنے پر عظمت مستقبل کی تعمیر کا سنگ بنیاد ان ہی شہیدوں کی ہڈیوں اور خون پر کھنے کی کوشش کریں گے ۔

۵ رمئی کو میاں صاحب نے لاہور میں سر سکندر وزیر اعظم پنجاب سے ملاقات کی ، دوران ے پوچھا کہ آخر اس کشیدگی کا باعث کیا ہے ۔ جبکہ خاکسار نہ تو سول نافرمانی اور نہ ہی بغاوت کے

حامی ہیں۔ نہ حکومت کے نظام میں کوئی رکاوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس بات کے لیے بھی ہیں کہ حکومت کی طرف باعزت تعاون کا ہاتھ بڑھا سکیں۔ سر سکندر کی ہٹ دھرمی سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا اور میاں صاحب مسلم لیگ کے صدر اور اس کی ورکنگ کمیٹی کے ہر رکن ہر بارگاہ سے بے نیل و مرام واپس لوٹے

محترم میاں صاحب کی پیش کردہ شرائط حسب ذیل تھیں

۱۔ قائد تحریک جناب علامہ مشرقی کو جلد رہا کیا جائے۔

۲۔ تمام پابندیاں تحریک پر سے اٹھائی جائیں۔

۳۔ شہدار کے ورثا کو معاوضہ دیا جائے۔

۴۔ گرفتار شدگان کو رہا کیا جائے۔

۵۔ ضبط شدہ منقولہ وغیر منقولہ جائیداد واپس کی جائیں۔

وزیر اعظم پنجاب نے ان تمام شرائط کو رد کرتے ہوئے اپنی شرائط پیش کیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ پابندی نہیں اٹھائی جائے گی۔ مقدمات واپس نہیں لیے جائیں گے۔ علامہ صاحب کی رہائی حکومت پنجاب کے اختیار میں نہیں، صرف خلاف قانون ہونے کی پابندی کا آرڈر واپس لے لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں محترم میاں احمد شاہ صاحب نے حسب ذیل خط وزیر اعظم پنجاب کو لکھا

میاں احمد شاہ کا خط بنام وزیر اعظم پنجاب

جناب عالی! آپ کی حکومت کے حکم امتناعی کی وجہ سے جو تنازعہ خاکساروں اور حکومت پنجاب کے درمیان رو پذیر ہو گیا ہے۔ اس کی بابت گفت و شنید کے دوران میں آپ نے جس اخلاق کا ثبوت دیا۔ اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن ساتھ ہی مجھے اس بات کا رنج ہے کہ میں آپ کو باعزت مفاہمت کے لیے تیار نہ کر سکا۔ بمبئی سے لاہور روانہ ہوتے وقت مجھے اعتماد کلی تھا کہ صلح کے لیے میری مساعی جمیلہ عروس کامیابی سے ضرور ہمکنار ہوں گی۔ کیونکہ میرے خیال میں خاکساروں کا معاملہ اتنا سہل اور آسان تھا کہ بہت ہی تھوڑے سے وقفے میں مفاہمت ہو سکتی تھی

اس گفتگو کے دوران میں، میں نے آپ کو پے در پے یقین دلایا تھا کہ ۱۹ رمارچ کی بدبخت فائرنگ کے باوجود خاکسار حکومت برطانیہ کے ساتھ، موجودہ وقت کے جنگی حالات کے بپیش نظر فوجی بھرتی میں مدد دے کر علامہ صاحب کی تجویز کے مطابق اشتراک عمل کے لیے تیار ہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ کوئی نہ کوئی حل ایسا تلاش کر لینا چاہیئے، جس سے خاکسار تحریک برباد ہونے سے بچ جائے۔
اس پر آپ نے یہ شرائط پیش کی تھیں

۱۔ خاکسار تحریک اپنا عمل صرف سوشل کاموں تک محدود رکھے۔

۲۔ خاکسار تحریک کسی ذمہ دار خاکسار لیڈر کے ماتحت کام کرے۔

۳۔ خاکسار تحریک قانون کا احترام کرتے ہوئے امن عامہ میں حائل نہ ہو۔

پہلی اور تیسری شرط کے متعلق آپ نے کہا تھا کہ یہ دونوں چیزیں تحریک کے نظام میں اب بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ دوسری شرط کے متعلق میں نے کہا تھا کہ ذاتیات سے قطع نظر پالیسی اصل چیز ہے۔ اور میں نے آپ کو یقین دلایا تھا کہ اس میں کوئی خامی نہ ہوگی۔ اس گفتگو کے زیر اثر میں نے حقیقی صلح و امن کی خاطر مندرجہ ذیل نکات آپ کے سامنے رکھے تھے۔

۱۔ علامہ مشرقی کو فوراً آزاد کر دیا جائے۔

۲۔ گرفتار شدہ خاکساروں اور ان خاکساروں کو جن کے مقدمات کی سماعت جاری ہے۔ رہا کر دیئے جائیں۔

۳۔ خاکسار شہداء کے پسماندگان کو معاوضہ دیا جائے۔

۴۔ تمام امتناعی احکامات واپس لیے جائیں اور تحریک کو حسب دستور جاری رہنے دیا جائے۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ نے یہ نکات منظور نہ فرمائے۔ میں نے یہ حوالہ بھی دیا تھا کہ حکومت یوپی نے کس سیر چشمی سے آدھ گھنٹے کے اندر اندر میرے سمجھانے کے مطابق خاکساروں سے مفاہمت کر لی تھی۔ میں نے آپ کو مکرر یقین دلایا تھا کہ خاکسار اس تنازعہ کو قطعی طور پہ دفن کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ صلح کے لیے آئندہ جب کبھی حکومت تیار ہو، میری خدمات حاضر رہیں گی۔ لاہور سے واپسی پر میں نے تمام معاملات ذمہ دار افسران تحریک کے حوالے کر دیئے تھے۔ ان حالات کے ماتحت رنج و افسوس کے ساتھ

وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ حکومت اور خاکساروں کا موجودہ تنازعہ ختم نہیں ہوسکتا۔
آپ کا خیر اندیش
'میاں احمد شاہ'

مسجدوں کا محاذ

صلح کے تمام امکانات سے وزیر اعظم پنجاب کے رویہ نے خاکساروں کو قطعاً مایوس کر
انہوں نے تنگ آکر سالار محاذ کے حکم پر اپنی جدوجہد جاری کر دی۔ مسجدوں میں پناہ گزین خاکسار
نے مسجدوں سے مظاہرے شروع کر دیئے۔ کھانے کا تمام سامان مسلمان پبلک مسجدوں میں پہنچا
رہی، آخر حکومت نے مسجدوں پر سخت پہرہ لگا دیا۔ خار دار جنگلے بھی لگے۔ ملحقہ مکانوں کی چھتوں
پر بھی پولیس کا قبضہ ہوگیا۔ اور مسجد میں داخل ہونے والے ہر شخص کی تلاشی لی جانے لگی۔ اہالیانِ
لاہور کے ایمان نے جوش مارا اور مرد تو مرد مستورات نے کھانے کا سامان اندر پہنچانے کی ہر ممکن
کوشش کی۔ محترمہ باجی رشیدہ لطیف بیگم نے اعلان کیا کہ دیکھوں مجھے اندر کھانا لے جانے سے
کون روک سکتا ہے؟ خاکساروں کی یہ حالت برادر اقوام کے افراد بھی برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ
اکثر ہندوؤں نے کھانے کا سامان مکانوں کی چھتوں سے مساجد میں پھینکا۔ حکومت کی اس بربریت
پر تمام ملک میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ وزارت کے خلاف تمام ملک میں جلسے ہوئے۔ اور جلوس
نکالے گئے۔ کمسن بچوں نے لاہور کے بازاروں میں وزیر اعظم سر سکندر کا جنازہ نکالا۔ پبلک کی حکومت
کے خلاف بڑھتی ہوئی نفرت اور خاکسار تحریک کے حق میں بے پناہ مظاہرے دیکھ کر حکومت
پنجاب مساجد کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہوگئی۔ حکومت کے اس اعلان پر پنجاب کے مقتدر اصحاب
کے مشورہ کے پیش نظر سالار محاذ نے تین دن کے لیے تمام مظاہرے اور سرگرمیاں بند کر دیں۔ ۹ مئی
سے ۱۲ مئی تک مکمل امن اور سکوت رہا۔ اور اس عرصہ میں خیال تھا کہ حکومت پنجاب سے صلح
ہو جائے گی۔ اور آخر جب سمجھوتہ نہ ہوسکا، تو ۱۳ مئی کو تمام مظاہرے پھر پوری سرگرمی
سے شروع ہو گئے۔

مسٹر جناح کا اخباری بیان

۲۸ جون ۱۹۴۰ء کو مسٹر جناح نے حسب ذیل بیان پریس کے حوالے کیا۔ (ترجمہ) "مجھے پنجاب گورنمنٹ اور خاکساروں میں صُلح کرانے کے بارے میں بہت سے خطوط موصول ہوئے۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں نے بمبئی سے شملہ جاتے ہوئے مجھ پر زور دیا کہ میں اس معاملہ میں دخل اندازی کروں۔ مسلمانوں اور خاکساروں میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ مسلم لیگ اس بارے میں کچھ نہیں کر رہی، میں پھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ، مسلمانوں کی جہاں کہیں بھی وہ ہوں، ہر طرح سے ان کی مدد کرنے اور ان کے لیے انصاف کرنے کو تیار ہے۔ میں نے عموماً ذاتی طور پر خاکساروں سے بھی اپنی ہمدردی کو نہیں چھپایا اور اگر خاکسار مشورہ کر کے مجھے اختیارات دے دیں۔ تو میں موجودہ قضیہ کا باعزت حل ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

مسٹر جناح کے مذکورہ بیان کے جواب میں مدار النظام ہند نے حسب ذیل تار محترم مسٹر جناح کو ارسال کی:

"(ترجمہ) آپ کے تازہ بیان کے بارے میں، میں خاکساروں کے موجودہ سب سے بڑے افسر کی حیثیت سے وزارت پنجاب کے ساتھ باعزت صلح کے لیے آپ کو اختیار دیتا ہوں، جس میں مندرجہ ذیل امور شامل ہوں گے

۲۸ فروری کی پابندی ہٹا دی جائے۔ علاّمہ مشرقی اور دوسرے خاکساروں کو رہا کر دیا جائے ہلاک شدگان کے ورثاء کو خون بہا دیا جائے۔ جرمانے واپس کر دیئے جائیں اور جو جائیدادیں وغیرہ ضبط کر لی گئی ہیں۔ واگذار کر دی جائیں۔"

دستخط مدار النظام

مسٹر جناح کی طرف سے جوابی تار حسب ذیل تھا:

(ترجمہ) "میں خاکساروں کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ وہ گفتگوئے صلح کے دوران میں قانون کی خلاف ورزی ترک کر دیں، اور اگر ڈاکٹر اسمٰعیل کی ہدایت پر خاکساروں نے

عمل کیا تو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان کو خاکساروں کی طرف سے صلح کرنے کا حق ہے۔

جناح

مسٹر جناح کا یہ تار موصول ہوتے ہی مدار النظام نے انہیں حسب ذیل تار ارسال کیا اور ساتھ ہی پنجاب میں خاکساروں کی تمام سرگرمیاں بند کر دینے کے احکام نافذ کیے

مائی ڈیئر مسٹر جناح!

(ترجمہ) "آپ نے صلح کے لیے جو گفتگو شروع کر دی ہے، اس کی کوششوں میں آسانی پیدا کرنے کے لیے میں نے ۲۷ جولائی تک پنجاب میں خاکساروں کو قانون کی خلاف ورزی ترک کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ سالار خاص ہند کو ہدایت کر دی کہ وہ خاکساروں کے اقدام کو فوراً بند کرے"

دستخط مدار النظام

۲۵ جولائی تک مسٹر جناح کی طرف سے مکمل خاموشی رہی، مدار النظام نے بڑے انتظار کے بعد مجبوراً انہیں حسب ذیل خط لکھا:

میرے پیارے جناح!

(ترجمہ) "آپ کو اس بات کا علم ہوگا کہ آپ کی باعزت صلح کی کوشش کو، جس کی آپ نے رضا کارانہ طور پر پیشکش کی تھی، کامیاب بنانے کے لیے صوبہ پنجاب میں تمام سرگرمیاں ۲۷ جولائی کی رات بارہ بجے تک ملتوی کر دینے کے احکام خاکساروں کے نام صادر کر دیئے گئے تھے۔ خاکساروں نے اپنی سرگرمیاں نہ صرف شارع عام اور مسجدوں بلکہ جیل خانوں میں بھی روک دی ہیں۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے احساسات ان لوگوں کے بارے میں کیا ہوں گے۔ جو جیل خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ مجھے معتبر ذرائع سے خبر ملی ہے کہ خاکساروں پر وحشیانہ اور ظالمانہ جور و ستم منتقمانہ طور پر ڈھائے جا رہے ہیں۔ ہم کس طرح آرام کر سکتے ہیں جبکہ دیر کرنا ان شخصیتوں کے ساتھ دھوکا کرنا ہوگا۔ جو اس وقت مصیبتوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ قدرتی طور پر میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس بارے میں کیا کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے تفکرات کا اندازہ لگا سکتے ہیں، ہم ۲۷ جولائی کے رات کے بارہ بجے تک انتظار کر سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہم کسی طرح انتظار نہیں کریں گے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کی کوششیں کامیاب ہوں۔ آپ

مجھے اپنی گفتگوئے صلح کی رفتار سے مطلع کریں کہ صلح کی بات چیت کس مرحلہ پر ہے۔"

آپکا مخلص مدار المہام

۱۶ر جولائی کو مسٹر جناح کا حسب ذیل خط جواب میں موصول ہوا:

(ترجمہ) مونٹ پلیزنٹ روڈ، مالابارہل - بمبئی ۱۱ر جولائی ۱۹۴۰ء

مدار المہام صاحب!

"مجھے آپ کا جولائی والا تار ملا۔ جس میں آپ نے پنجاب میں خاکساروں کی سرگرمیاں ۲۷ر جولائی تک بند کر دینے کی اطلاع دی ہے۔ میں حتی الوسع جس قدر جلد ممکن ہو سکے گا۔ آپ سے اس بارے میں خط و کتابت کروں گا۔"

دستخط ایم اے جناح

مدار المہام کا جوابی خط

مائی ڈیئر مسٹر جناح!

"مجھے آپ کی ۱۱ر جولائی والی چھٹی ملی۔ آپ کی کوششوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خاکساروں اور پنجاب گورنمنٹ میں صلح کرانے میں آپ کامیاب ہوں۔ آپ کے جواب کا جلد از جلد منتظر ہوں۔"

آپ کا مخلص

دستخط مدار المہام

میاں احمد شاہ کا اخباری بیان

"مجھے خاکسار تحریک کے موجودہ افسر اعلیٰ کی طرف سے احکام موصول ہوئے ہیں کہ چونکہ اس وقت تک مسٹر جناح کی طرف سے صلح کی کوششوں کے نتائج کی اطلاع نہیں ملی۔ اس واسطے انہوں نے ۱ر اگست تک خاکسار سرگرمیوں کی التوا کی توسیع کا حکم دیا ہے۔ سالار خاص ہند کو حکم دیا جاتا ہے کہ فوراً خاکساروں کے اقدامات کو روکنے کے انتظامات کریں۔"

مسٹر جناح کا خط

مونٹ پلیزنٹ روڈ، مالابارہل بمبئی   ۲۶ جولائی ۱۹۴۰ء

جناب محترم!

آپ کے ساتھ خط و کتابت کے نتیجہ کے طور پر میں نے ہز ایکسیلینسی وائسرائے بہادر کی توجہ پنجاب میں خاکسار سوال پر مبذول کرائی تھی، مجھے ۲۴ جولائی کی لکھی ہوئی چھٹی وائسرائے بہادر کی طرف سے موصول ہوئی۔ جس کی نقل ارسال کی جاتی ہے۔ مجھے سرسکندر کی شائع شدہ نقل شرائط ابھی تک موصول نہیں ہوئی۔ جس کے ماتحت وہ خاکسار تحریک پر سے پابندیاں اٹھانے کے لیے تیار ہیں، آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ آپ ان سے خط و کتابت کر کے معلوم کر لیں کہ وہ شرائط کیا ہیں؟

دستخط ایم اے جناح

یہ تھے وہ حالات اور کوائف جس نے خاکساروں کے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلم لیگ کے لیے گرہ باندھ دی اور یہی وہ رویہ تھا۔ جس کی بنیاد پر علامہ مشرقی نے مسلم لیگ کو کبھی نہیں بخشا۔ تحریک کی تباہی گوارا کر لی۔ لیکن بدلے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش نہیں کی۔

اطاعت امیر

علامہ مشرقی نے اپنی تحریک کو مقبول عام بنانے کے لیے لاانداز مضامین تحریر کیے، پمفلٹ شائع کیے، باقاعدگی سے "الاصلاح" نامی ہفتہ وار رسالہ شائع کیا۔ لیکن ان تمام پمفلٹوں اور تحریروں میں، اس دور کے مسائل کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ بلکہ فروعی مسائل کی بنیاد پر تنظیم کو کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ یہ پروگرام کا فقدان ہی تھا۔ مسائل سے اغماض اور ان مسائل کی وضاحت سے پہلوتہی اور ان کے حل سے لاعلمی ہی تھی، جس نے علامہ مشرقی کو مختصر سے نعرے "اطاعت امیر" کی طرف مائل کیا۔ اور وہ یہ سمجھنے لگ گئے کہ اگر مسلمان ایک امیر کی اطاعت کے پرچم تلے منظم ہو جائیں تو ان کے دن پھر جائیں گے۔ چنانچہ وہ اپنی اس امیر پرستی میں یہاں تک نکل گئے کہ انہوں

نے اسلام کی جمہوریت پسندی کی روایات اور حکمرانوں پر نکتہ چینی کی آزادی کو بھی بڑی حد تک ہدف تنقید بنایا۔ چنانچہ "مولوی کا غلط مذہب" نامی پمفلٹ نمبر ۴ میں "یمن کی چادروں والے قصے سے مسلمانوں کا مکر" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"مسلمانو! آج کل کے مولوی اور مفتدی دونوں نے قرآن کی ہدایت کی تشریح میں اپنے نفس کے لیے آسانیاں مدنظر رکھ لی ہیں۔ مسلمان نے قرآن اور حدیث کو اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ اپنا نفس موٹا ہو سکے، نفس امارہ کو ہر ممکن آسانی مل سکے۔ مسلمان آج حضرت عمرؓ کی یمن کی چادروں والا قصہ بار بار اس لیے دہراتا ہے کہ ہر شخص کو ہر وقت اپنے امیر پر بیجا اور جھوٹ نکتہ چینی کا موقعہ ملے۔ شیطانی جذبوں کا بھڑکاؤ ہر وقت ہوتا رہے۔ عین بھرے مجمع میں دیانتدار سردار پر بھی تھوکنے کا موقعہ مل جائے۔ نفس کی خوب پرورش ہو، دل کو خوب تسلی ہو، امیر کو سرعام رسوا کر کے اس کی گت بنائی جائے، گت بنا کر بظاہر اس کو "اسلام کی خوبی" جتایا جائے، لیکن بباطن اس سردار سے ذاتی انتقام لیا جائے۔ اپنے خبث باطن کی فساد انگیز طاقت کا مظاہرہ کیا جائے۔ یاد رکھو قرآن کبھی ایسا فتنہ انگیز حکم نہیں دے سکتا۔ اسلام میں فتنہ و فساد سب سے زیادہ مکروہ شے ہے۔ اسلام امن اور صلح کے مترادف ہے۔ یمن کی چادروں کے متعلق حضرت عمرؓ پر سرعام اعتراض کرنے والا اعرابی انتہائی طور پر بدبخت اور بدنیت تھا۔ اگر کسی بڑے آدمی سے خبر ملنے کے بعد اس کی نیت نیک ہوتی تو "اِذا جاءکم فاسقٌ بنبإٍ فتبیّنوا" کے قرآنی حکم کے ماتحت وہ سب سے پہلے علیحدہ ہو کر حضرت عمرؓ سے سوال کرتا کہ یہ چادریں کہاں سے آئیں، کسی سے تحقیقات پچھواتا، آپ انفرادی طور پر تحقیق کرتا۔ اتنے بڑے اور دیانتدار سردار پر جو امیر المومنین ہو کر بوڑھی عورتوں کا پانی روزانہ بھرا کرتا تھا۔ ایسا کمینہ اعتراض کرنے سے صاف جھجکتا۔ وہ اعرابی آپ بددیانت تھا۔ اس لیے اس کو صرف بددیانتی کی سوجھی، وہ سمجھتا کہ اتنا بڑا امیر ایسی کمینی اور ادنیٰ بات نہیں کر سکتا۔ صرف خاموش رہتا۔ اس کی نیت صاف خراب تھی، جو اس نے مسلمانوں کو ناحق حضرت عمرؓ کی نافرمانی پر اکسایا وہ آپ ایک کی بجائے دو چادریں لینا چاہتا تھا۔ اور حسد کے مارے جل گیا۔ اس کی فطرت فتنہ پسند تھی، جو خاموش نہ رہ سکا۔"

"اسلام میں امیر کی اطاعت مطلق اور بلا قید شرط ہے۔"

الغرض اے مسلمانو! امیر کی نافرمانی کی سند نہ یمن کی چادروں والا قصہ ہو سکتا ہے نہ اولی الامر منکم والی آیت کے وہ فتنہ انگیز معانی جو مولوی نے اپنے نفس کو پالنے کے لیے اپنی طرف سے بنا لیے ہیں، نہ ردّوہ الی الرسول کا مطلب حدیثوں سے استدلال اور تفسیروں اور تشریحوں کے دفتر کھولنا یا اپنے امیر سے مناظرہ کر کے قرآن و حدیث کے اپنے مطلب اور نفس کے موافق معنی بنانا ہے۔ جماعت کے امیر کی حیثیت بالعموم اس قدر بلند ہوتی ہے کہ اس کا غلط یا خلاف شرع یا خلاف معمول یا ناقابل برداشت حکم دینا۔ شاذونادر کا حکم رکھتا ہے۔ امیر جماعت کی ذمہ داریاں ہی اس کو کسی ایسے حکم دینے سے باز رکھتی ہیں۔ جو رعیت کے ناپسند خاطر یا خلاف حکم خدا اور رسول ہو۔ لیکن اسلامی تاریخ اس امر کی صاف شاہد ہے کہ صدر اسلام سے ہی مسلمانوں کی اُمت نے اپنے امیر کے ہر حکم کی بے چون وچراں اطاعت کی، اس کو بارہا ناگوار احکام بھی طوعاً و کرہاً ماننے پڑے، بڑے سے بڑے جابر اور جابر حاکموں کے سامنے بھی اُمت نے اُف تک نہ کی اور راضی بہ رضائے خدا حکم مانتی رہی، ان کے بیت المال میں مسلمان زکوٰۃ داخل کرتے رہے، خطبوں میں ان کے نام بصد اکرام لیتے رہے۔ ان کے ہاتھوں پر اسلامی اور شرعی بیعت کرتے رہے۔ جہاد کے سخت ترین حکموں کی تعمیل کرتے رہے۔ تمام تاریخ اسلام میں ادنیٰ سی مثال اس امر کی موجود نہیں کہ اُمت نے کسی خلیفۃ المسلمین یا ماتحت حاکم سے عام بغاوت کی ہو، یا اس کو قرآن و حدیث کا سبق پڑھا کر اپنے احکام واپس لینے پر مجبور کر دیا ہو، یہ سب اس لیے کہ اسلام نے ہمیشہ اور ہر تعلیم میں جماعتی بہتری کو انفرادی اصلاح پر مقدم رکھا۔ کبھی اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ ایک بڑے امیر کی شخصی اور ذاتی اصلاح کرنے کے لیے اُمت کے اندر خانہ جنگی کی جائے یا قوم کے امن کو خراب کیا جائے۔

"امرائے اسلام کا اختیارِ ناطق"

اسلام کے تمام امیر صدر اسلام سے لے کر زوالِ اسلام تک ہمیشہ مختارِ ناطق یا دوسرے لفظوں میں ڈکٹیٹر ہی رہے۔ اگرچہ ڈکٹیٹر کے انگریزی لفظ کا پورا اطلاق ان پر نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں شاورھم فی الامر اور امرھم شوریٰ بینھم کا حکم ہے۔ لیکن صدر اسلام سے ہی ان احکام کا یہ متفق علیہ مطلب رہا کہ امیر جماعت مشورہ کر سکتا ہے۔ رائے پوچھ سکتا ہے۔ اس کو مشورہ

لینا چاہیے۔ اس کا مشورہ لینا ضروری ہے۔ ایمان کی بات ہے۔ مستحسن ہے، مستحب ہے، لیکن مشورہ کے بعد بھی امیر کا حکم آخری اور قطعی ہے۔ کوئی طاقت اس کو اپنے حکم کی تعمیل کرانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ مسلمان کا امیر در اصل رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین ہے۔ اسی نقطہ نظر سے اس کا نام خلیفۃ النبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی کے دیئے حکموں اور اعمال پر خدا کے سوا کسی کی گرفت نہیں، تو اسلام کا امیر اور خلیفۃ النبی بھی مسلمانوں کے تمام مواخذے سے باہر ہے۔ یہ جب تک نہ ہو کسی جماعت میں ایک لمحہ کے لیے نظام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہر امیر لمحے لمحے کے بعد اُمت کی گرفت میں آسکے گا۔ اس کو اپنے ہر حکم کی تشریح کرنی پڑے گی۔ وہ اُمت کی اجتماعی رائے کے بالمقابل ایک ڈرپوک اور بزدل حکمران ہوگا۔ اور اس کو ہرگز ہرگز کسی بلند مقام پر نہ پہنچا سکے گا۔ مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ اسلام کو بلند کرنے کی خاطر اُمت کو دردناک مصیبتوں میں ڈالتے رہے۔ اُمت کی مجال نہ تھی کہ ان کے سامنے اف کرے، ان کا حکم، ان کے افعال، ان کی تجویزیں اور تدبیریں ہمیشہ ناطق اور ناقابل اعتراض رہیں کسی کو ان کی بظاہر بُری سے بُری تجویز کے خلاف دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ انہوں نے اپنی امارت کی تمام مدت میں کسی کی نہ سُنی اور جب اُمت کی بہتری کے لیے مفید موقعے نظر آئے۔ احتجاج کے باوجود اپنی چلائی اور سب سے بے نیاز ہو گئے۔"

(مولوی کا غلط مذہب نمبر ۴ صفحہ ۱۴ تا ۱۸)

صرف یہی نہیں بلکہ قول فیصل میں خاکسار تحریک کے تنظیمی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے خاکسار تحریک اور اختیار ناطق کے عنوان کے تحت صفحہ ۸۶ پر رقمطراز ہیں:

"خاکسار تحریک کی بنا اول سے آخر تک ہر جگہ اختیار ناطق پر ہے جمہوریت اکثریت یا انتخاب پر کسی جگہ نہیں۔ محلہ کا سالار اس محلہ کا ڈکٹیٹر اس لیے ہے کہ اس محلہ میں اصلاح اور انقلاب پیدا کرنے کی توقع ہے۔ نری انجمن سازی کی توقع نہیں۔ اسی بنا پر اس کو محلہ کے خاکسار سپاہی منتخب نہیں کرتے۔ وہ ادارہ علیہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے۔ اور محلہ کے تمام خاکسار باہمی اتفاق اور اتحاد کر کے بھی اس کو اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتے۔ بلکہ بعض دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایک محلہ کی جماعت اپنے سالار کی مفروضہ سختی سے بگڑ کر اس امر کے درپے ہوئی ہے کہ اپنے منتخب شدہ آدمی کو سالاری کے لیے پیش کرے، اس درخواست کو ہمیشہ رد کیا گیا ہے اور سالار کو موقوف کرنے

کی بجائے اس جماعت کو توڑ دینا بہتر سمجھا گیا ہے۔ اس فیصلے کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوا ہے۔ کہ محلہ کی جماعت بالآخر اپنی کمزوری کو تسلیم کرنے کے بعد اسی مقرر کردہ سالار کے ماتحت پورے جوش سے کام کرتی گئی ہے۔ اور کامل اطاعت کا نمونہ بن گئی ہے۔ انتخاب زور آور قوم کا حق ہو سکتا ہے لیکن کمزور قوم کو انتخاب کا حق دینا اس کے شیطانی جذبات کو بھڑکانا ہے۔ گری ہوئی قوم کو عروج دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کے افراد کی خود رائی کو، جو زوال کا لازمی نتیجہ بلکہ لازمی باعث ہوا کرتی ہے۔ فنا کر دیا جائے۔ کسی شخص کی ذاتی رائے نہ رہے، یہ احساس نہ رہے کہ ہر شخص اپنی ذاتی رائے سے جماعت کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ کمزور قوم میں کمزوری در اصل اس لیے ہے کہ اس میں ہر شخص صرف اپنا اپنا زور پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص پیر اور مرشد ہے۔ ذاتی رائے کو فنا کر دینے سے امن پیدا ہوگا اور امن کے بعد لامحالہ نظام۔ طوائف الملوکی سے نظام ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ سالاران محلہ کے تمام افسران بالا بھی علیٰ ہذا القیاس اپنی اپنی جگہوں پر مختار ناطق ہیں۔ وہ اپنے اپنے علاقہ کی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں۔ ادارہ علیہ کی طرف سے ان کو گرفت ہوتی ہے۔ سزا دی جاتی ہے۔ انعام دیئے جاتے ہیں لیکن کسی روا یا ناروا حکم کو جو وہ ایک دفعہ دے دیں۔ واپس اس لیے نہیں لیا جاتا کہ جمہور میں ان کی ڈکٹیٹر شپ برقرار رہے۔ اگر کوئی سالار پے در پے اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتا۔ تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو تبدیل کر دیا جائے۔ یا خاکسار بنا کر پھر سپاہیوں کی قطار میں شامل کر دیا جائے۔ سالار کو حکم ہے کہ کوئی بڑی تجویز رائج کرنے سے پہلے اپنے ماتحتوں سے مشورہ لیں۔ تجویز کردہ اصلاح سے پہلے جمہور کا اس تجویز کے متعلق میلان دریافت کریں۔ پھر اس کے بعد اپنی ذمہ داری پر جو حکم مناسب سمجھیں نافذ کریں۔ وہ ادارہ کے سامنے جوابدہ ہیں لیکن ان کو حکم نافذ کرنے اور نافذ کرنے کے بعد منوانے کا پورا اختیار ہے۔ یہی اسلامی شوریٰ ہے۔ اور یہی انگریزی لفظ "کونسل" کے اصلی معنی ہیں۔ یہ شوریٰ خاکسار تحریک میں اوّل سے آخر تک رائج ہے"۔

علامہ مشرقی کی تحریروں سے صرف یہ چند اقتباس پیش کیے گئے ہیں تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ علامہ مشرقی اسلام کی سربلندی اور احیائے اسلام کے لیے عامۃ الناس کی حاکمیت نہیں بلکہ "امیر کی حاکمیت" کو بنیاد تصور کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی اپنے نظریے کی حمایت میں اسلام اور اس کی تعلیمات کو بھی پامال کیا۔ ان کے مخالفین نے جب ان کو کفر اور ارتداد کا مرتکب قرار دیا۔ تو انہوں نے

بھی اسلام اور اس کی تعلیمات ہی کا سہارا لیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس دور میں "امیر پرستی" کا یہ نعرہ مقبول کیوں ہوا؟ اور عام مسلمان آنکھیں بند کر کے تقلید امیر کا مسلک اختیار کیوں کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں جاگیرداری اور قبائلی سماج کا اثر ہندوؤں سے کہیں زیادہ تھا۔ اور جاگیرداری اور قبائلی سماج میں قبیلے کے سردار اور گاؤں کے زمیندار کی اطاعت اصل ایمان ہوا کرتی ہے۔ اس لیے جب بھی کسی لیڈر یا رہنما نے اس اصول کو اپنایا تو لوگ جوق در جوق اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اور جب کچھ سالوں کے بعد مسلم لیگ مقبول ہوئی تو اس کے تمام ظاہری طور پر جمہوری رکھ رکھاؤ کے باوجود قائد اعظم کو ایک امیر ہی کی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ اور مجلس عاملہ کونسل جیسے تمام ادارے موجود تھے لیکن قائد اعظم کی شخصیت ان تمام اداروں سے بھاری تھی۔ یہ درست ہے کہ کانگرس میں بھی گاندھی جی کو اسی قسم کا اثر ورسوخ حاصل تھا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ کانگرس کے اندر بائیں بازو کا ایک خاصا اہم گروہ موجود تھا جو اس اثر ورسوخ کے خلاف سینہ سپر ہوتا تھا۔ اور ایک وقت میں گاندھی جی کے اس اثر ورسوخ کو شکست بھی دی جا سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ کانگرس اور ہندوؤں کے اندر مزدور طبقہ اور اس طبقے کی سیاسی ترجمان جماعتیں سرگرم تھیں۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں میں نہ تو مزدور طبقہ اتنا فعال ہو سکا تھا۔ کہ وہ اپنی جدوجہد کے لیے اپنے اندر سے قیادت تخلیق کرتا یا کسی سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت محسوس کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دور میں جو مقبول عام سیاسی جماعتیں ابھریں وہ غیر واضح نعروں کی بنیاد پر ابھریں۔ اور عامۃ الناس فنی طور پر ان غیر واضح نعروں اور جماعت کے قائدین کی تقریر و تحریر پر سر دھنتے رہے اور جیسے ہی ان سے مایوس ہوئے۔ کوئی اور جماعت اور کوئی اور نعرہ ان کو مسحور کرنے لگا۔

خاکسار تحریک کے بانی اور قائد علامہ عنایت اللہ مشرقی خود امرتسر کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور لطف یہ ہے کہ ان کی پیدائش کا زمانہ بھی اسی دور سے تعلق رکھتا ہے، جس دور میں برعظیم کے اکثر و بیشتر رہنما پیدا ہوئے۔ مشرقی کی تاریخ پیدائش ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء ہے۔ اسی زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو پیدا ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد پیدا ہوئے۔ سبھاش بوس پیدا ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں پیدا ہونے والوں نے جب بلوغت میں قدم رکھا تو ان کو نئی صدی اور اس کے نئے تقاضوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کو ایشیا میں قوم پرستی

کا سورج طلوع ہوتا دکھائی دیا۔ پہلی بار ایک ایشیائی طاقت جاپان نے روس کی زار شاہی کو شکست دی، ایشیائی ملک کی اس فتح نے پورے ایشیائی ممالک کے نوجوانوں میں نئے ولولے پیدا کئے اور ان ولولوں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکنے کے عزم کو جنم دیا۔ علامہ مشرقی کا پورا نام عنایت اللہ خان تھا۔ آپ کے والد عطا محمد خان امرتسر کے رئیس اور صاحبِ تصنیف بزرگ تھے، اپنے دور کے اہلِ علم سے ان کے بہت قریبی مراسم تھے۔ غالب اور ذوق سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے، سر سید احمد خان سے بھی مشرقی کے والد کے بہت گہرے تعلقات تھے، جمال الدین افغانی جب کلکتہ میں مقیم ہوئے تو اُن سے بھی عطا محمد خان کے مراسم قائم ہو گئے تھے، نواب لوہارو سے تو ان کی خاصی گاڑھی چھنتی تھی، ان تعلقات اور والد کی اپنی افتادِ طبع نے علامہ عنایت اللہ مشرقی کو بچپن ہی میں علمی تحقیق و تفتیش اور روشن خیالی کا ماحول مہیا کر دیا۔ مشرقی نے انٹرمیڈیٹ تک امرتسر ہی میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں فارمن کرسچین کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس زمانے میں ریاضی کے مضمون نے ان کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے فارمن کرسچین کالج سے بی اے کر لینے کے دو سال بعد، ریاضی کا ایم اے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی میں علامہ مشرقی اوّل رہے۔ اس قابلِ رشک کامیابی نے آپ کی غیر معمولی ذہانت کی دھاک پورے ملک میں بٹھا دی۔ آپ کو کئی اعلیٰ عہدوں کی پیشکش ہوئی۔ لیکن انھوں نے تعلیم کو جاری رکھنے کا جو ارادہ باندھ لیا تھا۔ اس پر سختی سے کاربند رہے اور تحصیلِ علم کے شوق کی تشفی کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔ ۱۹۰۷ء میں آپ نے کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج میں داخلہ لیا۔ اور پہلے ہی سال ایک مقابلے کے امتحان میں، جس میں سترہ کالجوں کے طلبا شریک ہوئے تھے۔ اوّل آئے، اس کامیابی پر یونیورسٹی کی طرف سے منتر لونڈ ماہانہ وظیفہ دیا گیا اور "فاونڈیشن سکالر" کا اعزاز بخشا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے ریاضی کا ٹرائی پاس جس کے لئے تین سال کی میعاد ہوتی ہے دو سال ہی میں پاس کر لیا۔ اس میں بھی آپ اوّل آئے اور "رینگلر" کا خطاب حاصل کیا۔ اس وقت پوری دنیا میں "رینگلروں" کی تعداد ایک درجن سے زائد نہیں تھی، اس کے بعد ریاضی کے اور بہت سے امتحانات پاس کئے۔ چنانچہ یونیورسٹی نے اس کامیابی پر آپ کو "بیچلر سکالر" کا اعزاز دیا۔ اس کے بعد آپ نے علوم مشرقی کی طرف توجہ کی اور

اس میں بھی ڈگری حاصل کی۔ اس طرح علم طبعیات، انجینئرنگ اور نہ جانے کن کن مضامین میں ڈگریاں حاصل کیں۔ اس زمانے میں انگلستان کا کوئی اخبار ایسا نہ تھا جس نے اس طالب علم کی ذہانت کو خراجِ تحسین پیش نہ کیا ہو۔ اور علمی قابلیت کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہو۔

انگلستان کے اس قیام کے دوران آپ نے صحافت کی طرف بھی توجہ کی۔ اور کئی اخبارات کے لئے مضامین ہی نہیں لکھے۔ بلکہ ان کے سیاسی وقائع نگار کے طور پر بھی فرائض انجام دیئے۔

۱۹۱۲ء میں جب یورپ میں جنگ کی فضا تھی اور یورپی طاقتیں اپنے شہنشاہی مقاصد کے لئے اس جہانِ رنگ و بو کو از سرِ نو تقسیم کرنے کے منصوبے باندھ رہی تھیں اور اس کے لئے زبردست تیاریاں ہو رہی تھیں، مُہرے بڑھائے جا رہے تھے۔ بلقان کی ریاستوں کو شہ دے کر سلطنتِ عثمانیہ سے دست و گریبان کرایا جا رہا تھا، تو مشرقی اپنے وطن لوٹے یہاں اُن کو کئی ایک ریاستوں میں اعلیٰ عہدوں کی پیشکش کی گئی۔ البتہ سر جان راس کیپل جو صوبہ سرحد کے گورنر تھے، ان کے کہنے پر اسلامیہ کالج پشاور کی پرنسپلی قبول کر لی۔ اس زمانے سے لے کر ریٹائر ہونے تک آپ محکمہ تعلیم ہی سے منسلک رہے اور اسی قیام کے دوران میں انھوں نے "خاکسار تحریک" کی بنیاد رکھی۔ لیکن اس تحریک کے قیام سے بہت پہلے علامہ مشرقی نے مسائل کو اپنے انداز میں سمجھنے اور اپنا نقطۂ نظر منضبط کرنے میں خاصی مدت صرف کی۔ چنانچہ یہ واقع ہے کہ علامہ مشرقی نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف تذکرہ ۱۹۲۵ء میں تصنیف کی تھی، اس کتاب پر ۱۹۲۵ء میں تو اتنا شور نہ ہوا۔ لیکن جب خاکسار تحریک ابھری اور اس نے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کو منظم کرنا شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے مقبولیت کی منازل طے کرنا شروع کیں تو اس وقت "تذکرہ" بھی زبردست موضوعِ بحث بن گیا، اور ایک طرف اگر علامہ مشرقی "مولوی" کے لتے لے رہے تھے تو دوسری طرف مولوی بھی اس "تذکرے" کی بنیاد پر کفر کا فتوےٰ دے رہے تھے۔

تذکرہ دراصل اسلام کی جدید تقاضوں کی بنیاد پر تفسیر تھی اور مشرقی کا اس تذکرے کو دس جلدوں میں مکمل کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن وہ ایک جلد کے بعد دوسرے کاموں میں ایسے اُلجھے کہ اس طرف توجہ ہی نہ دے سکے۔ لیکن پہلی جلد جس کا کچھ حصہ عربی میں ہے اور کچھ حصہ اُردو میں،

اپنی اہمیت کے لحاظ سے ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ یہ واقع ہے کہ مشرقی کی اس تصنیف نے ان کو دنیا بھر کے مستشرقین کی صفوں میں اعلیٰ حیثیت عطا کی۔ اور ان کے اس "تذکرہ" کے متعلق یورپ، امریکہ اور خود اسلامی ممالک میں مضامین لکھے گئے اور مدتوں یہ تصنیف موضوع بحث بنی رہی۔ لیکن علامہ مشرقی جب تحریک منظم کرنے کے لئے میدان میں اُترے تو ان کے ذہن میں صرف مسلمانوں کے ماضی کی عظمت تھی، وہ اس عظمت کو واپس لانے کے خواہشمند تھے، لیکن وہ اپنے دور کے ہندی مسلمانوں کے مسائل سمجھنے اور ان کے معاشی اور سیاسی حل ڈھونڈنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خاکسار تحریک کے سلسلے میں تصنیف و تالیف کے حربے کو پوری طرح استعمال کیا۔ اور اس لحاظ سے مسلمانوں کی یہ پہلی تحریک تھی، جس نے تحریک کی تبلیغ و تشہیر کے لئے اتنے بڑے پیمانے پر لٹریچر شائع کیا جو آج بھی اس تحریک کے بنیادی خدوخال کو سمجھنے میں خاصی مدد دیتا ہے۔

تشدّد اور عسکریّت

خاکسار تحریک کی مقبولیت کے کئی راز ہیں۔ ان میں ایک راز تشدّد اور عسکریّت کی تبلیغ ہے۔ خاکسار تحریک فوجی تنظیم کی داعی رہی ہے، اور عدم تشدّد کا مذاق اڑاتی رہی ہے چنانچہ علامہ مشرقی خاکسار تحریک کے تفصیلی مسلک کو اپنی تصنیف قول فیصل میں کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اس میں دوسرے باب کا عنوان "خاکسار تحریک اور بادشاہت زمین" ہی تحریک کا منتہا ہے۔ اس باب میں وہ یوں لکھتے ہیں:

"اگر یہ بات اصلاً اور اصولاً درست ہے کہ حرکت اور اتحاد کے بغیر کسی قوم کا غالب آنا محال ہے تو جو شئے قوم میں ہاتھ پاؤں کی حرکت اور اتحاد پیدا کر رہی ہے کم از کم اصولاً درست ہے۔ یہ دونوں باتیں ہر قومی رہنما کے سامنے ہر وقت ہوتی ہیں۔ اور وہ انہی کی بنیاد پر اپنی عمارت کی پہلی اینٹ رکھتا ہے۔ یا بہر نوع ان کے خواب دیکھتا ہے۔ حرکت اور اتحاد جنگی قوت پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ تجویزیں ڈھونڈتا ہے۔ جس سے مقابلے کی طاقت پیدا ہو جائے، لیکن کسی تجویز کا اصولاً اور بطور نظریے کے درست ہونا ایک شئے ہے۔ اور اس کا عملاً اور از روئے نتیجہ

درست ہونا بالکل دوسری شئے۔" خاکسار تحریک" عملاً اور نتیجتہً درست اس لیے ہے کہ اس کی پیدا کی ہوئی حرکت اور اس کا پیدا کیا ہوا اتحاد دونوں طاقت، قوت، غلبہ، حکومت اور بادشاہت کی طرف سیدھے سے سیدھا اور چھوٹے سے چھوٹا راستہ ہے۔ اس رستے میں کجی اور ٹیڑھا پن نام کو نہیں، جس شئے کو حاصل کرنے کی آرزو میں مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کی ہزاروں انجمنیں، مجلسیں تمام عمر کوشش کرتے کرتے مٹ گئیں۔ جس مجاہدانہ طاقت کی خواہش میں کئی گول مول اور بزدلانہ طریقے ایجاد ہوئے اور چل نہ سکے۔ جس جنگی قوت کے ارمان میں دردمند دلوں سے آہیں اور شاعروں سے نوحے پر نوحے نکلتے رہے۔ وہ شئے وہ مجاہدانہ طاقت وہ مقابلے کی جنگی قوت یہ تحریک براہ راست ہر خاکسار میں پہلے دن سے اور بےخوف و خطر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا ایک ایک قاعدہ اور ایک ایک عمل جنگی اور فوجی اصول پر ہے۔ جنگ کے قواعد سکھلا رہا ہے۔ مقابلے کی طاقت پیدا کر رہا ہے۔ نظم و نسق کا سچا اور آخری سبق دے رہا ہے۔ مطیع ہو کر رہنے کے ڈھنگ بتا رہا ہے۔ سردار بننے کے نہیں، حکومت کرنے کے طریقے بتا رہا ہے۔ خاکسار سپاہی صرف نمائشی اور دکھلاوے کا سپاہی نہیں، سچا اور فوجی سپاہی ہے! خاکسار سالار بتر انام کا سردار نہیں، فوجی اور جنگی سردار ہے! خاکساروں کی صف صرف کھلونوں کی قطار نہیں جو خوبصورت لباس پہن کر بھلے لگتے ہیں۔ وہ سپاہیوں اور مجاہدوں، سرفروشوں اور جانبازوں کی صف ہے! یہ سب اس لیے کہ ہم نے تیرہ سو برس کی بھول اور کئی سو برس کی خطائے کبیر کے بعد پھر اپنے سچے اور اصلی، پھر قطعی اور خدائی، ہاں آخری محمدﷺ کے آخری اسلام کو پھر پا لیا۔ فاروق اعظمؓ اور خالدبن ولیدؓ کے اس دین کو پھر سمجھ لیا ہے جو ۱۲ برس میں چھتیس ہزار شہر اور قلعے فتح کیا کرتا تھا۔ جس میں پنج وقتہ نمازیں اور تیس روزے بھی تھے، تراشیدہ لب مونچھیں اور خوبصورت لمبی ڈاڑھیاں بھی تھیں۔ قیصر و کسریٰ کے مناروں پر اذانیں اور میدانوں میں اللہ اکبر بھی تھے! لیکن اس دین کا ماحصل دنیا میں غالب اور بادشاہ بن کر رہنا تھا۔ خدا کے بن کر خدا کی بنائی زمین کو سنبھالنا تھا۔ مومن بن کر اعلون بننا تھا! غلامی اور عاجزی نہ تھی، ذلت اور شکست نہ تھی! آپس میں ایک دوسرے کو کاٹ کھانا نہ تھا۔ لفظوں اور عقیدوں کی فرقہ بندیاں نہ تھیں۔ علیحدہ علیحدہ بتوں کی پرستش نہ تھی۔ فرقہ بندی کا شرک نہ تھا۔ صرف ایک خدا کی غلامی تھی۔ خاکسار تحریک اس اصلی دین کی طرف ایک راہِ راست اور واحد صراطِ مستقیم ہے"۔

در اصل جس زبان میں خاکسار تحریک کا خمیر اٹھایا جا رہا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے عامتہ الناس میں بھوک اور بیکاری کے خلاف زبردست نفرت اور غیض و غضب کے سوتے پھوٹ رہے تھے اسی غیض و غضب کا اظہار اس زمانے میں جگہ جگہ اور مختلف طریقوں اور شکلوں سے ہو رہا تھا۔ کہیں تو بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی لاجپت رائے پر لاٹھیوں کا انتقام لینے کے لیے ساندرس کو قتل کر رہے تھے۔ کہیں اسمبلی میں بم پھینکا جا رہا تھا۔ کہیں نوجوان بھارت سبھا بن رہی تھی، کہیں اس غیض و غضب کو روکنے کے لیے مکمل آزادی کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ اور پھر گول میز کانفرنس ہو رہی تھی اور پھر نمک سازی کے سلسلے میں ستیہ گرہ کی جا رہی تھی، اور اس کی پاداش میں کانگرس کو خلاف قانون قرار دیا جا رہا تھا۔ اس تمام عمل نے عوام کو سخت بددل اور قدرے مایوس کر رکھا تھا۔ اور مسلمانوں میں یہ مایوسی کہیں زیادہ سرایت کیے ہوئے تھی، وہ سیاست سے بیزار تھے، اور سیاستدانوں سے قدرے متنفر اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے اور لوگوں کے غم و غصہ کو منظم کرنے کے لیے ان کو فوجی تربیت کے لیے کہا گیا اور ان کو اشاروں کنایوں میں تشدد پر مائل کیا گیا۔ ظاہر ہے عام مایوس مسلمان کو یہ طریق کار بہت بھایا۔ اسے نئی امیدیں مسحور کرنے لگیں، کیوں کہ عام آدمی یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگاتا۔ کہ اگر اس کے پاس طاقت ہو۔ وہ فوجی وردی میں ملبوس ہو اور ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوں تو وہ ظالم کو ناک چنے چبوا سکتا ہے۔ اور اس سے صدیوں کے مظالم کا انتقام لے سکتا ہے۔ یہ طریق کار بالکل سیدھا ہے اور اس کی ذہنی سطح کے بالکل قریب ہے اس کو اسمبلی کا انتخاب یا عدم تشدد کا فلسفہ، یا پھر ستیہ گرہ سے جیلوں کو بھرنا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کو چپ راست اور اطاعت امیر کا نعرہ سمجھ آجاتا ہے کیونکہ اس کو صرف اعتقاد کی ضرورت ہوتی ہے پہلے وہ ان دیکھے پیر کی قبر پر منت مانگتا تھا۔ اب وہ ایک "پڑھے لکھے" ولایت پلٹ امیر کی اطاعت کا جوا گردن میں ڈال رہا ہے۔ یہ جوا اس کو زیادہ اپیل کرتا ہے۔ کیوں کہ اس میں وہ اپنے روزمرہ کے دکھوں سے نجات کی نوید مضمر سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کو روئے زمین کا بادشاہ تصور کرتا ہے۔ وہ خاکسار بن کر حکومت کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ اور اس کو ان خوابوں کی صرف اتنی تعبیر معلوم ہے کہ وہ بے کار ہے۔ بے روزگار ہے، غریب ہے، ان تمام آلائشوں سے اسے نجات مل جائے گی۔ چنانچہ جس وقت اس کا امیر خطیبانہ تحریروں کے ذریعے کہتا

"ہم نے صاف اور علی الاعلان حکومت وقت سے کہہ دیا ہے کہ ہم قانون کے اندر رہیں گے تمہاری سیاست میں دخل نہ دیں گے۔ تم نہ چھیڑو گے تو ہم نہ چھیڑیں گے۔ لیکن ہمارا مذہب، ہمارا دین، ہمارا اسلام، ہمارا ایمان سپاہی بننا ہے، دنیا کو زیر نگیں کرنا ہے" بنیان مرصوص" یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط اور جڑے ہوئے رہنا ہے۔ خالدؓ، طارقؒ، عمرؓ، مسلمؒ، نہیں سرورِ کائنات اور ختم رسل محمد رصلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں اور پیروں کے عمل کی پیروی کرنا ہے اگر یہ نہ کریں تو ہم مسلمان نہیں رہ سکتے۔ تم انگریزو قرآن اور حدیث دیکھو، اسلامی تاریخ پڑھو، اسلام کے کارناموں کا مطالعہ کرو۔ تم تو ابھی کل بادشاہ بنے ہو۔ ہم ماں کے پیٹ سے بادشاہ بن کر نکلے تھے! بادشاہت ہمارا مذہب ہے۔ اور تم نے مذہب میں مداخلت نہ کرنے کا عہد کیا ہوا ہے! اس لیے ہم اپنے مذہب پر چل رہے ہیں! اور تمہیں نہیں چھیڑتے۔ آخرت کی بیتا کی خاطر ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے! روز قیامت کا ڈر ہے! تم اگر اس مذہب کو پسند نہیں کرتے تو پہلے قرآن، حدیث تیرہ سو برس کی تاریخ اور مسلمان کے خون کو دنیا سے مٹا دو، ہم خود بخود اپنا مذہب چھوڑ دیں گے۔ مسجد کے ملّانوں اور قل آعوذیوں، مکار پیشواؤں اور خود غرض رہنماؤں کا پیش کیا ہوا اسلام ہم اس لیے نہیں مانتے کہ اسکی سند قرآن، حدیث، روایت اور تاریخ میں کہیں نہیں ملتی وہ مصلحت بینی اور بزدلی کا اسلام ہے۔ خدا کو دھوکہ اور نفس سے مکر کا اسلام ہے! نفس سے مکر ہو سکتا ہے لیکن خدا کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارا مذہب وہ مذہب ہے جو دن میں نو شہر اور قلعے فتح کیا کرتا تھا! جس پر خدا کا آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم تئیس برس تک خود چل کر دکھا گیا۔ جس پر کائنات فطرت گواہ ہے! ہاں وہ مذہب ہے جس کے ایک چھوٹے سے حصے پر چل کر تم انگریزو دنیا جہاں کے بادشاہ بنے بیٹھے ہو! مسجد میں بیٹھے ہوئے غریب مولویوں اور باسی ٹکڑے کھانے والے بیچارے ملّانوں کو کیا خبر کہ اسلام کیا ہے"!

" اس پیغام سے عام ان پڑھ یا نیم پڑھا لکھا خاکسار مستقبل کی بادشاہت کے سپنوں میں کھو جاتا ہے۔ اور چپ راست کا نعرہ زیادہ زور سے گونجنے لگتا ہے۔

خاکسار تحریک اور چندہ

علامہ مشرقی کی ذہانت اور فطانت مسلمہ تھی، لیکن ساتھ ہی وہ اپنی ذہانت اور فطانت کو اپنے پیر دکاروں سے ماورا سمجھتے تھے۔ اور ان کا اسلوب یہی تھا۔ کہ عوام کو جذبات اور ماضی پرستی کی بنیاد پر منظم کر لو، اور اپنی تنظیم کو ان تمام ظاہری خرابیوں سے پاک رکھو، جس سے اگلی تحریکیں یا ان کی ہمعصر تحریکیں بدنام ہو رہی ہیں۔ ان خرابیوں میں ان کے نزدیک سر فہرست جو خرابی تھی، وہ "چندہ کھانا" تھا۔

مسلمانوں کی سیاست میں عوام سے چندہ لینا ایک عام سیاسی فعل رہا ہے۔ اور اسی طرح مخالف پر چندہ خرد برد کرنے کا الزام لگانا بھی، معمول کے مطابق سیاسی فعل رہا ہے۔ مسلم لیگ کو قائد اعظم محمد علی جناح نے ۱۹۳۵ء کے بعد جب از سر نو منظم کیا تو یہ واحد جماعت اور واحد قائد تھا۔ جس پر چندہ خوری کا الزام نہیں آتا۔ اس کی مخصوص وجوہ ہیں، مسلمانوں میں سیاست کا زور زیادہ تر مذہب کے واسطے سے آیا۔ اور مذہبی اداروں اور ان کے سربراہوں نے سیاست کی وادی میں قدم رکھا تو ان کے اسلوب وہی تھے۔ جو ان کے طور طریقے مذہبی اداروں یا خانقاہوں کو چلانے کے تھے۔ خانقاہیں، مدرسے اور مساجد اور ان سے ملحق ادارے سبھی کے سبھی عام لوگوں اور صاحب دولت لوگوں کی خیرات اور نگاہ کرم سے چلتے تھے۔ یہ پیر اور مولوی جب رشد و ہدایت کا پیغام لے کر قریہ قریہ گھومتے تھے تو بھی ان کے رہنے سہنے ان کے خور د طعام کا سبھی انتظام گاؤں والے ہی کرتے تھے؛ یا گاؤں کا مکھیا کرتا تھا۔ یا زمیندار کی حویلی میں ان کے لیے دستر خوان بچھتا تھا۔ اس لیے جب یہ لوگ یا ان اداروں سے نکلے ہوئے لوگ سیاست کی وادیٔ خار زار میں آئے تو ان کو سیاست کے لیے روپے پیسے جمع کرنے کا بھی یہی ذریعہ نظر آیا چنانچہ اسی پر عملدرآمد ہوتا رہا۔ اور تو اور اگر علی گڑھ یونیورسٹی بنانی پڑی یا انجمن حمایت اسلام اور انجمن اسلامیہ کو مختلف مقامات پر مدارس و کالج کھولنے پڑے تو ان کو بھی چندہ ہی مانگنا پڑا۔

اس کے مقابلے میں ہندوؤں کے ہاں روایت قدرے مختلف رہی ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کے ہاں باقاعدہ صنعت کار طبقہ انیسوی صدی میں ہی ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ اور ان کے ہاں سیاست کی داغ بیل جو پڑی تو انہی شہروں میں پڑی جہاں ان ہندوؤں نے کارخانے لگائے تھے۔ اور

سیاست کے میدان میں زیادہ تر یہ صنعت کار یا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو ہی پیش پیش رہا۔ اب صنعت اور تجارت سے منسلک لوگوں کا ایک خاصہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بہی کھاتہ ہوتا ہے۔ حساب کتاب رکھا جاتا ہے۔ ہر آدمی کی محنت کا معاوضہ ایک اصول کی بات سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سیاست کے لیے جو بھی رقم اکٹھی کی اس کو بہی کھاتوں میں چڑھایا اور یا پھر کسی صنعتکار کو رقم دے دی۔ اس نے اپنے کاروبار میں لگا دی اور جماعت کو باقاعدگی سے ضرورت کے مطابق رقم فراہم کرتا رہا۔ اور ساتھ ہی ان جماعتوں کے کارکنوں کو ہمیشہ سیاست میں وقت اور جان کھپانے کے لیے معاوضہ ملتا رہا باقاعدگی سے انہوں نے اس قسم کی جماعتیں بنائیں جو سیاسی کارکنوں کی دیکھ بھال کریں۔ جب وہ جیل میں جائیں تو ان کے خاندانوں کی نگہداشت ہو۔ اس لیے ان کے ہاں چندہ لینے اور چندہ خوری ایک سیاسی عمل کے طور پر کبھی نمایاں نہیں رہا۔ ہندوستان کی سیاست میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی جو فرق تھا۔ وہ تو تھا ہی لیکن اصل طبقاتی فرق اور تضاد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کی پسماندگی کی وجہ ان کا زمینداری نظام سے تعلق تھا۔ اور ان کے تمام ادارے تمام سوچ، تمام طور طریقے اسی زمینداری کی نہج پر تھے۔ زمینداروں میں کب بہی کھاتے کا رواج ہوا ہے، جواب ہوتا۔ زمیندار کے منشی کی ٹوٹ بک میں جو چڑھ گیا سو چڑھ گیا۔ زمیندار تو فقط پیسے کو خرچ کرنا جانتا تھا۔ اس کو نہ تو اس کی پوری آمد کا پتہ ہوتا نہ اس کو خرچہ کا اندازہ ہوتا چنانچہ یہی اسلوب ہماری جماعتوں کا رہا۔ چندہ آیا تو اس سے جماعتیں بھی چلیں اور تحریکیں بھی پروان چڑھیں تحریکوں سے وابستہ لوگ بھی پرورش پاتے رہے جیسے ہی تحریکیں ماند پڑیں چندہ کی ریل پیل بھی کم ہو گئی۔ اور اس کا اثر تحریک پر بھی پڑا جماعت بھی اس کمی کی زد میں آئی اور جماعت کے کرتا دھرتا بھی اس سے متاثر ہوئے۔ ہم نے کبھی اس چکر کو، اس زنجیر کو توڑنے کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا۔ ہم نے یہ بھی کبھی نہیں سوچا کہ جو سیاسی کارکن دن رات سیاست کے چکر میں رہتا ہے وہ کھاتا کہاں سے ہے۔

اس نہج پر نہ سوچنے کی بھی وجہ وہی زمینداری دور کی مخصوص آلائشیں ہیں۔ اس دور میں مولوی اور پیر اپنی ضرورتیں تو گاؤں والوں سے یا زمیندار سے پوری کر لیتا رہا ہے لیکن اعلان اور تبلیغ وہ استغنیٰ کی کرتا ہے چنانچہ جس طرح اس کی ضرورتوں اور اخراجات کا کوئی اندراج نہیں ہوتا۔

وہ اس کو اللہ کی بے نیازیوں پر محمول کرتا رہا ہے۔ اس کا پر تو خلافت، جمعیۃ العلماء اور احرار کی تحریکوں میں بھی پوری طرح نمایاں رہا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ مولانا محمد علی اور شوکت علی جیسے جید رہنماؤں کو بھی چندہ خوری کے الزام میں ملوث ہونا پڑا۔ چنانچہ اس زمانے کے واقعات کے بارے میں مشہور احرار رہنما چودھری افضل حق "تاریخ احرار" میں بلیغ اشارات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عبرت نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا واحسرتا یہ ہوا مسلمانوں کا انجام! پھر اس نے نظریں نیچی کر لیں اور کہا کیا کلمہ گویوں میں کوئی رجل رشید نہیں رہا۔ جو بربادئی اسلام پر آنسو ہی بہائے اور خدا سے پریم کھیلنے کے لیے جان کا جوا لگا دے اور مسلمانوں کی بگڑی بنانے کے لیے ہندوستان میں اٹھے اور اندوہ گیر ملت اسلامیہ کا سرا اونچا کرے؟ بہتوں نے دل کے کانوں سے اس آواز کو سنا، تھوڑے حوصلے کر کے گھروں سے نکلے، امراء بدستور داد عیش دیتے رہے، صوفیاء روحانیت کے گوشوں میں ڈرے سہمے بیٹھے رہے، درمیانے طبقے کے کچھ اور نچلے طبقے کے زیادہ تعداد پر مشتمل لوگوں نے ۔۔۔ خلافت کمیٹی ۔۔۔ کی بنیاد رکھی اور چاہا کہ روٹھی ہوئی قسمت کو زاری اور زور سے منائیں۔ راستے کی مشکل اور منزل کی دوری نے سب کو دل گرفتہ کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کی بہت سی تحریکیں نامرادی کی نیند سو چکی تھیں۔ اب بھی انگریزی سطوت کی علم بردار ہندوستانی پولیس ہر طرف مستعد نظر آتی تھی۔ جس فوج نے ہزاروں میل دور جا کر اسلامی ممالک کو تاراج کیا تھا انہیں یہاں کلمہ گویوں کا سر قلم کرنے میں دریغ کیا تھا۔ عوام کے ہاتھ میں محض کلرکی کا قلم رہ گیا تھا۔ جہاد کے ابتدائی سامان سے محروم قوم خم ٹھوک کر میدان میں کیا نکلتی؟ احتیاج نے شیروں کو روباہ مزاج بنا دیا اور احتیاط کا تقاضہ یہ ہوا کہ ممیا کر بھیڑیئے سے رحم کی درخواست کی جائے۔ روح جہاد کو ترک کر کے زیادہ سے زیادہ مسکین بننے کا مسلک اختیار کیا جائے جو مخالف کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ... اور مار" کہہ کر مارنے والے کو زچ کرتا ہے اور دیکھنے سننے والے کے رحم کو مدد کے لیے آمادہ ... ہے۔ مہاتما گاندھی اس اصول سیاست کا ماہر مانا جاتا تھا۔ اس بنیے کو یہ بزرگی سونپ دی گئی کہ پہلے تم ہی اپنے مزاج کے مطابق مار کھا کر دوسرے کو مہربان کرنے کے دعوے کی دلیل پیدا کرو۔ گاندھی فطری طور پر آندھی ہے۔ شوکت علی اور محمد علی کا مسلمانوں میں اسے سہارا ملا۔ تو اس نے ملک میں طوفان کھڑا کر دیا۔ طول و عرض ملک میں انگریزوں کے لیے فتنے بیدار ہو گئے۔ ایک دفعہ ایسا

معلوم ہوا کہ تختِ سلطنت ہل گیا ہے۔ مردہ دل ہندوستانیوں میں آثارِ زندگی پیدا ہو گئے گویا خزاں دیدہ ہندوستان میں بہار آ گئی۔ ناگاہ چورا چوری کے واقعہ ہائلہ نے گاندھی جی کے مزاج میں اعتدال پیدا کر دیا۔ سول نافرمانی کے سرپٹ گھوڑے کو یکدم روک دیا گیا۔ سب سیاسی کارکن محسوس کرنے لگے کہ وہ اونچی جگہ سے پتھریلی زمین پر گرے ہیں۔ اور انہیں دن کو چوٹ سے تارے نظر آنے لگے۔ قوموں کا بگڑ کر بننا اور تحریکوں کا رُک کر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ میدان جنگ میں ایک چال چوک جانے سے بھاگڑ مچ جاتی ہے کانگرس اور خلافت کی صفوں میں انتشار سا پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کے بے عمل اعلیٰ طبقہ کو یہ موقعہ خدا دے۔ انہوں نے کہا بنیئے بقّال کو قوم کا سردار بنانے والے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے گویا وہ خود تلوار ٹیک کر جہادِ زندگی کو نکلے ہیں۔ اور جو کام گاندھی، شوکت علی، محمد علی انجام نہ دے سکے، یہ آرام طلب اُمرا، آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا لیں گے جب تک خلافت کی تحریک زور پر تھی بلوری گلاسوں میں گھونٹ گھونٹ شربت پینے والے ناز پروردہ اُونچے گھرانے والوں نے دم نہ مارا۔ اب ترک سول نافرمانی کے بعد یہ کھُل کھیلے کہا کہ خلافت لفنگوں کی جماعت ہے۔ یہ پبلک چندوں پر پرورش پانے والے لوگ قوم کی خدمت کیا کریں گے؟ —— —— ناتربیت یافتہ عوام تو اُمرا کے ہاتھوں میں موم کی ناک ہوتے ہیں۔ گلی بازار میں کانا پھوسی شروع ہوئی کہ اتنا چندہ کہاں گیا؟ ان سرگوشیوں کو اور زبان لگی پھر حساب فہمی کی عام صدا میں تبدیل ہو گئی۔ حکومت کو اس آواز میں زور پیدا کرنا مطلوب تھا۔ اس کی کونسی ترکیب اٹھا رکھی گئی۔ شہر شہر میں پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کی —— نیم سرکاری جماعتیں کھولی گئی تھیں۔ انہوں نے ادھر ہوا دی۔ حکومت کانگرس سے زیادہ خلافت سے خائف تھی، کہ مسلمان کا ذہن ہندو سے زیادہ انقلابی ہے۔ مسلمان کام کرتے وقت انجام نہیں سوچتے اور بات بگڑ جانے کے بعد زیادہ افسوس نہیں کرتے اسی لیے مسلمانوں کی تحریکیں اکثر اندھے کا لٹھ ہوتی ہیں، جس کا وار عموماً خالی جاتا ہے۔

رپورٹ حسابات

سرکار کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مجلس خلافت نے تقاضوں سے متاثر ہو کر پنجابی کہ؟ کسوں کی کمیٹی بنا دی جس کا کام مرکزی خلافت کمیٹی کا حساب پڑتال کرنا تھا۔ بدقسمتی سے اس کمیٹی نے

قلم کو حد اعتدال سے بڑھنے کی اجازت دے دی، واقعات کو ناول بنا کر پیش کر دیا۔ بہت معمولی واقعات کو ضرورت سے زیادہ اچھالا۔ قلم کی رنگین جنبش حکومت کے خوب کام آئی۔ اس رپورٹ کی ایک نقل مجلس میں پیش ہونے سے پہلے اڑا لی گئی اور طول دعرض ہند میں روپے کو پانی کی طرح بہا کر اس کو پہنچایا گیا۔ مولانا محمدّ علی و شوکت علی ابھی جیل سے نہ آئے تھے۔ کہ ان کے دفتر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دوست، دشمن کے ہاتھ میں مبالغہ آمیز صورت میں پہنچی۔ مولانا محمدّ علی شوکت علی کے مخلص ساتھیوں اور ماحول کو اس رپورٹ سے بے حد صدمہ ہوا۔ یہ رپورٹ آئندہ غلط فہمیوں کا باعث ہوئی۔ ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک اسلامی ہند کی رائے عامہ کی باگ ڈور تین حریف شخصیتوں کے ہاتھ میں رہی۔" محمدّ علی جناح، مولانا محمدّ علی، اور مولانا آزاد۔ ۱۹۱۸ء میں یک بیک انقلابی سا دور آ گیا۔ آئین پسند جناح آئین شکنی کی راہوں پر چلنے سے معذور تھا۔ اس لیے یہ عارضی طور پر گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔ اب سیاسی میدان جس یا سی حریفوں کے ہاتھ میں تھا۔ مولانا آزاد کو علماء کی تائید حاصل تھی۔ مولانا محمد علی انگریزی خوانوں کے محبوب رہنما تھے۔ محمد علی کے ساتھ شوکت علی نے مل کر گاندھی جی کو اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ اور سیاسیاتِ ہند میں ایک بھونچال سا پیدا کر دیا۔ مولانا آزاد علم کے سرمایہ دار اور شاہانہ مزاج تھے، عوام سے بے نیاز رہنما ان کی فطرت ثانی۔ وہ بھی اپنے پرجوش حریف محمد علی کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور سیاسیات میں انہیں پچھلی نشست ہی پر بیٹھنے والوں کی حیثیت اختیار کرنا پڑی۔ اس رپورٹ میں علی برادران کے خلافتی نظم و نسق پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی۔ درحقیقت یہ رپورٹ غیر محسوس طریق پر اسی حریفانہ چشمک کا نتیجہ تھی، جو ان دو رہنماؤں یعنی آزاد اور جوہر کے درمیان چلی آتی تھی۔ مولانا محمد علی کی پارٹی نے یہ سمجھا کہ یہ رپورٹ مولانا آزاد کے دست راست مولانا عبدالقادر صاحب قصوری کی توجہات کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ یہ بزرگ اس زمانے میں پنجاب خلافت کمیٹی کے صدر محترم تھے، لیڈر کو آبرو بنانے میں مدت لگتی ہے۔ مگر کوڑی کوڑی جمع کی ہوئی دولت چٹکی بجاتے میں اڑائی جا سکتی ہے۔ ایک جھوٹا مگر دل لگتا الزام برسوں کی تکلیف سے حاصل کی ہوئی شہرت کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ اس رپورٹ سے علی برادران پر بھی ناکردہ گناہ یونہی الزام سا لگ گیا۔ اب جوہر اور آزاد برابر کے تول ہو گئے۔

سیٹھ چھوٹانی اور مجلس خلافت

مصیبت جب آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی۔ قسمت کے زینے سے پاؤں پھسلے تو اکثر کئی پیڑیاں انسان یونہی پھسلتا چلا آتا ہے۔ اس رپورٹ کا منحوس سایہ ابھی اٹھا نہ تھا کہ سیٹھ چھوٹانی کے واقعے نے خلافت کمیٹی کی بساط الٹ دی۔ سیٹھ موصوف خلافت کی تحریک سے پہلے لکڑی کی تجارت کے بادشاہ کہلاتے تھے۔ سرکاری دربار میں رسوخ تھا۔ انہوں نے کمال ایثار سے کام لے کر مجلس خلافت کی بطور صدر کے باگ ڈور سنبھالی ہوئی تھی، اب سونتن سہیلی کیا؛ حکومت نے اسے مخالف قرار دے کر تمام ٹھیکے منسوخ کر کے اس کی مالی ساکھ بگاڑ دی۔ خلافت کا سارا سرمایہ سیٹھ مرحوم کی فرم کے حساب میں جمع تھا۔ تجارتی نقصان اس روپے سے پورا ہوتا رہا۔ یہ خبر پر لگا کر ہر طرف پہنچی کہ قومی سرمایہ شخصی نقصان پورا کرنے کے کام آرہا ہے۔ آخر "سیٹھ چھوٹانی سا ملز" مجلس خلافت کے سپرد ہوئی اور سیٹھ صاحب سب دنیاوی دولت سے دامن جھاڑ کر شہرت کی دنیا سے الگ ہو گئے۔ مجلس کو اس کی بدولت اور اس کو مجلس کی بدولت کئی لاکھ کا نقصان اٹھانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس خلافت اور بدقسمت سیٹھ چھوٹانی ایک دوسرے کو لے ڈوبے، ساتھ ہی علی برادران کے اقبال کا آفتاب غروب ہو گیا۔ خلافت کے نقصان مایہ کے علاوہ شماتت ہمسایہ علی برادران کے حصے میں آئی۔ سیاسیات میں رحم کون جانتا ہے؛ سیٹھ چھوٹانی دراصل خلافت کے باعث برباد ہوا، مگر خائن کہلا کر نکلا۔ اب چھپے ہوئے سرمایہ داروں نے کمین گاہوں سے سر نکالا۔ رائی کا پہاڑ بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے اب تو وجہ معقول اور نقصان گراں عالم آشکار تھا۔ جو جو انہوں نے کہا عوام نے سچ مانا۔ مجلس خلافت جمہور میں واقعی چوروں کی جماعت مانی جانے لگی۔" (تاریخ احرار صفحہ ۶۵-۶۹)

چنانچہ خود مجلس احرار بھی اپنے جوبن کے زمانے میں جب شہید گنج کا ملبہ اس پر پڑا تو چندہ خوری کے الزام ہی کی دودھاری تلوار تھی جس نے مجلس احرار کو بری طرح مجروح کیا اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی بے باکی کے باوجود ہاں چندہ کھاتے ہیں: تمہارا ہی کام کرتے ہیں؛ تمہارا ہی چندہ کھاتے ہیں: تحریک ڈانواں ڈول ہو گئی۔

اس تمام صورت حال سے علامہ مشرقی پوری طرح واقف تھے اور انہوں نے مسلمان جماعتوں کی اس کمزوری اور خرابی کو بہت طریقے سے استعمال کیا۔ چنانچہ موجودہ رہنما اور ذاتی اغراض کے عنوان

سے قول فیصل کے صفحہ ۴۶ تا ۴۸ تک تفصیل سے لکھتے ہیں:۔

ہاں خاکسار تحریک میں چندہ نہیں اور کوئی کسی سے کچھ کھا پی نہیں سکتا! یہ دونوں باتیں ہمارے دشمنوں کی شاہ رگ پر تلوار ہیں! وہ ان کو سن کر ہوش میں نہیں رہتے اور آنکھیں سرخ کر لیتے ہیں۔ ایک پُر غرور مسخرے نے جو اپنے آپ کو مسلمانوں کا رہنما تصور کرتا ہے اور حاشیہ نشینوں کو سامنے بٹھا کر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتا ہے کچھ مدت ہوئی مجھے بلا کر نہایت متانت سے کہا "فرمایئے! آدم علیہ السلام کے ہبوط کے سوا دنیا کا کون سا کام بغیر چندے کے ہوا؟ کیا رسول خدا نے (معاذ اللہ) چندہ جمع نہ کیا؟ کیا صحابہ کرامؓ اسی چندے سے کھاتے پیتے نہ رہے؟ آپ اس تحریک میں کیوں چندہ نہیں رکھتے؟ آپ چندہ رکھیں تو ہم سب جنہوں نے آپ کو بلایا ہے۔ خدمت کے لیے حاضر ہیں" میرے پاس حضرت عمرؓ کا درہ نہ تھا ورنہ اس نابکار کو درے لگا کر جہنم واصل کر دیتا اور کم از کم رسولِ خدا اور صحابہ کرامؓ کے الفاظ بولنے نہ دیتا۔ لیکن ان لوگوں کی مخالفت کی یہ ذہنیت ہے! ان کو پھر کہہ دو کہ ہم لوہار کے مشہور کتے کی طرح ریتی سے اپنا ہی خون چاٹنے میں کچھ مزہ نہیں دیکھتے، قوم سے چندہ جمع کر کے قوم کو ادر کر ز درکرنا اور اپنوں پر ڈاکہ مارنا قوم کی رہنمائی نہیں، سفاکی اور جلادی ہے! ہم اگر ڈاکہ بھی ماریں گے تو غیر قوم کی دولت پر، غیر کے ملک و سلطنت پر، غیر کے حسن دلبر پر، غیر کی طاقت اور اُبہت پر، دشمن کے بجٹ اور خزانے پر! قوم سے چندہ لے کر ہوائیں اڑانے اور گھر پھونک تماشہ دیکھنے میں ہم خاکسار کوئی لطف نہیں دیکھتے! ہم قوم کو نیا خون اور نئی رجولیت دینے کے لیے آئے ہیں۔ اس کی مردہ قوتوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس میں ہاتھ پاؤں کی حرکت، فکر و عمل کا اتحاد، اطاعت کی نفس کش طاقت، نظم و نسق کا تکلیف دہ منظر پھر پیدا کرنے والے ہیں! آرام جان کے خوبصورت بتوں اور زمینی خداؤں کو توڑ کر خدائے ذوالجلال کی مشکل حکومت دلوں پر پھر قائم کرنے کے لیے ظاہر ہوئے ہیں۔ چندہ جمع کرنے اور اپنی روٹیوں کی فکر کرنے کے لیے نہیں ظاہر ہوئے۔ ہم میں سے ہر ایک فارغ البال ہے۔ اپنا کھاتا ہے کسی کا کھاتا نہیں۔ کسی کے سامنے نیچی نظریں نہیں کرتا۔ کیونکہ نفس کش اور خدا پرست ہے۔ تمہاری طرح اسلام کش اور نفس پرست نہیں! تم اگر اس وجہ سے جنگ پر تلے ہو تو جنگ ہے: ہاں پہلی جنگ تم سے کریں گے۔ تمہاری بیخ و بنیاد اکھاڑ کر رہیں گے۔ تم نے قوم کے ساتھ کیا

مخول بنا رکھا ہے۔ روٹیاں چاہتے ہو تو محنت کرو، مزدوری کرو، لکڑیاں اٹھاؤ اور رہنمائی بھی کرو، رہنمائی کو سبیل معاش پرلے درجے کی شیطنت اور بدکاری ہے۔!"

اصلاح نفس

علامہ مشرقی نے اپنے پروگرام کے ابہام کے باوجود، مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے عوام کی مشرقی سرشت کو خوب اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ اور مشرق میں "درویشی" سے محبت کا جو جذبہ موجود ہے اس کو خوب خوب استعمال کیا۔ کیونکہ پروگرام کے فقدان اور لوگوں کے حقیقی اور صحیح مسائل اور ان کے حل کی بنیادوں پر جتنی دیرتنظیم اور تربیت نہ ہو اس وقت تک یہ درویشیانہ اور اخوت بھرے خالی خولی پروگرام بلا کا اثر رکھتے ہیں۔ خود گاندھی جی کی عوامی مقبولیت میں ان کی درویشانہ اور زاہدانہ زندگی کو بہت بڑا دخل رہا ہے۔ چنانچہ مشرقی بھی سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل سے بے نیاز خدمت خلق کو اپنے تمام پروگراموں کی بنیاد بناتے ہیں، اور اس کو وہ "اصلاح نفس" کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ 'اصلاح نفس' کے اپنے اس فلسفہ سے متعلق پہلی کتاب 'اشارات' میں لکھتے ہیں۔

"رہنماؤں اور قوم دونوں کے لیے کھلا رستہ ہے ان کی آپس کی اس الجھن میں جو پیدا ہو چکی ہے اور جو قوم کے لیے زہر ہلاہل سے بدتر ہے دردمند رہنما کے لیے اس کے سوا کوئی سبیل نہیں کہ سب سے پہلے سیاست سے علیحدگی کا بے دھڑک اعلان کرے۔ اپنی ٹولی، انجمن، مجلس یا جس شئے سے وابستہ ہے اس کو علی الاعلان خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے، مسلمانوں کے اندر مختصر الفاظ میں اعلان کرے کہ اس انجمن کا وجود باقی نہیں رہا۔ اعلان کے بعد صرف اس چھوٹے سے محلے میں جہاں وہ رہتا ہے اصلاح نفس کا کام بے خطر شروع کر دے، آپ خدمت کر کے اوروں کو باہمی ہمدردی پر آمادہ کرے۔ فاروق اعظمؓ کی طرح امیرالمومنین اور بادشاہ اسلام ہو کر مشک کندھے پر لادے۔ بوڑھی رانڈ اور اپاہج عورتوں، یتیم بچوں اور بیکس لوگوں کے گھروں

کی خدمت روزانہ کر کے ہر طرف سے سلام سلام کرتا گزر جاتے۔ عاجز بنے۔ زمین پر دھیا دھیا چلے، نظریں نیچی ہوں، کلام شیریں ہو، ہر ایک سے مساوات ہو الغرض خلق ہو، خدمتِ خلق ہو، خالق کا خوف ہو، ایک ہزار برس کے لیکچروں اور جلسوں یا چندوں اور اشتہاروں سے پیدا کی ہوئی قوت اس طرح پر ایک ہزار گھنٹوں میں اس محلہ میں پیدا ہوسکتی ہے اور اپنی گرہ سے ایک پائی خرچ کرنے کے بغیر! اور جس شخص نے سب سے زیادہ اخلاقی جرأت اور مسابقت قوم کی اس بنیاد کو مضبوط کرنے میں دکھلائی وہی بازی لے گیا، وہی اس محلے کا نہیں تمام قوم کا سردار ہے۔ وہی سید ہے، وہی سید القوم ہے امیر المومنین ہے، بادشاہِ اسلام ہے! اگر پچاس شخص بھی اس قطع کے پچاس مختلف جگہوں میں پیدا ہو جائیں اور ان میں قوت کی انتہائی بلندیوں کے پہنچنے تلک صرف اسلام کا درد اور خدا کا ڈر موجود ہے تو آٹھ کروڑ کیا سارے چالیس کروڑ مسلمانوں کا بیڑا پار ہے۔ بیدرد اور سرکش رہنماؤں کی ٹولیاں اس طرزِ عمل سے آنکھ کی جھپک میں ویران ہو جائیں گی۔ ایک شخص ان کرسیوں پر بیٹھنے والوں اور نرے حکم چلانے والے رہنماؤں کا چاہنے والا نہ رہے گا۔ سب جوق در جوق اس مشک اٹھانے والے عاجز امیر کے پیچھے پروانہ کی طرح دوڑیں گے۔ سب اس عاجزوں اور بیکسوں کے دستگیر نوکر کو سردار مانیں گے میں نے خود اس سردار بننے کے عجیب و غریب نسخے کو گیارہ برس ہوئے چند گھنٹوں کے لیے آزمایا اور اس پر یقین ہونے کے باوجود حیران رہ گیا کہ کس قدر تیر بہدف اور زود اثر ہے۔ جون کے مہینے میں ایک ناگہاں خانگی مصیبت کے ضمن میں پشاور سے کراچی کا سفر پیش ہوا۔ اس وقت "تذکرہ" لکھنا تھا۔ اور قرآن اور خدا سامنے تھا۔ طبیعت اس قدر بیقرار تھی، کہ دنیا کی ہر شے بے حقیقت اور اپنا وجود سب سے عاجز نظر آتا تھا۔ بہاولپور اور سندھ کے ریگستانوں میں گرمی وہ کڑاکے کی تھی کہ مسافر کھڑکیوں سے نکل نکل کر پانی کی صدائیں عبث دے رہے تھے، میرے پاس اپنی خادمہ

کی پیش بندی کی وجہ سے پانی کا معقول انتظام تھا۔ نرم گدوں کو حوصلہ سے چھوڑ کر صراحی ہاتھ میں لی اور چھ گھنٹے تک سب کو تقسیم کرتا گیا۔ اس صحبت کا سرور اب تک ہے۔ یہ اس لیے بھی کہ عمل شروع کرنے کی تھوڑی دیر بعد ہی جس سٹیشن پر صراحی لے کر اترتا تھا۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی جن کو میری اس تھوڑی سی خدمت کا علم ہو گیا تھا۔ اترتے ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے یاد عائیں دیتے، نرم گدوں پر بیٹھے ہوئے ہونے کے خیال سے میرے سادہ لباس کو غور سے تکتے، میری بوڑھی خادمہ سے جو ساتھ تھی، سن کر کہ ولایت چھ برس رہ کر ابھی چند برس ہوئے آئے ہیں۔ اور گیارہ سو روپے تنخواہ پاتے ہیں، ششدر رہ جاتے بعض عورتوں نے میرے پاؤں کو ہاتھ بھی لگایا۔ میں نے دل میں شرارت سے کہا کہ میرے لیے پیر بننا کچھ مشکل نہیں۔"

(اشارات صفحہ ۴۹-۵۱)

خود پسندی اور پروگرام کا فقدان

علامہ مشرقی کا اپنی ذات پر اعتقاد اور یہ یقین کہ وہ اور صرف وہ مسلمانوں کی قیادت کے اہل ہیں، ایک طرۂ امتیاز رہا ہے اور ان کی تحریک کو فسطائیت کی راہ پر لگانے کی دوسری وجوہات کے ساتھ ان کی خود پسندی بھی ایک اہم وجہ رہی ہے چنانچہ ان کی اپنی ابتدائی تصنیفات میں ذات پسندی کے بہت واضح اشارے ملتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی تصنیف اشارات، جو خاکسار تحریک کے آغاز سے پہلے کی تحریر ہے میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے اندر اس وقت ایک بڑی اور عظیم الشان قوم پھر بننے کی جو صلاحیتیں موجود ہیں بلکہ اصلاح کا جو موافق ماحول انہیں پچھلے تیس برس کے ناگوار حادثوں اور لگاتار شکستوں کے باعث خود بخود پیدا ہو گیا ہے اس قدر حوصلہ افزا ہے کہ اس سے بہتر صورت میرے نزدیک آج کسی دوسری قوم میں موجود نہیں۔ یہ تشریح پھر کروں گا سردست آپ کو یہ کہنا ہے کہ صحیح رہنما پیدا کرنے کی ذمہ داری بد شکست مسلمانوں پر عائد ہے اور اس صورت میں کہ قوم اپنے موجودہ

رہنماؤں سے مایوس ہے اور اختلاف بڑھ رہا ہے صحیح رہنما پیدا کرنے کی واحد ترکیب یہ ہے کہ قوم کا ہر درد مند شخص بلکہ ہر شخص فرداً فرداً سب سے قطع نظر کر کے اور سب کو چھوڑ کر، اپنے نفس کی اصلاح شروع کر دے۔ یہی سچا اور اصلی نظام ہے اور اس نظام کو دلوں میں پیدا کرنے والی بعینہٖ یہی نفسا نفسی اور قیامت کی حالت ہونی چاہیئے۔ جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں۔ قوم رہنما کو ایک جگہ پر جمع ہو کر اور قرعے ڈال کر انتخاب نہیں کرتی۔ اور اسی کو غالباً آپ نظام کہتے ہیں۔ رہنما جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ خود اسی قوم کا ایک فرد ہو گا۔ قدرت اس کو ہزاروں بلکہ لاکھوں ہستیوں میں سے خود انتخاب کرے گی۔ وہ منتخب ہو کر لاکھوں اور کروڑوں پر حکمران ہو گا اور لاکھوں کروڑوں اس کے اشارے پر چلیں گے۔ پس جب تک عمدگی اور اصلاح، جب تک تکلیف اٹھانے، مطیع بننے اور اشاروں پر چلنے کی قابلیت لاکھوں اور کروڑوں میں موجود نہ ہو۔ قدرت کے لیے ایسے عظیم الشان رہنما کا انتخاب کرنا محال ہے۔ کرسیوں پر بیٹھ کر اور قرعے لیکر منتخب ہونے والا رہنما لامحالہ کمزور بے بس اور یکطرفہ ہو گا۔ اس کو قوم کا وہی حصّہ منتخب کرے گا جو کرسیوں پر بیٹھنے کے لائق ہے۔ اس کی قوت اپنی کرسیوں تک محدود ہو گی۔ جو اس کے گرد جمع ہوں گی۔ اس کا انتخاب بھی وہی لوگ کریں گے۔ جو رہنما کے انتظار میں اپنی اصلاح کے خیال سے کوسوں دُور ہوں گے وہ آپ اپنی اصلاح سے اسی قدر بلکہ شاید زیادہ دُور ہو گا۔ جس قدر کہ وہ لوگ جنہوں نے اس کی دنیاوی حیثیت یا وجاہت کو دیکھ کر اس کو سردار بنایا ہے۔ وہ قوم کی زمین اور قوم کی پرورش سے پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ قوم اس کو اپنا کہہ سکتی ہے اور اگر ایسے دس رہنما دس مختلف جگہوں پر ظاہر ہوں تو ان کا آپس میں لڑمر کر قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا لازمی امر ہے ایسے رہنما کی مثال ایک خوبصورت پھولدار پودے کی ہے جو سجاوٹ کے لیے زمین سے الگ گملے میں لگا ہے۔ زیبائش اور آرائش کا کام بے گمان اس سے نکل سکتا ہے۔ مگر سایہ دار پھل والے اور سر بفلک درخت کی بات اس میں ہرگز نہیں۔ مسلمانوں کی قوم میں بڑی سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ ہر شخص یا کسر نفسی سے یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس کا مصلح اور رہنما بننا محال ہے اور اس لیے اپنی تمام اصلاح کسی آنے والے خیالی رہنما کے سپرد کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے یا اپنے نفس کے اندر بڑی سے بڑی اصلاح کرنے کے بغیر فرض کر لیتا ہے کہ میں ہی وہ رہنما ہوں۔

جس کا انتظار ہے۔ اور بالآخر جب قوم اس کو رَد کر دیتی ہے، اور مزا پوری ہوتی نظر نہیں آتی تو جھلا کر کوستا ہے، یا اوروں سے اُلجھ کر قوم کو ٹکرا دیتا ہے۔ بے عملی اور عمل کی یہ دونوں صورتیں قطعاً غلط ہیں، اور مسلمانوں جیسی سیاست دان اور عالمگیر قوم کے شایانِ شان ہرگز نہیں۔ رہنما بننا اور کروڑوں پر حکمران ہونا کسی شخص کے اپنے بس کی بات نہیں اور جس نے اپنے نفس کی اصلاح کی تیاری کر لی، وہ کچھ بھی ہو اور آگے چل کر رہنما نہ بھی بنے مگر قوم کی بہتری بلکہ بادشاہت کی بنیاد اس نے ضرور رکھ دی، نہیں بلکہ تاریخ اس امر کی گواہ ہے، کہ دنیا کے بڑے بڑے قومی لیڈر اکثر وہی ہوئے جن کے رہنما بننے کا کسی کو سان گمان تک نہ تھا۔ وہ بجلی کی طرح سیاہی سے نکلے، اور بادل کی طرح سب پر گھر گئے۔ (اشارات ص ۴۱ - ۴۳)

یہاں قیادت کے لئے پروگرام اور مسائل کا جاننا، اور زندگی کی حقیقتوں میں آئے دن کی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کی پشت پر کام کرنے والے اصولوں اور محرکات کا کہیں تذکرہ نہیں ملے گا۔ یہ بھی کہیں پتہ نہیں چلے گا کہ اس برصغیر کے معاشی اور سیاسی مسائل کیا ہیں۔ یہ کہنا تو دُور کی بات ہے کہ ان کو حل کیسے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ خود خاکسار تحریک کے چوبیس اصول جو خود علامہ مشرقی نے وضع کئے وُہ یوں ہیں :-

۱ کسی مسلمان کے خلاف نہ ہو۔

۲ سب ہمسایہ طاقتوں سے رواداری رکھے۔

۳ مجاہدانہ اور سپاہیانہ قابلیتیں پیدا کرے۔

۴ اپنے مقرر کردہ سالار کے حکم کو خواہ وُہ کتنا ہی تکلیف دہ ہو، بلا حیل و حجت مانے۔

۵ اللہ اور اسلام کی راہ میں ہر وقت اپنا مال و جان حتیٰ کہ فرزند و زن قربان کرنے کی طاقت پیدا کرے۔

۶ پابندیٔ وقت کرے۔

۷ خدا کے سوا کسی طاقت سے خوف نہ کھائے۔

۸ رُوئے زمین کی بادشاہت اور اسلام کا اجتماعی غلبہ پیش نظر ہو۔

۹ رُوحانی جذبات کو پیدا کرے، شیطانی اور نفسانی جذبات کو کچل دے۔

۱۰ خدمتِ خلق کرے اور اس کی اُجرت نہ لے۔

۱۱ نماز قائم کرے، اور باقی ارکان اسلام پر مضبوطی سے جمے۔

۱۲ قطار میں کھڑے ہو کر مسلمان کی اونچ نیچ کو برابر کرے۔

۱۳ فوج کی طرح مارچ اور سپاہیانہ قواعد کرے۔

۱۴ تمام غفلتوں اور سستیوں کو دور کرے۔

۱۵ نبیؐ کی سُنّت سمجھ کر بیلچہ کا اوزار اپنے پاس رکھے۔

۱۶ خاکی وردی بنائے، اور اس پر اخوت اسلامی بھائی چارہ کا سُرخ نشان لگائے

۱۷ آپس میں جب ملے فوجی سلام کرے۔

۱۸ حیّ الوسع خاکسار سے سَودا لے۔

۱۹ مسلمان سے مذہبی عقیدوں کے متعلق بحث نہ کرے۔

۲۰ مسلمان سے سیاسی عقیدوں کے متعلق بحث نہ کرے۔

۲۱ ہر مسلمان کو ایک لڑی میں پروئے جانے کی ہر موقعہ پر تبلیغ کرتا رہے۔

۲۲ خاموشی اختیار کرے۔

۲۳ سُننے اور کرنے والا بنے۔ کہنے اور نہ کرنے والا نہ بنے۔

۲۴ ہر مسلمان کو خاکساروں کے مرکزی اجتماع میں عملی طور پر شامل ہونے کے لئے تیار کرتا جائے۔

یونانی دیومالا میں ایک پہلوان کا ذکر آتا ہے۔ یہ ایسا پہلوان تھا جو ناقابلِ تسخیر تصور ہوتا تھا۔ اور ایک عالم میں اس کا شہرہ تھا۔ اس کی قوت کے متعلق لاانداز کہانیاں زبان زدِ عام تھیں۔ لیکن ہر کوئی یہ کہتا تھا کہ جیسے ہی وُہ اکھاڑے میں اترتا ہے، اور مدِ مقابل سے ہاتھ ملاتا ہے، تو گتھم گتھا ہونے سے پہلے وہ اپنی دھرتی کی مٹی کو چھو لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ناقابلِ تسخیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک پہلوان اس کے مقابلے میں آیا اور کسی نہ کسی طرح اس کو اس راز

کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس نے اکھاڑے میں آتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کو زمین سے اوپر اٹھالیا اور اس کا دھرتی ماتا سے ناطہ ہی توڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ناقابل تسخیر پہلوان چاروں شانے چت ہوگیا۔ دیومالا کی اس کہانی کو ستالین نے اپنی حکمران جماعت کمیونسٹ پارٹی کے سلسلے میں تمثیلاً استعمال کیا ہے اور کہا ہے، کہ اس وقت تک کمیونسٹ پارٹی زندہ ہی نہیں بلکہ ناقابل تسخیر رہے گی جب تک اس کا تعلق عوام سے رہیگا۔ جیسے ہی اس کا ناطہ اپنے عوام سے جو اس کی ماں ہے کٹ جائے گا، وہ شکست کھا جائے گی۔

عوام سے گہرا رابطہ کسی بھی جماعت کی زندگی کے لئے ضروری ہے لیکن یہ صرف سطحی سچائی ہے عوام سے گہرا رابطہ اصل میں اسی وقت رہ سکتا ہے جب سیاسی جماعتیں ان کے مسائل کو سمجھیں، اور ان کے حل کے لئے جد وجہد کریں۔ اور ایک وقت میں اگر کوئی سیاسی جماعت عوام کے بنیادی مسئلے کو سمجھ لیتی ہے اور اس کو لے کر آگے بڑھتی ہے تو وہ اپنی بعض دوسری کمزوریوں کے باوجود عوام کی امیدوں کا مظہر بن جاتی ہے۔ سن ۱۹۴۰ء کے قریب کے زمانہ میں کچھ یہی حال مسلم لیگ کا ہوا، اور خاکسار اپنی پوری، درویشی، خدمتِ خلق، عسکریت اور چندہ نہ لینے کے باوجود، شکست کھا گئے اور غیر مقبول ہو گئے۔ کیوں؟ ..... بنیادی وجہ اس دور کے اہم مسئلہ کو نہ سمجھنا تھا۔ اس دور کا اہم مسئلہ اس برصغیر کی آزادی اور اس آزادی میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ اور مخصوص حصہ تھا۔ یہ ایک ابھرتی ہوئی حقیقت تھی۔ اس حقیقت کے حصول کے لئے جو طاقتیں میدانِ سیاست میں آگے بڑھیں، وہ کوئی انقلابی طاقتیں نہ تھیں بلکہ وہ مسلم معاشرے کے اوپر کے طبقات سے متعلق تھیں۔ وہ عوام میں گھلتی ملتی بھی نہ تھیں۔ ان طاقتوں کے سربراہ نماز روزہ کے پابند بھی نہ تھے۔ داڑھی بھی نہ رکھتے تھے۔ شریعت کے پابند بھی نہ تھے لیکن اس کے باوجود ایک طرف خاکسار اپنی تمام خدمت کے باوجود، دوسری طرف احرار جمعیتہ علماء کے لوگ اپنی خطابت اور تقدس اور زہد کے باوجود ان کے ہاتھوں

پٹ گئے۔ اس لئے کہ وہ مسلم معاشرے کی بنیادی خواہش کو سمجھ نہ پائے۔ اگر یہ طاقتیں بنیادی خواہش کو سمجھ پاتیں اور ایک وسیع متحدہ محاذ بن جاتا، تو شاید اس محاذ میں سے نئی طاقتیں جنم لیتیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خاکسار ۱۹۴۰ء کے بعد سے غیر مقبول ہونے شروع ہو گئے۔ لیکن مشرقی صاحب کا فلسفہ اور طریق کار ان کو کسی صورت بدلتی ہوئی حقیقتوں سے دوچار ہونے میں ممد نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کی کتنی بھی توجیہیں کی جائیں ایک حقیقت ہے کہ وہ مسلم لیگ کی مقبولیت سے جیسے جیسے دل برداشتہ ہوتے گئے ویسے ویسے ان میں ایک گونہ غصہ و جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی گئی اور وہ ان کو بالآخر تشدد اور قتل کی طرف بھی لے گئی

صفدر سلیمی جو خاکسار تحریک کے ایک حامی ہونے کی حیثیت سے اس کے شارح ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"صد حیف کہ سرفروشان اسلام کا یہ قافلہ اپنوں ہی کے ہاتھوں لٹ کے رہ گیا۔ اور جب خاکسار اعظمؒ رہا ہو کر مرکز میں پہنچے، تو وہ اپنوں کی ان کرم نوازیوں سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صوفوں اور آرام کرسیوں پر بیٹھ کر قوم کی قسمتوں کے فیصلے کرنے والے عالم اسلام کی اس ابھرتی ہوئی عسکری قوت کو کس طرح اپنے لئے سنگ راہ سمجھے ہوئے تھے اور اس عظیم قوت کے زیر و زبر ہو جانے سے ان کی قیادت کی راہیں کس قدر ہموار ہو گئی ہیں۔ لیکن خاکسار اعظمؒ ان انسانوں میں سے نہیں تھے جو ذاتی اور جماعتی انتقام کی جذباتی روش میں کھو کر قوم کے بلند مفاد تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جو لوگ آج اس قسم کی نکتہ آفرینیوں سے کام لے رہے ہیں کہ خاکسار تحریک نے کیوں نہ غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو تحریک پاکستان کی خاطر مسلم لیگ میں مدغم کر دیا۔ ہم ان سے باادب پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر خاکسار تحریک کا کوئی نمائندہ بعینہٖ مسلم لیگ کے زعماء کو خاک و خون میں تڑپا کر رکھ دیتا، اور خاکسار تحریک اسے کوئی سزا دینے کی بجائے اپنی بغل میں بٹھائے رکھتی، بلکہ خاکسار رہنما اس کے گھر جا کر دعوتیں اڑاتے اور مسرت کے قہقہے بلند کرتے تو اس تحریک

کے ساتھ تمہارا رویہ کس قسم کا ہوتا ؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ تحریک کے خون کے پیاسے بن جاتے اور جب تک اس کے ایک ایک فرد کا وجود ختم نہ کر لیتے آپ کو اس وقت تک چین نصیب نہ ہوتا۔

خاکسار اعظم اپنے اصول و مقاصد کے مطابق جس حد تک اور جس انداز سے تحریک پاکستان کا ساتھ دے سکتے تھے انہوں نے دیا۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے دشمنوں سے نہ کوئی سودا بازی کی اور نہ کسی جوشِ انتقام میں ان کے ہمنوا بننے کے لئے تیار ہوئے۔ (خاکسار اعظم صفحہ ۱۴)

یہ تلخی اگر ایک طرف خاکساروں میں تھی تو دوسری طرف مسلم لیگیوں میں بھی تھی اور چونکہ مسلم لیگ اپنے کو واحد نمائندہ جماعت منوانے کے لئے مصروفِ جدوجہد تھی کیونکہ اس کی لڑائی کا جو اسلوب تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں میں کوئی جماعت موجود نہ رہے اور مسلمانوں کے سیاسی نقشہ پر فقط اسی کا وجود تسلیم ہو۔ اس کے لئے اسے مسلمان جماعتوں کے خلاف سختی سے چومکھی لڑائی لڑنی تھی۔ چنانچہ اس کشمکش اور کھینچا تانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن خاکساروں کے لئے مسلم لیگ ۱۹۴۰ء میں اشک بہاتی ہے اسی نے ۱۴۔ نومبر ۱۹۴۲ء کو خاکساروں کے لئے مسلم لیگ کے دروازے بند کر دیئے۔ کونسل کے اجلاس نے فیصلہ کیا کہ جو شخص خاکسار تحریک کا رکن ہوگا وہ مسلم لیگ کی رکنیت اختیار نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ اس فیصلے پر خود مسلم لیگ کے ایک حلقے نے احتجاج بھی کیا۔ اس فیصلے کے اگلے دن ۱۷۔ نومبر ۱۹۴۲ء کو روزنامہ زمیندار اپنے اداریے میں جس کا عنوان تھا۔

"قصور وار کون ہے"؟ لکھتا ہے:۔

"یہ فیصلہ خلافِ توقع نہیں۔ بعض مسلم لیگیوں نے خاکساروں کے خلاف جو ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہم اس تلخ حقیقت کو چھپا نہیں سکتے کہ مسلم لیگ کا یہ فیصلہ نہ صرف منطقی طور پر غلط ہے، بلکہ مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت کی شان اور مفادِ ملی کے بھی مطابق نہیں۔ اور یہ سب سے زیادہ افسوسناک

بات ہے کہ اس قرار داد کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا . . . . . . خاکساروں کو جب ٹھوکریں مار مار کر مسلم لیگ کے دروازے سے اٹھایا جا رہا ہے۔ تو وہ جائیں گے کہاں ؟ سیاسی ضرورتیں اور مجبوریاں انہیں کس راہ پر ڈالیں گی ؟ یہ تو ظاہر ہے، کہ جب مسلم لیگ اپنی طرف سے خاکساروں کو مایوس کر چکی ہے، اور ان کے خلاف انتقام و قصاص کا جذبہ مشتعل کر رہی ہے تو انہیں بھی مجبوراً وہی راہ اختیار کرنی پڑے گی جس پر مسلم لیگ کے مخالفین گامزن ہیں۔ اگر خدا نخواستہ یہی صورت حال پیدا ہو گئی تو ڈھائی لاکھ خاکساروں اور ان کے ساڑھے سات لاکھ معاونین (یعنی کل دس لاکھ مسلمانوں) کو کانگرس کے جنگلے میں پھینک دینے کی ذمہ داری کس پر عاید ہو گی ؟ کیا اس غلط کاری کے لئے مسلم لیگ ذمہ دار نہیں ہو گی جو خاکساروں پر اپنے دروازے بند کر چکی ہے۔ اور انہیں دھکیل دھکیل کر اسلامی مرکزیت سے کوسوں دور اٹھا رہی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ خاکسار بھی جوابی غلطی سے کام لیں اور جوش اشتعال میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھیں جو اسلامی وحدت اور اصول مرکزیت کے خلاف ہو۔ لیکن مسلم لیگ نے تو انہیں مخالفین کی جھونپڑی میں پناہ لینے پر مجبور کر ہی دیا ہے۔ یہ غلط کاری فوری تلافی کی مستحق ہے۔ مذکورہ حقائق کے پیش نظر خاکساروں کا مقاطعہ ایک خوفناک غلطی ہے جس کی تلافی فوراً ہونی چاہئے۔ ورنہ مسلم لیگ اپنی راہ میں خود ہی کانٹے بونے کی مرتکب ہو گی ۔

میں اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روزِ سیاہ
خود دکھایا ہے مرے گھر کے چراغاں نے مجھے

چنانچہ یہی تلخی تھی، جو ایک خاکسار کو قائداعظم محمد علی جناح پر حملے کے لئے کشاں کشاں لے گئی۔ یہ تلخی جیسے جیسے بڑھتی گئی ویسے ہی خاکسار تحریک زوال کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتی چلی گئی اس لئے کہ اس کے پاس اپنی ساکھ اور اپنی قیادت کو قائم رکھنے کے لئے کوئی ٹھوس پروگرام نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ جیسے جیسے مسلم لیگ مقبول ہوتی گئی خاکسار مایوس ہوتے گئے تا آنکہ مشرقی نے تحریک کے زوال کو روکنے کے لئے ایک آخری کوشش

کی اور اعلان کیا کہ :-

" ۳۰۔ جون ۱۹۴۷ء کو ملک کے تین لاکھ خاکسار جامع مسجد اور لال قلعہ (دہلی) کے سامنے جمع ہو جائیں اور آخری حکم کا انتظار کریں۔ اگر تین لاکھ خاکسار جمع ہو گئے، تو آخری پروگرام دے دیا جائے گا۔ ورنہ اس کھیل کو ختم کر دیا جائے گا۔"

اور بالآخر خود علامہ مشرقی نے یہ تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان میں کہا گیا تھا، کہ :-

" خاکسار تحریک کے ذریعے کئی ایک مختلف طریقوں سے قوم کی انقلابی طاقت کو ابھارنے کی کوششیں کی گئیں لیکن قوم میں صرف یہی خاصیت پائی گئی کہ اگر کچھ بغیر محنت ملتا ہے تو لے لیا جائے۔ ورنہ میدانِ جنگ کا سپاہی بننے کی طاقت نہیں۔ اس حساب سے سترہ برس کے بعد قوم میں سے یہی چند قطرے ہیں جو نچوڑے جا سکتے تھے۔ ان تلوں میں اب مزید تیل باقی نہیں رہا۔ میں نے ساڑھے تین ماہ پہلے اعلان کیا تھا کہ اگر تین لاکھ خاکسار دہلی میں جمع نہ ہوئے تو تحریک میں کوئی انقلابی طاقت نہ ہوگی اور اسے منتشر کر دینا لازم ہوگا۔ ادھر پاکستان ملنے کا جادو مسلمان پر غالب ہے اس لئے کسی مزید انقلابی طاقت کا قوم سے حاصل ہونا ناممکن ہے۔ مسلمان کو اب کسی غلبے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ۴۔ جون کے انگریزی اعلان کے بعد میں نے خاکسار تحریک کے انقلابی منشور کا اعلان اس نیت سے کیا تھا کہ اگر تین لاکھ خاکسار دہلی میں جمع ہو گئے تو آئندہ لائحہ عمل واضح ہو سکے گا۔ یہ نہیں ہوا، اس لئے بصد حسرت تحریک کے منتشر کرنے کا اعلان کرتا ہوں اور اس کی قیادت سے دستبردار ہوتا ہوں۔ آہ سترہ برس کی زہرہ گداز محنت کے باوجود، جو میں نے پوری دیانتداری سے کی۔ اور اس میں اپنی عمر اور دولت کا بہترین حصہ صرف کیا۔ قوم میں وہ خاصیت پیدا نہ ہوئی کہ وہ ہندوستان کے مسلمان کو غالب کر سکے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن "

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چُکا دیا — فیض

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۱۹۵۳ء میں اِس روشنیوں کے شہر لاہور پر پہلا مارشل لا نافذ کیا گیا تھا اور اس کی روشنیاں بُجھ گئی تھیں، یہ تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔ اِس موقع پر مرکزی قانون ساز اسمبلی میں میاں افتخار الدین نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"مجھے ڈر ہے کہ اِس مارشل لا کے ذریعے بے ایمان حکمران طبقے نے اپنے اقتدار کو طوالت دینے کا ایک نیا اور مہلک طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے۔"

- یہ وہی میاں افتخار الدین تھا جس نے "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کی داغ بیل ڈالی تھی۔
- یہ وہی افتخار الدین تھا جس کو جمہوریت پسندی کی سزا میں ان اخبارات سے ہاتھ دھونا پڑا اور جنرل ایوب کے مارشل لا نے ان کو سرکاری تحویل میں لے لیا۔
- یہ وہی افتخار الدین تھا جس نے سب سے پہلے پاکستانی حکمرانوں کو ان کے غیر جمہوری اقدام پر للکارا اور ملک بھر میں عام انتخابات کا مطالبہ کیا تھا۔
- یہ وہی افتخار الدین تھا جس نے مشرقی پاکستان کے لیے آواز اٹھائی اور اس کی خود مختاری کو تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ کنفیڈریشن کے قیام کا مطالبہ کیا۔
- یہ وہی افتخار الدین تھا جو جمہوریت کا حامی بھی تھا اور مارکسسٹ بھی تھا۔

اسی مُجاہد کی داستانِ حیات

عبدُاللہ ملک

رقم کرتے ہیں اور آکسفورڈ میں مارکسی افکار سے متاثر ہونے تک کا تجزیہ کرتے ہیں ـــــ یہ نئی کتاب ہے۔

سوانح

میاں افتخار الدین

عالمی کمیونسٹ تحریک

آفسٹ طباعت

قیمت -/۶۰

پیپر بیک -/۴۵ روپے

فیض اکہتّر برس کے ہوگئے ہیں

ان کی اس سالگرہ پر

عبداللہ ملک — ایک نذرانہ ایک تجزیہ پیش کرتے ہیں

لاؤ تو قتل نامہ مرا

- اس میں فیض کا فلسفۂ زیست — فلسفۂ سیاست اور فلسفۂ ادب خود ان کے اپنے الفاظ میں پہلی بار دیا گیا ہے
- — فیض کی اپنی بیٹی منیزہ ہاشمی کے نام خطوط
- — بعض دوستوں کے نام خطوط

سید سجاد ظہیر — امین مغل — اور — عبداللہ ملک

کے تجزیاتی مضامین —

اور نایاب تصاویر اور نئی غزلیں اور نظمیں

قیمت ۲۵ روپے

کوثر پبلشرز

۱۳۴ ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۱۶

فون — ۸۵۱۴۰۰

عبداللہ ملک

کی اہم کتابیں

داستانِ دار و رسن

صفحات ۳۵۰، سائز $\frac{18\times22}{8}$، مجلد مع گرد پوش

قیمت: ۳۵ روپے

یہ کتاب پاک و ہند اور بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک سے متعلق ہے۔ ایوب شاہی دور میں مارے جانے والے مشہور کمیونسٹ لیڈر حسن ناصر کی شہادت کی پوری تفصیلات۔ کس طرح شاہی قلعہ میں اس کی موت ہوئی اور اس موت کا ہائی کورٹ میں کیسے چرچا ہوا، کتنے مقدمے چلے، کتنی تحقیقاتیں ہوئیں۔ ان سب تفصیلات کو پہلی بار قلم بند کر کے یکجا بھی کیا گیا۔ اس کی پوری سوانح اور اس دور کی کمیونسٹ تحریک کے عروج و زوال کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح سے اس میں کیمبلپور کے میرداد کا تذکرہ ہے جو عین شباب میں ۱۹۴۶ء میں جہازیوں کی بغاوت میں بندوق بدست مارا گیا۔ یہ میرداد جو جیل سے فرار ہوا۔ اس کی پوری کہانی ہے کیسے اُس نے روپوش رہ کر انقلابی تحریکوں میں حصہ لیا۔ کیسے وہ دیس دیس میں روٹی روزگار کے لئے مارا مارا پھرا۔ اور وہ پھر کس طرح بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک میں شریک ہوا۔ یہ سب کہانیاں ان صفحات میں بکھری پڑی ہیں۔

یہی نہیں بلکہ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے بعض عظیم دانشوروں کی روئداد حیات اور ان کی تحریریں اس کتاب میں پہلی بار یکجا ہوئی ہیں۔ ان میں جی گوپرا کی مفصل سوانح اور تحریریں ہیں۔ ان میں پیرس کے گبریل پیری، چیکوسلوویکیہ کے جیولس فیوچک، انگلستان کے رالف فاکس اور چین کے سات شہید ادیبوں کا تذکرہ شامل ہے۔

کوثر پبلشرز

۱۳۴ - ٹیپو بلاک -
نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۱۶ - فون نمبر ۸۵۱۰۴۰

سوشلسٹ ممالک کے سفرنامے

عبداللہ ملک پہلے ادیب ہیں جنھوں نے سوشلسٹ ممالک کے بارے میں اپنے سفرنامے مرتب کر کے پاکستان کے عوام کو یہاں کی زندگی سے روشناس کرایا ہے

سوشلسٹ ممالک کو ایک عالم نے متنازعہ فیہ ممالک بنا رکھا ہے، مغرب اور امریکہ کے ذرائع نے پچھلے سالہا سال سے سوشلسٹ ممالک کے خلاف دن رات زہر اُگلا ہے ان ممالک کی ایک خاص انداز تصویر کشی کی گئی ہے

- یہ ممالک آہنی پردے کے پیچھے زندگی گذار رہے ہیں
- شہری آزادی نہیں، بھوک اور بیکاری عام ہے
- وہاں صنعتوں کو ہی نہیں عورت کو بھی قومیا لیا گیا ہے
- وہاں کوئی خاندانی زندگی نہیں ہے

یہ سب باتیں مغرب نے ہمارے اذہان میں بٹھادی ہیں لیکن عبداللہ ملک پہلے ادیب ہیں جنہوں نے سوشلسٹ ممالک کا سفر کیا ہے اور اپنے سفرنامے پوری تفصیل کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ ان ممالک کی روزمرہ زندگی کی تصویر کشی ہی نہیں کی بلکہ ان کی تاریخ اور جدوجہد پر بھی روشنی ڈالی ہے

عبداللہ ملک نے چیکوسلاویکیہ کا سفر کیا اور **پراگ سے چند خطوط** کے نام سے اپنا سفرنامہ رقم کیا — قیمت ۱۰ روپے تصاویر ۱۴۴

بلغاریہ کا سفر کیا تو **صوفیہ سے چند خطوط** کے نام سے اپنا سفرنامہ رقم کیا — قیمت ۱۰ روپے صفحات ۱۷۶

کوثر پبلشرز ۱۳۴ ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۱۶
فون ۔۔ ۸۵۱۴۰۰

وسطی ایشیا سے ہمارا تعلق بہت قریبی اور گہرا ہے، ہمارا تاریخی اثاثہ مشترکہ ہے۔ سمرقند و بخارا ہمارے تاریخی ورثہ کے اہم سنگِ میل ہیں۔ آج یہ سوشلسٹ روس کا اہم حصہ ہیں۔ اس لئے ہر پاکستانی ان مسلم آبادی والی اشتراکی جمہوریتوں کے متعلق جاننے کے لئے بیتاب رہتے ہیں، ہر ذی روح یہ جاننا چاہتا ہے کہ

ان خطّوں کے بسنے والوں کا کیا حال ہے؟

ازبکستان — تاجکستان — قازکستان — کرغیزیہ — ترکمانیہ کی پانچ مسلم اکثریت والی ریاستوں میں یہ مسلم آبادی اپنے تہذیبی ثقافتی ورثے کو کیسے آگے بڑھا رہے ہیں؟
یہ اپنے تشخص کو کس انداز میں تلاش کر رہے ہیں؟
ان کی دینی روایات کتنی تندرست و توانا ہیں؟

ان سوالوں کا پہلی بار جواب عبداللہ ملک نے اپنی نئی تصنیف

ارضِ سمرقند و بخارا

میں دیا ہے!

عبداللہ ملک نے متعدد بار سوویت یونین اور اس کی مسلم اشتراکی جمہوریتوں کے سفر کئے ہیں وہ وہاں کے لوگوں سے ملے ہیں۔ انھوں نے ان خطّوں کے بسنے والوں کے دل کی دھڑکنیں سُنی ہیں اور ان دھڑکنوں کو انھوں نے پاکستان کے عوام کے سامنے پہلی بار پیش کیا ہے۔

ارضِ سمرقند و بخارا سوشلزم کے سایے میں رہنے والے مسلمانوں کی روئدادِ زندگی

یہ پہلی کتاب ہے — جسے ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیئے جو سچائی جاننا چاہتا ہے!

قیمت ۳۰ روپے - ۲۷۲ صفحات — آفسٹ طباعت

کوثر پبلشرز
۱۳۴ ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۱۶
فون — ۸۵۱۴۰۰

عبداللہ ملک کی تازہ مطبوعات

مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے

حدیثِ دل

کمیونسٹ کا روزنامچۂ حج
جو حرمین اور مسجد نبوی میں رقم ہوا
اردو ادب میں بالکل انوکھا تجربہ

بڑے سائز کے ۲۰۸ صفحات
خوبصورت جلد
سفید کاغذ
قیمت ۵۰ روپے

ارضِ جنت

ایک سفرنامہ اور ایک ملک کے آئین کی داستان

سب سے متنازعہ ملک سوویت روس جس کے انقلاب کے متعلق فیض نے کہا تھا
مُرغِ بسمل کے مانند شب تلملائی
افق در افق
صبحِ محشر کی پہلی کرن جگمگائی
تو تاریک آنکھوں سے بوسیدہ پردے ہٹائے گئے

سوا دو سو صفحات۔ سفید کاغذ۔ قیمت ۲۵ روپے

الفت ہے راز، راز کی حد تک ہے سرفراز
جب داستانِ بزم بنی خوار ہو گئی

شورش بنام عبداللہ ملک

شورش کاشمیری کے ۷۰ نایاب خطوط کا عکسی مجموعہ جو اس نے ۱۹۴۰ء میں مختلف جیلوں میں لکھے

عبداللہ ملک نے شورش اور اس کے خطوط کے بارے میں تفصیلی دیباچہ قلم بند کیا ہے!

شورش اور عبداللہ ملک کے اپنے ہینڈ رائٹنگ میں
نیا تجربہ

پورے دو سو صفحات (بڑا سائز)
قیمت ۳۵ روپے

کیوبا سے چند خطوط

کیوبا کے انقلابی آج تمام پسماندہ ممالک کی آزادی کیلئے لڑ رہے ہیں اسی کیوبا میں عبداللہ ملک ایک ماہ گھوما پھرا۔ یہ اس سفر کی اور پورے کیوبا کے انقلاب کی تاریخ ہے

آخر کیوں امریکہ
کیوبا کی حکومت کو الٹنا چاہتا ہے؟

کس طرح اس نے اب تک ننھے سے جزیرے کے خلاف ریشہ دوانیاں کیں

کیوبا لاطینی امریکہ کا ویت نام ہے

فیڈل کاسترو کی سوانح بھی شامل ہے
تصویروں کے ساتھ
سوا دو سو صفحات
قیمت ۲۵ روپے

جھوٹا مقدمہ سچا ملزم

"سماجی انصاف چاہنے والوں کو ہمیشہ ناانصاف حاکموں اور انکی عدالتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ تین سو اوراق بھی ایک ایسی ہی ناانصافی پر مبنی مقدمے کی روداد ہے"

یہ ملزم تھا کمیونسٹ تھرڈ انٹرنیشل کا سیکرٹری جنرل **دمیتروف**
اور جھوٹا مقدمہ قائم کرنے والا تھا ہٹلر
جس نے دمیتروف کیلئے سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا

کیا وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکا؟
کیا وہ دمیتروف کو سزائے موت دلا سکا؟
اِن سوالوں کا جواب
آپ کو ان اوراق میں ملے گا

آفسٹ طباعت مع تصاویر ☼ صفحات ۳۰۰ ☼ قیمت تیس ۳۰ روپے

خانوادۂ مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی داستانِ حیات

برصغیر کے مسلمانوں کے سماجی اور دینی فکر کی تاریخ کے پس منظر میں

جلد اول
قیمت ۴۰/- روپے

کوثر پبلشرز، ۱۲۴ ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۱۶۔ فون ۸۵۱۴۰۰

عبداللہ ملک

کی نئی تصنیف

"یہ مفتی یہ مشائخ"

اور

انقلابِ افغانستان

یہ انقلابِ افغانستان کے بارے میں پہلی کتاب ہے

مُلاّ نے نصف صدی پہلے برطانوی سامراج کی شہ پر امان اللہ خاں کا تختہ الٹا تھا اور آج پھر یہی مُلاّ افغانستان کی انقلابی حکومت کے خلاف شمشیر بکف میدان میں اترا ہوا ہے لیکن کس کے اشارے پر؟

افغانی مُلاّؤں اور پاکستان کے نام نہاد مُلاّؤں کا کیا تعلق ہے؟

- کیا افغانستان کا انقلاب اسلام دشمن ہے؟
- کیا انقلابِ افغانستان میں ہزاروں افراد موت کے گھاٹ اتارے گئے تھے؟
- کیا افغانستان کا انقلاب سوویت روس کے اشارے پر ہوا تھا؟

ان سوالوں کا جواب تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہے اور اس ضمن میں انقلابی حکومت کے قائدین کے بیانات اور ایک سال میں کی گئی اصلاحات اور احکام کی تفصیل

اس ایک سال میں افغانستان میں کیا تبدیلیات رونما ہوئے ہیں

۱۲۸ صفحات

قیمت ۱۵ روپے

کوثر پبلشرز

۱۳۴ ۔ ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۱۶ ۔ فون ۸۵۱۴۰۰

جیسے جیسے مخالفت بڑھتی گئی ایسے یہ ڈھانچہ اور زیادہ پختہ اور منظم ہوتا گیا۔

ہفتم: سالانہ جلسوں کے انعقاد کی روایت۔

ہشتم: مرزا غلام احمد نے تمام اہم طریقوں سے اپنے پیروؤں کو خود دوسرے مسلمانوں سے میز کرنے کے لیے احمدی کا لقب دیا۔ اور غیر احمدیوں کو کافر ٹھہرایا۔ یہ درست ہے کہ غیر احمدی مسلمانوں نے بھی مرزا غلام احمد کو ان کے دعووں کے پیش نظر کافر ٹھہرایا۔ اور گو مرزا غلام احمد نے اس پہ احتجاج بھی کیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب بہت حد تک شعوری انداز میں خواہشمند تھے کہ علماء ان کو کافر ٹھہرائیں۔ تاکہ وہ اپنے پیروؤں کو مسلمانوں سے بالکل الگ ایک فرقہ کے طور پر منظم کر سکیں۔ چنانچہ خود مرزا صاحب نے اپنے مریدوں اور پیروؤں کو واضح ہدایت کی ہے کہ وہ غیر احمدی کی امامت میں نماز نہ پڑھیں۔

ان تمام اقدامات سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ مرزا صاحب نے پچھلی صدی کے خری سالوں میں ہی 'جماعت' کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ اور انہوں نے شعوری طور پر اس جماعت کے نشوونما اور استحکام کے لیے وہ تمام روایتی اقدام کیے جو مسلمانوں کی دایات کا اہم حصہ تھے۔ لیکن ان کو جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ بھی کیا۔ مثال کے در پہ پیر طریقت کا جائے قیام، ہمیشہ خاص و عام کے لیے وجہ کشش رہتا ہے اور موت ے بعد عرس اسی کشش کو برقرار رکھنے کا ایک طریقہ رہا ہے۔ ان صورتوں کو مرزا صاحب ے نئے رنگ میں ڈھالا۔ قادیان کو باقاعدہ ایک ہیڈ کوارٹر کا مقام بخش دیا اور سالانہ بسوں کے انعقاد سے عرس کی روایت قائم بھی رہی اور اس میں سے "شرک" کا پہلو غائب ر کے اس میں جاذبیت اور مذہبی کشش کی ایک نئی صورت پیدا کر دی۔ چنانچہ مرزا صاحب ن تمام اقدامات کی اہمیت کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ اور انہوں نے ان تمام روایات اجرا باقاعدہ سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اسی بنیاد پہ سالانہ جلسے کے انعقاد کے فیصلے کو "فیصلہ سمانی" کے عنوان کے ساتھ ۳۰ دسمبر ۱۸۹۱ء میں شائع کیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ:

"اور چونکہ ہر ایک کے لیے بباعث ضعف فطرت یا کمی مقدرت یا بعد مسافت

یہ میسر نہیں آسکتا کہ وہ صحبت میں آکر رہے یا چند دفعہ سال میں تکلیف اٹھا کر ملاقات کے لیے آوے۔ لہٰذا قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے کہ سال میں تین روز ایسے جلسے مقرر کیے جائیں جس میں تمام مخلصین اگر خدا تعالےٰ چاہے بشرط صحت و فرصت و عدم موانع قویہ تاریخ مقرر پر حاضر ہوسکیں۔ سو میرے خیال میں بہتر ہے کہ وہ تاریخ ۲۷؍ دسمبر سے ۲۹؍ دسمبر تک قرار پائے یعنی آج کے دن کے بعد جو ۳۰؍ دسمبر ۱۸۹۱ء ہے۔ آئندہ اگر ہماری زندگی میں ۲۷؍ دسمبر کی تاریخ آجاوے۔ تو حتی الوسع تمام دوستوں کو محض للہ ربانی باتوں کے لیے سننے کے لیے اور دعا میں شریک ہونے کے لیے اس تاریخ پر آجانا چاہیئے اور اس جلسہ میں ایسے حقائق اور معارف کے سنانے کا شغل رہے گا۔ جو ایمان اور یقین اور معرفت کو ترقی دینے کے لیے ضروری ہیں۔ اور نیز ان دوستوں کے لیے خاص دعائیں اور خاص توجہ ہو گی۔ اور حتی الوسع بدرگاہ ارحم الراحمین کوشش کی جائے گی کہ خدائے تعالےٰ اپنی طرف ان کو کھینچے اور اپنے لیے قبول کرلے اور پاک تبدیلی ان میں بخشے اور ایک عارضی فائدہ ان جلسوں میں یہ بھی ہوگا۔ کہ ہر ایک نئے سال میں جس قدر نئے بھائی اس جماعت میں داخل ہوں گے۔ وہ تاریخ مقرر پر حاضر ہو کر اپنے پہلے بھائیوں کے منہ دیکھ لیں گے۔ اور روشناسی ہو کر آپس میں رشتہ تودد تعارف ترقی پذیر ہوتا رہے گا۔ اور جو بھائی اس عرصہ میں اس سرائے فانی سے انتقال کر جائے گا اس جلسہ میں اس کے لیے دعائے مغفرت کی جائے گی۔ اور تمام بھائیوں کو روحانی طور پر ایک کرنے کے لیے اور ان کی خشکی اور اجنبیت اور نفاق کو درمیان سے اٹھا دینے کے لیے بدرگاہ حضرت عزت جل شانہ کوشش کی جائے گی۔ اور اس روحانی جلسہ میں اور بھی کئی روحانی فوائد اور منافع ہوں گے جو انشاء اللہ القدیر وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہیں گے۔ اور کم مقدرت احباب کے لیے مناسب ہوگا۔ کہ پہلے ہی سے اس جلسہ میں حاضر ہونے کا فکر رکھیں۔ اور اگر تدبیر اور قناعت شعاری سے کچھ تھوڑا تھوڑا سرمایہ سفر خرچ کے لیے ہر روز یا ماہ بماہ جمع کرتے جائیں اور الگ رکھتے جائیں تو بلا دقت سرمایہ سفر میسر آجائے گا۔ یا یہ سفر مفت میسر ہو جائے گا۔" ۔۔ الخ

صرف یہی نہیں بلکہ اس سے آگے انہوں نے باقاعدہ "جماعت" کی تشکیل بھی کی اور

ایک ایسا نظام بھی وجود میں لانے کا اعلان کیا جو ان کے بعد ان کے سلسلے کو قائم و دائم رکھے۔ اور اس میں انہوں نے اپنے خاندان اور قادیان دونوں کی اہمیت اور بہت حد تک سربراہی کا اہتمام بھی ملحوظ رکھا۔ چنانچہ "الوصیت" نامی رسالہ جو مرزا صاحب نے اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے رقم کیا اس میں لکھتے ہیں۔

"اگر خدا تعالیٰ نے چاہا تو یہ سلسلہ ہم سب کی موت کے بعد بھی جاری رہے گا اس صورت میں ایک انجمن چاہیئے کہ ایسی آمدنی کا روپیہ جو وقتاً فوقتاً جمع ہوتا رہے گا۔ اعلائے کلمۂ اسلام اور اشاعتِ توحید میں جس طرح مناسب سمجھیں خرچ کریں۔ مالی آمدنی ایک بادیانت اور اہل علم انجمن کے سپرد رہے گی، اور وہ باہمی مشورہ سے ترقی اسلام اور اشاعت علم قرآن اور کتب دینیہ اور اس سلسلہ واعظوں کے لیے حسب ہدایت مذکورہ بالا خرچ کریں گے۔ اور یہ بھی ہدایت فرمائی کہ:

انجمن جس کے ہاتھ میں ایسا روپیہ ہوگا، اس کو اختیار نہیں ہوگا۔ کہ بجز اغراض سلسلہ احمدیہ کے کسی اور جگہ وہ روپیہ خرچ کرے اور ان اغراض میں سے سب سے مقدم اشاعت اسلام ہوگی"۔ (اقتباس تحریک احمدیت ۱۵۔۱۶)

(الوصیت)

اس انجمن کے اراکین بھی آپ نے خود نامزد کیے۔ مولانا نور الدین کو اس انجمن کا صدر
ر مولانا محمد علی کو اس کا سیکرٹری بنایا۔ اس انجمن میں اپنے اہم مریدوں کے ساتھ ساتھ اپنے
لیے اور اپنے دوسرے عزیزوں کو بھی شامل رکھا گیا۔ اور ہیڈ کوارٹر قادیان میں ہی رکھنے کا فیصلہ
ا۔ یہ انجمن خلیفہ نور الدین کے زمانے تک کام کرتی رہی۔ لیکن خلیفہ نور الدین کے زمانے
ہی مرزا غلام احمد کے خاندان نے براہِ راست اپنی بالادستی اور حاکمیت قائم کرنے کے
ے جتن شروع کر دیئے تھے۔ چنانچہ حکیم نور الدین کے زمانۂ خلافت کے دوران ہی مرزا
ر دا احمد صاحب کے ایما سے ان کے ماموں میر محمد اسحاق نے حسب ذیل سوالات تجویز کر کے
نا نور الدین صاحب کی طرف ممبران انجمن سے جواب لینے کے لیے بھیجے

۱۔ "صدر انجمن احمدیہ کے تعلقات اس زمانے میں اور آئندہ زمانے میں خلافت کے منصب پر بیٹھنے والے یعنی خلیفہ کے ساتھ کیسے ہیں اور کیسے ہوں گے۔ یعنی آپس میں کیا فرق ہے اور ہوگا۔

۲۔ خلیفہ صدر انجمن کے کسی فیصلہ کو مسترد کر سکتا ہے یا نہیں۔

۳۔ خلیفہ صدر انجمن احمدیہ کے کسی ممبر کو بغیر کسی ایسے عذر کے کہ صدر انجمن احمدیہ کا وہ ممبر خواہ مخواہ شرعاً دور کیا جائے۔ دُور کر سکتا ہے یا نہیں۔

۴۔ خلیفہ علاوہ صدر انجمن احمدیہ کے ایک یا متعدد ممبروں کو صدر انجمن احمدیہ سے الگ کرنے کے صدر انجمن احمدیہ کو بالکل بعذر شرعی و سیاسی و اخلاقی دُور کر کے بطور خود اشاعت اسلام وغیرہ و جماعت احمدیہ کے مدات کا انتظام کر سکتا ہے یا نہیں۔

۵۔ اگر خلیفہ چاہے کہ تمام بیت المال و مقبرہ و باقی مدات کا روپیہ اپنے پاس رکھ کر اپنے طور پر قرآن شریف اور اسلام کے مطابق استعمال کرے تو کر سکتا ہے یا نہیں۔ گو ساتھ ہی حساب کا انتظام رکھے۔

۶۔ جماعت احمدیہ کے عام افراد کا صدر انجمن احمدیہ سے کیا تعلق چاہیئے۔ اور آئندہ بھی کیسا چاہیئے۔

۷۔ جماعت احمدیہ کے عام افراد کو کن باتوں میں صدر انجمن احمدیہ کی فرمانبرداری ضروری ہے۔ اور کن باتوں میں وہ آزاد حکم صدر انجمن احمدیہ سے ہیں۔

۸۔ خلیفہ کے حکم کو صدر انجمن مسترد کر سکتا ہے یا نہیں؟"

ان سوالات سے صاف ظاہر ہے کہ سوال وضع کرنے والے جو خاندان مسیح موعود سے تعلق رکھتے ہیں۔ صدر انجمن احمدیہ کے وجود کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اور ان کی خواہش تھی کہ یا تو انجمن کے تمام کاروبار اور مالیات اس سے چھین کر ایک فرد واحد کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں اور یا فرد واحد کی حکومت اس پر قائم کر دی جائے۔ تاکہ وہ جس طرح چاہے اس سے کام لے کر اس کے ممبروں کو خود حضرت مسیح موعود کے منتخب کردہ تھے چاہے تو رکھے یا نکال دے۔ یہ دراصل آئندہ کے لیے پٹڑی بنائی جا رہی تھی، تاکہ جیسا کہ بعد کے واقعات

نے ثابت کر دیا کہ حضرت مولانا نورالدین صاحب کی وفات کے بعد میاں محمود احمد صاحب کے لیے انجمن کے کاروبار اور اس کے مالیات پر قابض ہونے کا رستہ صاف ہو جاتے۔"

(تحریک احمدیت حصہ دوئم صہ ۱۸-۱۹)

یہ تھی فضا جس میں حکیم نورالدین کی وفات ہوئی اور اس کے بعد مرزا بشیرالدین محمود نے تمام مخالفتوں کو رد کر کے 'مسند خلافت' پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے بعد سے مرزا بشیرالدین نے نہایت چابکدستی سے اس فرقے کو ایک مربوط فاشی تنظیم بنانے کے لیے جد وجہد شروع کی اور انہوں نے اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لیے مرزا غلام احمد کی گنجلک تعلیمات اور تحریروں کی نئے سرے سے تاویلات شروع کیں اور ساتھ ہی اپنے خوابوں کو تقدس کا رنگ دے کر قریب قریب الہام کا درجہ دینا شروع کیا۔ لگ بھگ بیس برس تک مرزا بشیرالدین محمود نے نہایت ہوشیاری اور خاموشی سے اپنی جماعت کو تمام دنیا سے الگ تھلگ کر کے اپنی ذات اور اپنے تخلیق کردہ نظام پر تکیہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

دراصل مرزا بشیرالدین محمود کے اسی نظام کے جبر اور ان کی الگ تھلگ رکھنے کی پالیسی نے مرزائیوں کو پنجاب کے مسلمانوں کے لیے ایک مسئلہ بنا دیا۔ یہ بات گزشتہ صفحات میں وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ بنیادی طور پر مرزا غلام احمد نے اس تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کیا جو سیاست سے دور رہ کر اپنی روٹی روزگار کی تلاش میں انگریزی ملازمت سے منسلک ہو رہا تھا۔ اور اس کے اندر جو ایک گونہ انگریزی نوکری سے خلش پیدا ہو رہی تھی اس کو اس نے مرزا کی تعلیمات اور عبادات سے دور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا صاحب کے پیروؤں میں بہت دنوں تک ایسے لوگوں کی اکثریت رہی اور آج بھی ہے جو ایک طرف سرکاری ملازم تھے۔ دوسری طرف نماز روزہ کے پابند، دینی معتقدات میں خاصے مستحکم اور متقی اور پرہیزگار ہوتے تھے، وہ عام طور پر اپنے رہن سہن اور طور طریقوں سے اپنے اردگرد کے لوگوں کو متاثر کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ دنیا سے کٹ کر ملازمت کی طرف توجہ کرتے اور ساتھ ہی اپنے مذہبی فرائض اور مرزا صاحب کی کتابوں کے پڑھنے میں وقت صرف کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا بشیرالدین محمود نے جب ان کو دنیا سے الگ کر نیکی

مہم تیز کی، اور اسی مہم کو تیز کرنے کے لیے انہوں نے غیر احمدیوں کی تکفیر پر شدت سے اصرار کرنا شروع کیا تاکہ عامۃ المسلمین میں احمدیوں کے خلاف نفرت بڑھے اور احمدی عامۃ المسلمین سے کٹ کر آپس میں ہی تعلقات استوار کرنے پر مجبور ہوں۔ چنانچہ آپس کے ان تعلقات کی استواری کی سب سے اہم صورت ملازمتوں میں احمدیوں کا روز افزوں اضافہ تھا۔ کیونکہ جس دفتر میں ایک احمدی پہنچ جاتا وہاں دیکھتے دیکھتے احمدیوں کی کھیپ پیدا ہو جاتی پھر یہ احمدی اپنے عہدوں سے فائدہ اٹھا کر تبلیغ کا اہتمام کرتے۔ چنانچہ اس حقیقت کا اعتراف، تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ میں بھی موجود ہے۔

"احمدی افسروں نے لوگوں کو احمدی بنانے کی مہم میں از سر نو مصروف ہو جانا اپنا مذہبی فریضہ خیال کیا۔ ان کے اس رویہ کی وجہ سے احمدیوں کو اس امر کا حوصلہ ہوا کہ جہاں کہیں انہیں افسروں کی حمایت حاصل تھی یا حاصل ہونے کی توقع تھی، وہاں اپنے مقصد کے حصول میں زور شور سے مصروف ہو جائیں۔ ہمیں پورا الیقین ہے کہ اگر ضلع منٹگمری کا حاکم اعلیٰ احمدی نہ ہوتا۔ تو احمدیوں کو ہرگز جرأت نہ ہوتی کہ غیر احمدی دیہات کے علاقے میں کھلم کھلا اپنے تبلیغی مشن پر روانہ ہو جاتے۔ جب کوئی افسر اپنے فرقہ وارانہ عقائد کا علی الاعلان اظہار کرتا ہے جیسے کہ بعض احمدی افسروں نے کیا۔ تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کہ جن تنازعات میں اس کی جماعت کا کوئی فرد ایک فریق ہو، ان میں اس کی غیر جانبداری پر کسی کو اعتبار نہیں رہتا۔ اس کا فیصلہ کتنا ہی صحیح اور دیانت دارانہ ہو۔ لیکن اگر وہ اس فریق کے خلاف ہو جو اس افسر کی جماعت سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ تو اس فریق کو یہ یقین دلانا غیر ممکن ہے کہ اس کو فرقہ دارانہ وجوہ کی بنا پر ناانصافی کا شکار نہیں بنایا گیا۔ لہٰذا ان افسروں کا طرز عمل نہایت افسوسناک تھا۔ اور اس امر کا مظہر تھا کہ وہ اس اصول کے فہم سے بالکل قاصر ہیں۔ جس کے ماتحت کسی سرکاری افسر کو اپنا ظاہری رویہ معین کرنا چاہیئے۔"

(رپورٹ تحقیقاتی عدالت صہ ۲۸۰)

سرکاری ملازمتوں میں اضافے کی وجہ یہ تھی کہ مرزائی دینی طور پر حکومت سے وفاداری اور سیاست سے الگ تھلگ رہنے کے پابند تھے۔ چنانچہ دفتروں میں غیر احمدی مسلمان ان

کی اس دینداری سے متاثر ہو کر ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور پھر احمدی اپنی سرکاری پوزیشنوں سے بھی استفادہ کرتے۔ اور احمدیت کی بنیاد پر غیر احمدی مسلمانوں کو ترقیوں، ملازمتوں کا لالچ دیتے اس طرح اپنا حلقہ وسیع کرتے اور جب ایک بار یہ حلقہ وسیع ہوتا۔ تو پھر حلقے میں شامل ہونے والے اس نو احمدی کو اپنے عزیز و اقارب کا مقاطعہ، نفرت اور غیض و غضب سبھی کچھ برداشت کرنا پڑتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کے اپنے ان نئے عقائد میں جن کو وہ حقیقتاً جانتا ہی نہ تھا۔ زیادہ پختگی آجاتی تو دوسری طرف اس کا انحصار "جماعت" پر زیادہ ہو جاتا۔ پھر اس کے بعد شادیوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ لین دین، اور تجارت یہ سب ایسی زنجیریں تھیں، جو مرزا البشیر الدین محمود نے نہایت ہوشیاری سے تیار کیں اور ایک بار جس پاؤں میں یہ زنجیر پڑ گئی اس کا ان سے نکلنا یا ان زنجیروں کو کاٹنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا۔

مرزا بشیر الدین محمود نے جو زنجیریں اپنی فہم و فراست سے تیار کیں، ان کا تذکرہ جس خوبصورت اور دلنشین انداز میں ایک سابق احمدی ملک محمد جعفر نے اپنے ایک عزیز کے نام مکتوب میں کیا۔ اس کا تذکرہ یہاں بہت ضروری ہے ملک محمد جعفر احمدی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، خود بھی احمدی رہ چکے ہیں انہوں نے جب بغاوت کی تو تحریک احمدیہ کے بارے میں ایک کتاب لکھی اور اس کتاب کا پیش لفظ ایک عزیز کے نام مکتوب کی صورت میں لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"دوسرا طبقہ جس کے بارے میں، میں زیادہ پرامید نہیں وہ احمدی مولویوں کا طبقہ ہے ان کا مسئلہ تقریباً وہی ہے جو بہت سے غیر احمدی مولویوں کا ہے۔ یعنی معاشی مجبوری۔ جن بہت سی وجوہ نے مجھے یہ کتاب لکھنے پر مجبور کیا ہے ان میں سے ایک احمدیہ جماعت کے مولویوں کی قابل رحم حالت ہے۔ مولویوں سے یہاں میری مراد جماعت کے تنخواہ دار مبلغ اور کارکن ہیں، میں جانتا ہوں کہ میرے اس دعوے کی خود مولویوں کی طرف سے نہایت شدت سے تردید کی جائے گی۔ لیکن میں اپنے ذاتی علم اور ان ذرائع کی بنا پر جنہیں باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، کہتا ہوں کہ اس وقت جماعت احمدیہ کے تنخواہ دار مبلغوں اور کارکنوں کی اکثریت منافقت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور یہ ان کے لیے بڑا عذاب ہے، منافقت سے

میری مراد مرزا غلام احمد صاحب کے دعاوی کی نسبت ان لوگوں کے اعتقاد کی کیفیت نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس بارے میں ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں، میری مراد یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر اس وقت موجودہ امام اور جماعت کی تنظیم سے متنفر ہیں، لیکن معاشی احتیاج اور بے بسی کی وجہ سے جماعت میں شامل رہنے پر مجبور ہیں معاش کے لحاظ سے بھی ان کا حال حد درجہ زبوں ہے۔ تنخواہیں بہت تھوڑی ہیں ان میں سے بھی کئی قسم کے چندوں کی کٹوتی ہو جاتی ہے اور آخر میں صرف اتنا دیا جاتا ہے۔ جس سے جسم وجان کا رشتہ بمشکل قائم رکھا جا سکے۔ نظارتوں کے چند اعلیٰ عہدیدار اس صورت سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن یہ خوش بخت لوگ زیادہ تر مرزا صاحب کے خاندان سے متعلق ہیں) لیکن معاشی بدحالی کے باوجود جماعت کے یہ کارکن سلسلہ سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کے سامنے کوئی متبادل ذریعہ معاش نہیں۔ میں خود بھی ان کی احمدیت چھوڑ دینے کے خیال سے پریشان ہوتا ہوں کہ ان کی گزر اوقات کیسے ہوگی۔"

"شاید تم کہو کہ مبلغین کے پاس دینی علم ہے یہ اس کی مدد سے احمدیت سے باہر بھی روزی پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں دو باتیں ہیں۔ اول تو جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کس حد تک احمدیت کی نسبت ان کا ایمان قائم نہیں رہا ہے۔ ابھی تو اتنا معلوم ہے کہ موجودہ خلیفہ اور جماعتی نظام سے وہ بددل ہو گئے ہیں۔ اس صورت میں جماعت سے باہر ان کے لیے کوئی ذریعہ معاش موجود نہیں ہے۔ دوسرے اپنے پیشے کی مخصوص ٹریننگ کی وجہ سے احمدیت سے باہر ان لوگوں کے لیے اپنے علم کو بروئے کار لانا بھی مشکل ہے۔ غالباً یہ حکایت تو تم ہی نے مجھے سنائی تھی کہ ایک سپاہی ملازمت کا عرصہ ختم ہونے پر فوج سے ڈسچارج ہوا اور کمانڈنگ افسر کو آخری سلام کرنے کے لیے دفتر میں حاضر ہوا۔ کمانڈنگ افسر نے پوچھا" ویل! تم گھر جا کر کیا کام کرے گا"؟ سپاہی نے جواب دیا"جناب! ارادہ ہے کہ ایک توپ خرید لوں اور اسے صاف کیا کروں"۔ اب تم ہی بتاؤ ایک مولوی جس نے ساری عمر وفات مسیح اور پیشگوئیوں اور الہاموں کی تاویلات پر بحث کرنے میں گزار دی ہے وہ اور کیا کام کر سکتا ہے؟ میرے علم میں ملک میں کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے۔ جو مسیح کی وفات

یا حیات ثابت کرنے کے لیے تنخواہ دینے پر تیار ہو۔"

"لیکن احمدی مولویوں کے طبقے سے باہر بھی ابھی احمدی نوجوانوں کو اپنے مذہب پر آزادی سے غور کرنے پر مائل کرنا آسان کام نہیں۔ اس وقت احمدیہ جماعت کی بنیاد مذہبی عقائد کے بجائے ایک خاص تنظیم پر ہے۔ اس تنظیم کے بندھن اس قدر سخت اور پیچ در پیچ ہیں۔ کہ ان کو توڑنا ایک بہت بڑی جرأت چاہتا ہے۔ جس کا اہل ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ جماعت کی تنظیمی صورت موجودہ حالت تک کس طرح پہنچی یہ ایک لمبی کہانی ہے مختصر یہ ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب کی زندگی میں باوجود ان کے دعویٰ نبوت کے احمدی مسلمانوں کے دیگر فرقوں کی طرح کا ایک فرقہ تھے۔ ان کے بعد مولوی نورالدین صاحب کے زمانے میں بھی حالات اس سے زیادہ مختلف نہ تھے۔ جماعت کی موجودہ تنظیم زیادہ تر موجودہ امام صاحب کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اوّل کے وقت میں ہی دو مختلف رجحانات کے گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو مرزا صاحب کے مشن کے علمی پہلو سے متاثر تھے۔ لیکن ان کی ذات اور خاندان سے وہ والہانہ عقیدت نہ رکھتے تھے۔ جو عام طور پر مریدوں کو روحانی پیشواؤں سے ہوتی ہے۔ ان کے مقابلے میں دوسرا گروہ پیر پرست قسم کے لوگوں کا تھا مولوی نورالدین صاحب کی وفات پر موخرالذکر گروہ کی امامت موجودہ خلیفہ صاحب نے سنبھال لی۔ مرزا محمود احمد صاحب ایک خاصے زیرک اور دور اندیش آدمی ہیں۔ جو سبق انہوں نے پیغامیوں کی علیحدگی سے اخذ کیا وہ یہ تھا۔ کہ اب جماعت کو ایسے خطوط پر منظم کیا جائے کہ مزید انتشار اور بغاوت کے امکانات کم سے کم رہ جائیں۔ شاید تمہیں یہ سُن کر حیرت ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنی خلافت سنبھالتے ہی مرزا محمود احمد صاحب نے وہ کام شروع کر دیا۔ جس کا آخری نتیجہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مرزا غلام احمد صاحب کی تعلیمات میں دونوں طرح کا مواد موجود تھا۔ اس کا ایک حصہ وہ تھا۔ جس سے مرزا صاحب کی حیثیت محض ایک مجدد اور مصلح کی ثابت ہوتی تھی۔ اور دوسرا وہ جس میں انہوں نے اپنے آپ کو ایک حقیقی نبی کے طور پر پیش کیا تھا۔ جماعت کے دو گروہوں نے اپنی اپنی مصلحتوں کی بنا پر ان تعلیمات کو آپس میں تقسیم کر لیا۔"

"مرزا محمود احمد صاحب کے مقصد کے لیے دوسرا حصہ مفید تھا۔ اس لیے انہوں نے اسی پہ زور دیا۔ اور مرزا غلام احمد صاحب کے دعویٰ نبوت کی بنیاد پر موجودہ خلیفہ صاحب نے ایسے احکام جاری کیے جن پہ عمل کرنے کی وجہ سے اس وقت معاشرتی لحاظ سے جماعت احمدیہ کا دیگر مسلمانوں سے بہت کم اشتراک رہ گیا۔ اس ضمن میں سب سے اہم معاملہ نکاح کا ہے مشترکہ قومیت کے قیام کے لیے یہ امر ازحد ضروری ہے کہ قوم کے افراد میں عقیدہ یا ذات وغیرہ کی بنا پر نکاح کے معاملے میں کوئی پابندی نہ ہو۔ دو قوموں میں باہم ازدواجی تعلقات کا رواج ان کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک قوم بنانے کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی قوم کے مختلف گروہوں میں آپس میں شادی بیاہ کرنے پر پابندی لگا دی جائے اور اس پابندی پر سختی سے عمل کیا جائے۔ تو چند نسلوں کے بعد یہ گروہ الگ الگ قوموں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔"

(احمدیہ تحریک)

یہ تھی صورت حال جس کے تحت مرزا بشیر الدین محمود نے سیاست کی وادیٔ خارزار میں قدم رکھا اور پہلی بار سیاسی جماعتیں بچھنگیں، دیکھتے ہی دیکھتے ایک وسیع محاذ قائم ہونے لگا۔ جو مذہب ۔ اور سیاست کے منصوبے سے تیار کیا گیا۔ لیکن اس وقت سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلمانوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو احمدیوں کی بالادستی سے تنگ تھا۔ اور جب سیاست میں ان کو بالادستی حاصل ہونے لگی۔ اور سر فضل حسین نے ان کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کی تو ایک طرف مجلس احرار میدان میں اتری تو دوسری طرف علامہ اقبال نے اس تحریک کو پورے پس منظر میں جا پرکھنے کی کوشش کی۔

اقبال اور احمدیہ تحریک

احمدیہ تحریک کے حامی اور مخالف دونوں ہی اپنے اپنے دعوؤں اور مؤقف کی سچائی اور حقانیت کے ثبوت میں علامہ اقبال کا نام استعمال کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ علامہ نے ایک وقت احمدیہ تحریک کی تعریف بھی کی تھی، اور اس کے بیس پچیس برس بعد اس تحریک کی شدید مذمت بھی۔ آخر کیوں؟ اس وقت اور زمانے کے تفاوت

اور اس دَوران میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو کوئی نہیں دیکھتا۔ کیونکہ تحریکیں خواہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی وہ اپنے دَور کی ضرورتوں اور مختلف طبقوں کی خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے ہی وجود میں آتی ہیں۔ ان خواہشوں کی تکمیل کا عمل کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری ہوتا ہے۔ کبھی انتخاب کے ذریعے یہ آرزوئیں اور خواہشیں پوری کی جاتی ہیں اور کبھی انتخاب کا بائیکاٹ کر کے۔ لیکن مقصد آرزوؤں کی تکمیل ہی ہوتا ہے۔ یہ آرزوئیں اور خواہش عوام کی تمناؤں کا مظہر بھی ہوتی ہیں اور کبھی یہ عوام کو فریب دینے کا بھی ایک طریقہ ہوتی ہیں۔ اس لیے تحریکوں کی ظاہری صورتیں ہمیشہ صحیح سمت کی نشاندہی نہیں کیا کرتیں اور بالخصوص جب تحریکیں مذہب کے مقدس نام پر شروع ہوں۔ تو ان کی چھان پھٹک کا کام خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مذہبی تحریکوں کے گرد نفرت و تقدس دونوں جذبوں کے اس قدر مضبوط حصار تعمیر ہو جاتے ہیں۔ کہ ان کو توڑنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی حال مرزا غلام احمد کی تحریک کا تھا اور ہے۔ لیکن میرا مقصد یہاں ان کی مذہبی تعلیمات کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر بحث نہیں ہے۔ نہ ہی میں اس کا اہل ہوں۔ بلکہ مجھے تو اس تحریک کے مذہبی خول کے نیچے کام کرنے والے عوامل کو ڈھونڈنا ہے۔

مذہبی تحریکیں جہاں انسانوں کے مذہبی جذبات کی تشفی کرتی ہیں، ان کو عبادت اور تقویٰ کی طرف لے جاتی ہے وہاں ان کے بہت سے مادی تقاضوں اور خواہشات کو مذہبی رنگ دے دیتی ہیں۔ اس لیے یہ مذہبی تحریکیں بھی عموماً خاص طبقوں کو زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ چنانچہ مرزا غلام احمد کی تعلیمات اور تنظیم نے یقیناً ایک ایسا گروہ پیدا کیا۔ جو اپنے اندر ایک جذبہ رکھتا تھا۔ جو مذہب سے شیفتگی کا اٹھتے بیٹھتے اظہار کرتا تھا۔ اور ان کے اسی جذبہ نے ان مسلمانوں کو بھی بہت متاثر کیا۔ جو مرزا غلام احمد کی تعلیمات کو تفصیلی طور پر نہیں جانتے تھے۔ دراصل مرزا غلام احمد نے اپنی تصانیف اور تحریروں کے ذریعے، ایک دَور میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ جب براہین احمدیہ شائع ہوئی تو مولانا محمد حسین بٹالوی نے اسی کتاب کے بارے میں لکھا تھا۔

"یہ کتاب اس زمانہ کی موجودہ حالت کی نظر سے ایسی کتاب ہے۔ جس

کی نظیر آج تک اسلام میں شائع نہیں ہوئی۔ آئندہ کی خبر نہیں لعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً۔ اس کا مؤلف بھی اسلام کی مالی و جانی و قلمی و لسانی اور حالی و قالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے، جس کی نظیر مسلمانوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ ہمارے ان الفاظ کو کوئی ایشیائی مبالغہ سمجھے تو ہم کو کم از کم ایک ایسی کتاب بتلا دے۔ جس میں جملہ فرقہائے مخالفین اسلام خصوصاً آریہ سماج و برہمو سماج سے اس زور و شور سے مقابلہ پایا جاتا ہو۔ اور دو چار ایسے اشخاص انصار اسلام کی نشاندہی کر دے۔ جنہوں نے اسلام کی نصرت مالی و جانی و قلمی و لسانی کے علاوہ حالی نصرت کا بیڑہ بھی اٹھایا ہو اور مخالفین اسلام و منکرین الہام کے مقابلے میں مردانہ تحدی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہو کہ جس کو وجود الہام کا شک ہو وہ ہمارے پاس آکر تجربہ و مشاہدہ کرلے اور اس تجربہ و مشاہدہ کا اقوام غیر کو مزہ بھی چکھا دیا ہو۔"

لیکن اس کے بعد جب مرزا غلام احمد کی تحریریں گنجلک ہوتی گئیں اور انہوں نے اوپر تلے دعاوی شروع کر دیئے تو خود نہ صرف مولانا محمد حسین بٹالوی، ان کے مخالف ہو گئے۔ بلکہ علماء کے ایک گروہ نے شدید مخالفت شروع کر دی، لیکن اس مخالفت کے باوجود بھی مرزا صاحب کی تحریروں نے بہت حد تک تعلیمیافتہ طبقے کو متاثر کیا۔ کیونکہ مرزا صاحب نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان کی تحریروں سے ہر قسم کی بات اور ہر قسم کا دعوٰے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مرزا غلام احمد کے علمی کارناموں کے متعلق خود ایک سابق احمدی ملک محمد جعفر کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ وہ اپنی کتاب احمدیہ تحریک کے صفحہ ۲۹ پہ لکھتے ہیں۔

"اگر خالص علمی اور وہ بھی اسلامی علوم کے شعبے کو لیا جائے تو تم دیکھو گے کہ مرزا صاحب نے اسلامی علوم کے احیاء اور ترقی میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا۔ ویسے کہنے کو مرزا صاحب نے پوری ۸۴ کتابیں لکھ ڈالی ہیں، کم ہی مصنف اس تعداد کے نصف تک بھی پہنچے ہوں گے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ان کتب میں کون سا خیال یا پیغام پیش کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ مرزا صاحب پہلے نبی ہیں جن کی پیغمبری پیغام سے خالی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب نے کچھ نئی باتیں ضرور لکھی ہیں اور بعض مسائل کے بیان میں ایک ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ ایک خاص ذہنی رجحان کے لوگوں کے لیے اس میں کچھ کشش پیدا ہو گئی۔ لیکن مجموعی طور پر اس دور کے دیگر مصنفین کے مقابلے میں مرزا صاحب کا کوئی مقام نہیں۔ اس کی وجہ مرزا صاحب کی علمی قابلیت کی کمی نہیں بلکہ مقصد کا فتور ہے۔ مرزا صاحب کا سارا مشن اپنی ذات اور خاندان تک محدود تھا۔ اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس مشن کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ ویسے انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، تقابل ادیان وغیرہ تقریباً ہر شعبہ پر کچھ نہ کچھ (بلکہ بہت کچھ) لکھ دیا ہے۔ لیکن ہر جگہ ایک ہی مقصد سامنے رکھا ہے۔ یعنی اپنی نبوت اور مجددیت کو ثابت کرنا۔

یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مرزا صاحب کی تحریر ایک طرح کی فنکارانہ صفت سے خالی نہیں۔ مثلاً اکثر جگہ انہوں نے اپنے اصل مقصد کو عیاں نہیں ہونے دیا۔ اور کسی قدر کامیابی سے یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ گویا اصل مقصد اسلام کی برتری ثابت کرنا ہے۔ مثال کے طور پر وفات مسیح کے مسئلہ کو لو۔ غالباً مرزا صاحب نے سب سے زیادہ اسی موضوع پر لکھا ہے۔ مرزا صاحب کے دعویٰ کے ثبوت کے لیے مسیح ناصری کی وفات کا سوال ایک مرکزی اور بنیادی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ اگر مسیح آسمان پر زندہ موجود ہو۔ تو زمین پر مسیح کی گنجائش ہی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے مرزا صاحب کے لیے حیاتِ مسیح کے عقیدہ کی تردید از حد لازمی تھی، لیکن جب تک اس ذاتی ضرورت کو قومی ضرورت کی صورت میں پیش نہ کیا جاتا کام نہ چل سکتا تھا۔ یہ کام مرزا صاحب نے اس طرح کیا کہ نہایت شدت اور تکرار کے ساتھ مسلمانوں کو حیات مسیح کے عقیدے سے پیدا ہونے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ حیات مسیح کا عقیدہ عیسائیوں کے ہاتھ میں ایک زبردست حربہ ہے کیونکہ اس سے عیسائی یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر اسلام سے افضل ہیں بلکہ ایک طرح سے حضرت عیسیٰ کی الوہیت اس سے ثابت ہوتی ہے۔ ممکن ہے بعض عیسائیوں کی طرف سے عامیانہ طور پر یہ دلیل پیش بھی کی جاتی ہو۔ لیکن فی الواقع حیات مسیح میں مسلمانوں

کے لیے کوئی حقیقی خطرہ نہ تھا۔اس کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے۔کہ مسلمانوں کی اکثر اب بھی (عقیدتاً) حیات مسیح کی قائل ہے۔لیکن اس وجہ سے اس نے اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار نہیں کی۔

اسی طرح اپنے الہامات کا جواز پیدا کرنے کے لیے مرزا صاحب نے یہ استدلال استعمال کیا۔کہ الہام کے اجراء سے انکار کی صورت میں خدائی صفات میں نقص واقع ہوتا ہے۔اسلام کا خدا زندہ خدا ہے۔وہ جیسے پہلے کلام کرتا تھا اب بھی کلام کرتا ہے دگو زیادہ تر مرزا صاحب کے ساتھ کرتا ہے!) اس محدود مقصد کی موجودگی میں مرزا صاحب کی تحریر میں کسی ارفع پیغام کی تلاش ہی عبث ہے۔"

ملک محمد جعفر نے مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریروں اور تصانیف کا جو تجزیہ کیا ہے وہ اپنی جگہ برحق ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ تجزیہ آج ہو رہا ہے جب مرزا صاحب کو مرے ہوئے بھی ساٹھ سے اوپر سال بیت چکے ہیں۔اور جہاں تک مرزا صاحب کی تصنیف و تالیف والی زندگی کا تعلق ہے۔اس سلسلہ کو ایک صدی گزر رہی ہے اس لیے تجزیہ بھی اسی دور کے حوالے سے کرنا ہوگا۔اور اس لیے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس وقت اور اس دور میں مختلف وجوہ کی بنیاد پر ایک عالم ،مرزا صاحب کے علم و فضل اور تصنیف و تالیف اور طرز نگارش سے متاثر ہوا تھا۔واقعہ یہ ہے کہ اس میدان میں مرزا غلام احمد قادیانی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی میں بہت گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔

(اولاً) مرزا غلام احمد اور مولانا مودودی دونوں نے ان گنت مضامین اور تصانیف قلم بند کی ہیں۔ابتدائی دور میں جس طرح ایک عالم مرزا غلام احمد کی تحریروں سے متاثر ہوا تھا۔اسی طرح مولانا مودودی کی تحریروں سے ابتدائی دور میں مسلمان اہل علم بالخصوص سرکاری ملازمین کی فوج ظفر موج ان سے متاثر ہوئی۔لیکن بعد میں یہی فوج ظفر موج اور ان کی دوسری نسل مولانا مودودی کے لتے لینے لگ گئی۔کیا یہ واقعہ نہیں کہ جس طرح براہین احمدیہ پر ایک زمانے نے سر دھنا تھا۔ٹھیک اسی طرح مولانا مودودی نے جب سیاسی کشاکش والے مضامین شروع کیے تھے۔تو اس وقت کے مسلم نوجوان خواہ وہ دہلی کے

سیکرٹریٹ سکے ہوں یا لاہور کے نہوہ خانوں میں پڑھ پڑھ کر سناتے تھے۔ اس زمانہ میں ہندو کے ہاتھوں پٹے ہوئے مسلمان سرکاری ملازم کو مولانا مودودی اور غلام احمد پرویز کی تحریریں ہی ڈھارس بندھاتی تھیں بالکل اس طرح جس طرح اسی نوے برس پہلے عیسائی پادری اور آریہ سماج کے مبلغوں کے حملوں سے زچ تعلیمیافتہ مسلمان کی ڈھارس مرزا غلام احمد کی تحریریں اور مناظرے بندھاتے تھے۔ لیکن پچیس تیس برس بعد جب مرزا غلام احمد نے دعاوی کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی ذات اور خاندان کو محور بنانے کے شعوری اور غیر شعوری اقدام کرتے شروع کیے تو اہل علم اور علماء شمشیر برہنہ ہو کر میدان میں اتر آئے، یہی حال مولانا مودودی کا ہے۔ پچیس تیس برس گزرنے کے بعد جب مودودی صاحب کی انانیت اور تعلی اس حد پر پہنچ گئی اور امارت نے تقدس کے اتنے جوڑے زیب تن کر لیے کہ ایک حلقہ ان جوڑوں کو چوم چوم کر اپنی آخرت سدھارنے کے خواب دیکھنے لگا۔ تو پھر ایسے لوگوں کا میدان میں آنا بھی لازمی تھا۔ جو اس دامن اور اس تقدس کو تار تار کریں۔ کیونکہ جو حقیقت حال ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء تک تھی وہ صورت احوال آج نہیں ہے۔ اس لیے تجزیہ اور رائے میں وقت کے ساتھ بُعد اور اختلاف لازمی ہوتا ہے۔

(ثانیاً) مرزا غلام احمد اور مولانا مودودی میں مماثلت کی ایک صورت اور بھی ہے اور وہ یہ کہ مرزا غلام احمد نے ایک تنظیم قائم کی اور اس تنظیم کی فعالیت سے ایک زمانہ اس دور میں متاثر ہوا۔ اور بہت مدتوں تک قائل رہا۔ مولانا مودودی نے بھی ایک تنظیم قائم کی اور اس کی فعالیت کا بھی چرچا مدتوں رہا۔ مرزا غلام احمد نے بھی تبلیغی اور تعلیمی میدانوں میں خاصا کام کیا۔ مدرسہ تعلیم الاسلام قائم کیا۔ اپنے وقت میں اس مدرسہ کا زبردست چرچا تھا۔ بلکہ روایت یہاں تک درج ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے پہلے صاحبزادے آفتاب اقبال کو وہیں میٹرک کرایا تھا۔

مولانا مودودی نے قربانی کی کھالوں کو جمع کرنے کی ایک فعال تنظیم قائم کر کے رفاہی کاموں کا ایک سلسلہ شروع کیا اور ایک حلقہ کو متاثر کیا۔ سب سے بڑھ کر جس طرح مرزا غلام احمد اور ان کے سلسلے نے مختلف طریقوں سے اپنے ارادتمندوں اور نام لیواؤں

کو جماعت المسلمین سے الگ کر کے اپنے ہی اردگرد جمع کیا اور پھر ان کو مجبور کیا کہ وہ تمام تعلقات کا انقطاع کر کے جماعت پر تکیہ کریں۔ اور پھر اس عمل کے دوران ان کے پاؤں میں کئی ایک زنجیریں پہنا دیں۔ کہیں شادی کی، کہیں تجارت کی، کہیں کل وقتی کارکن ہونے کی اور کہیں تنخواہوں کی۔ قریب قریب یہی اقدام جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کر رہے ہیں۔

اور پھر سب سے بڑھ کر مماثلت یہ تھی کہ مولانا مودودی نے بھی اپنا منصوبہ بروئے عمل لانے اور تنظیم کے پر پرزے نکالنے کی سوچ کا عمل شہری ہنگاموں سے دور، پٹھانکوٹ کے قرب و جوار کی ایک بستی سے شروع کیا تھا۔ مولانا مودودی نے اس بستی کا نام بھی دارالسلام رکھا لیکن اس تمام منصوبے میں ایک پیچ آن پڑا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کا خاندان، قادیان کے بذات خود رئیس تھے، لیکن مولانا مودودی خود اس بستی کے سربراہ نہیں تھے، بلکہ اس بستی کی سربراہی ایک دوسرے مخیر اور نیک دل مسلمان زمیندار کے پاس تھی، اب مولانا مودودی کو یہ بھی خیال ہوا کہ اس اقلیم کا مستقبل کیا ہوگا جس کی سلطانی ان کے اپنے پاس نہ ہو۔ چنانچہ وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ اب ایک الگ بستی بنانے کا منصوبہ بھی عمل میں لایا جا رہا ہے۔ لیکن جس طرح ۱۹۳۰ء کے بعد سے احمدیت روبہ زوال ہے اسی طرح مودودیت کے زوال کا دور ۱۹۷۰ء سے شروع ہو گیا۔ یہ تحریک بھی احمدیت کی تحریک کی طرح مدتوں سسک سکتی ہے لیکن ایک تندرست اور توانا تحریک کے طور پر مسلم عوام کو متاثر نہیں کر سکتی۔

بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ مرزا غلام احمد کی تحریروں کے ساتھ ساتھ، قادیان کو ایک اسلامی مرکز کے طور پر پیش کیے جانے سے، وہاں مدرسہ تعلیم الاسلام اور اسلامی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے مراکز کے قیام نے ایک زمانے میں درد دل رکھنے والے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ تھا جب ۱۹۱۱ء میں علامہ اقبال نے علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اگر تمہیں اس زمانہ میں ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کا نمونہ دیکھنا ہو تو وہ اس فرقہ کی شکل میں ملے گا جو قادیان میں پیدا ہوا ہے۔"

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار چہارم ____ فروری ۱۹۸۶ء

صفحات ____ ۳۳۳

قیمت ____ [redacted] روپے

ناشر ____ کوثر پبلشرز لاہور

طابع ____ لاہور آرٹ پریس لاہور

کوثر پبلشرز

۱۳۴-ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن

لاہور ۱۶ ___ فون ۸۵۱۴۰۰